نظم لطیف

جس کو

جناب مولوی حافظ سید جلال الدین احمد جعفری زینبی

نے مرتب کیا اور

جعفری برادرس نے اپنے

مطبع انوار احمدی الہ آباد سے چھپوا کر شائع کیا

قیمت فی جلد مجلد

فہرست مضامین نظم لطیف

عنوان مضامین	صفحہ

ضمیمہ نظم لطیف

عنوان مضامین	صفحہ

عنوان مضامین	صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

"حمد"

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو۔ جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

(حالی)

(۲)

کھوا کرے گا حفاظت مری۔ خدا میرا
رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا
خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ
تو ذرّہ ذرّۂ عالم ہے آشنا میرا
مری حقیقتِ ہستی یہ مشتِ خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا
اُنھیں ہے عقل، جو محتاجِ غیر ہیں ہر دم
مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدّعا میرا

غرور اُنھیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبرؔ
سوا خدا کے سب اُن کا ہے۔ اور خدا میرا

(اکبر الہ آبادی)

(۳)

صاحبِ بخشش والطاف وعنایات خدا
ساری مخلوق کا ہے کعبۂ حاجات خدا
شب کا چاہے تو گھڑی بھر میں وہ تڑکا کر دے
دن کو چاہے تو گھڑی بھر میں کرے رات خدا
بختِ بد سے تو بچاتا ہے وہ عزّت میری
وقت بگڑے تو بناتا ہے مری بات خدا
ایسی آنکھیں مجھے اے عشق عنایت کر دے
جن سے مجھ کو نظر آتا رہے دن رات خدا
دے کے لیتا نہیں دیتا ہے تو دے دیتا ہے
خالی کرتا نہیں بندوں کے بھرے ہات خدا
سر بسر پنجۂ اندوہ سے دیتا ہے نجات
ہے طبیب قلق وصدمہ و آفات خدا

مضطر اتنا غمِ محشر سے پریشاں کیوں ہے
آپڑی بات تو رکھّے گا تری بات خدا
(مضطر خیرآبادی)

نعت

دو طرح کے رکھتے تھے شرف احمدِ مختار — حق اُن کی طرف حق کی طرف احمدِ مختار
غوّاص ہوئے قلزمِ عرفاں میں تو سمجھے — اللہ گہر ہے تو صدف احمدِ مختار
قرآں ہے خرشید تو نجم اور صحیفے — ہیں ناسخِ ادیانِ سلف احمدِ مختار
کیا حشر کا کھٹکا ہے کہ ہیں تین معاون — شاہِ شہدا شاہِ نجفؓ احمدِ مختار
باطن میں یہ ہیں حضرتِ آدمؑ کے مربّی — ظاہر میں ہیں آدمؑ کے خلف احمدِ مختار
سونا نظرِ فیض کی تاثیر سے ہو مس — موتی ہو اُٹھا لیں جو خزف احمدِ مختار
آئینۂ دل، آنکھ سکندر سے ملائے
دیکھیں جو امیر اُس کی طرف احمدِ مختار
(امیر مینائی)

(۲)

سخن کو رتبہ ملا ہے مری زباں کے لئے — زباں ملی ہے مجھے نعت کے بیاں کے لئے
ترے زمانے کے باعث زمیں کی رونق — ملا زمین کو رتبہ ترے زماں کے لئے
لکھا قلم نے یہ پڑھ کر درود کرسی پر — بچھی رہے یہ کسی خواندہ میہماں کے لئے
تھی خوش نصیبی عرشِ بریں شبِ معراج — کہ اپنے سر یہ قدم شاہِ مرسلاں کے لئے
سوائے آئینۂ جلوۂ شہِ لولاک — نہ تھا محل کوئی تصویرِ کُن فکاں کے لئے
عجب نہیں جو کہے تیرے فرش کو کوئی عرش — کہ لامکاں کا شرف ہے ترے مکاں کے لئے
خدا کے سامنے محسنؔ پڑھوں گا وصفِ نبی
سجے ہیں جھاڑ یہ باتوں کے لامکاں کے لئے
(محسن کاکوروی)

مقدّمہ

ہر زمانہ ہر کام کے لئے بلحاظ ادوار تین حصّوں میں منقسم ہوتا ہے۔ یعنی ابتدائی۔ درمیانی اور انتہائی۔ اِن عہدوں میں ہر کام کی حالت بسلسلۂ ارتقا مختلف ہوتی ہے۔ ابتدا میں بہت معمولی، درمیان میں ترقّی کناں۔ اور انتہا میں وہ سب باتیں نمایاں ہو جاتی ہیں جن کے لئے کسی کام کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اس اصول سے کوئی چیز مستثنیٰ نہیں، چنانچہ اُردو شاعری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اب سے آٹھ سو برس پہلے حضرت امیر خسرو کے عہد میں اس گنگا جمنی (اُردو) زبان کا کتابی ہیولا نقش پزیر ہوا۔ جس غرض سے اس کی بنیاد پڑی اُس کو بین الاقوامی ضرورت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اوّل اوّل اس کا بازار کے لین دین اور روزمرّہ کی بات چیت تک انحصار رہا۔ رفتہ رفتہ شعریت کا جامہ پہننے لگی، لیکن اس میں جامہ زیبی کی موزونیت ایک مدّت تک پیدا نہیں ہوئی بلکہ سیدھے سادے جملے ہلکے پھُلکے فقرے۔ چلتے پھرتے مضامین نظم کی لڑیوں میں پروئے جانے لگے۔ جیسا کہ حضرت امیر خسرو کے تبرّکات سے پتا چلتا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کی اس ابتدا کے بعد، گیارہویں صدی ہجری کے آخر تک شمالی ہند میں ملکی اور سیاسی انقلابات نے اس ہونہار برِوا کو پنپنے نہیں دیا۔ البتّہ جنوب ہند (دکن و گجرات) میں ایسے نمونے اکثر ملتے ہیں جو بلحاظ تاریخ اس سلسلے کی کڑیوں کو ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یعنی حسن بہمنی کے زمانے سے ابوالحسن تانا شاہ تک بیجاپور۔ گول کنڈا وغیرہ میں بکثرت ایسے شعرا ملتے ہیں

جنھوں نے فارسی عربی کے سوا اس مخلوط دیسی زبان میں بھی اتنا کہا ہے کہ آج کافی ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اِن صدیوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اُسے خالص "دکنی" زبان سمجھنا چاہئے اور اس میں جو مضامین اور خیالات موزوں کئے گئے ہیں اُسے دیسی یا ہندوستانی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اِس زبان میں نہ ایچ پیچ کی باتیں پائی جاتی ہیں نہ اُلجھے ہوئے مضامین نظر آتے ہیں۔ جس انداز اور ترکیب سے اُس وقت یہ زبان بولی جاتی تھی بے تکلف اور بے ساختہ اُسی کو جامۂ نظم پہنا دیا جاتا تھا نہ کسی خیال میں شاعرانہ بلندی ہوتی تھی اور نہ کوئی نیا مضمون باندھا جاتا تھا۔

گیارھویں صدی ہجری کے آخر میں جب ولی اورنگ آبادی کا دور آیا اور اُنھوں نے شاہ گلشن کے مشورے پر عمل شروع کیا تو اس زبان میں جس کو ریختہ کہتے تھے فارسی مضامین کے ساتھ عربی، فارسی الفاظ سے اپنی غزلوں کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ اسی زمانے سے شمالی ہند میں بھی اُردو شاعری کا نام بلند ہونا شروع ہوا آبرو۔ ناجی۔ یکرنگ۔ حاتم اور آرزو وغیرہ اسی عہد قدیم کے آثار الصنادید ہیں۔ یہ شاعری ابتدائی شاعری تھی۔ ان اساتذہ کے کلام میں اگرچہ فارسی، عربی اور ہندی بھاشا کے الفاظ بکثرت موزوں ہوئے لیکن اسلوب بیان اور زبان بہت سادہ اور آسان رہی۔

اس عہد میں بساط شاعری پر جنوبی اور شمالی ہند کے شعرا کی دونوں صفیں برابر برابر جمی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور صوبجاتی فرق کے سوا ان سب کی گویائی کا انداز قریب قریب یکساں ہے۔

اسی دور سے متّصل آخری صفوں میں جن باکمال اہلِ سخن کا جلوہ نظر آتا ہے اُن میں پہلی صف، سودا۔ درد۔ میر۔ وغیرہم سے معمور ہے۔ اور اس کے بعد دوسری

آخری صف میں، مصحفی، جرأت۔ انشا وغیرہ کا طوطی بول رہا ہے۔ ان استادوں کا زمانہ کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ بیان اُردو کا بہترین ارتقائی دور گزرا ہے۔ شاعری اپنے تنوعات کے لحاظ سے بھی وسیع ہوئی اور اپنی دل آویزی کی بدولت ہر دل عزیز بھی۔ اسی عہد میں اختراع و ایجاد اور ترمیم و اصلاح کی راہیں وسیع سے وسیع تر ہوئیں۔ بغور مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہو جائے کہ اگر چند پُرانی ترکیبیں نظر انداز کر دی جائیں تو اُس زمانے کی زبان بالکل اس زمانے کی زبان معلوم ہوتی ہے، خیالات کی رفعت اور مضامین کی وسعت کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ جس طرح اُسی عہد میں تخئیل کی بلندی محاکات کی تصویر کشی اور اسلوب بیان کی دل آویزی نظر آتی ہے اُس کا جواب اس وقت تک کما حقہٗ نہیں ملتا۔

اس عہد کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جس کو تاریخی ترتیب سے درمیانی زمانہ کہا جا سکتا ہے اس دور کے مشاہیر اساتذہ میں ذوق۔ مومن۔ غالب۔ دہلی میں اور ناسخ و آتش لکھنؤ میں گزرے ہیں۔ اس عہد سے پہلے شعر و سخن میں جو سادگی۔ صفائی۔ تاثیر اور یکسانیت پائی جاتی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اسی زمانے میں لکھنؤ کی شاعری نے فروغ پایا اور شمالی ہند میں بلحاظ مضامین و خیالات شاعری نے کئی رنگ اختیار کیے۔ استعارہ و تشبیہ کی افراط۔ رعایت لفظی اور تلازمات شاعری کے بہتانات پست، زنانہ اور فحش گوئی کی موجودات اسی عہد کی مخلوقات ہیں۔ اسی وسطی عہد کے بعد جو زمانہ گزرا اُس کو انتہائی دور کہنا چاہیے اور یہ تعیّن پُرانے انداز اور ایشیائی شاعری کے رنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔ کیونکہ اس عہد کے بعد وہ پُرانا مذاق روبہ تنزّل نظر آتا ہے۔ اس دور کی سر برآوردہ ہستیوں میں، امیر مینائیؒ، داغ دہلوی، جلال اور تسلیم لکھنوی اور اُن کے تلامذہ شامل ہیں۔ اسی دور سے متصل غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دنیائے ادب میں انقلابات اور عالم شاعری میں تغیرات

کا سلسلہ شروع ہوا۔ پرانے مکتبوں اور قدیم درسِ نظامیہ کا نظام درہم برہم ہونے لگا۔ مغربی تعلیم کی تنظیم شروع ہوئی۔ جا بجا انگریزی اسکول۔ کالج اور یونی ورسٹیاں قائم ہونے لگیں، درس گاہوں میں چٹائیوں، ٹاٹوں اور دریوں کی جگہ، اسٹول، بنچ اور کرسیوں نے چھین لی۔ فرداً فرداً ہل ہل کے پڑھنے والوں کے بدلے چند طالب علموں کا گروپ بنا اور اُن میں ایک قاری باقی سامع بنے۔ میاں جی کی سماعت اور سبقاً سبقاً رٹا دینے کے عوض ماسٹروں کے مشرّح اور مدلّل لکچر ہونے لگے۔ خیالات کی روسائنس اور فلسفے کے ماتحت چلنے لگی۔ پیچیدہ ترکیبوں اور فرضی خیالوں سے کنارہ کشی ہوئی وقوعی واقعات اور صاف صاف بیانات کا دور دورا ہوا۔ بقول شمس العلما محمد حسین آزاد:-

"انگریزی تحریر کے عام اصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھئے اُسے اُسی طرح ادا کیجئے کہ خود وہ حالت گزرنے سے یا اُس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی یا غم یا غصّہ یا خوف یا جوش دل پر طاری ہوتا ہو، یہ بیان وہی عالم وہی سماں دل پر چھادے۔"

کسی دَور کی شاعری کا اچھّا یا برُا رنگ دیکھکر کسی شاعر کو مطعون کرنا یا ممدوح بنانا صحیح نہیں، بلکہ اُس رنگ کو زمانے کے اثر کا تابع جاننا چاہیئے۔ ملک یا سوسائٹی کا مذاق، غیر شعوری طور پر افراد میں سرایت کرتا ہے اور اسی سے متاثّر ہوکر شاعر اپنا مذاق قائم کرتا ہے۔ سودا۔ درد۔ میر وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کیا جاے تو مؤلّفِ آب حیات کی قائم کردہ انگریزی روش کی جھلک صاف نظر آئے گی یعنی وہ اپنی جذباتی اور حسیّاتی شاعری ہیں جب خوشی۔ غم۔ خوف یا جوش کے مضامین موزوں کرتے ہیں تو سننے والے پوری طرح متاثّر ہوتے ہیں اور وہی عالم سامعین پر گزرتا ہے جو اربابِ نشاط اور اصحابِ ملال پر گزرتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ابتدائی دور کی آخری روشِ شاعری نے اُس سادگی اور صفائی اور متانت و سنجیدگی سے بہت بڑی حد تک کنارہ کشی کر لی جس کو بزرگوں نے اپنے ریاض سے سرسبز کیا تھا۔ سلطنتِ دہلی کے اِنتزاع اور حکومت لکھنؤ کے ارتفاع نے ایک طرف تو حسرت و افسردگی کے مجسّمے پیش کئے، اور دوسری طرف عیش و طرب کے جلسے قائم کئے اس حالت میں شاعری کے لئے کسی موزوں توازن کا برقرار رہنا بہت دشوار تھا۔ ملک کا عام مذاقِ ادب بدلنے لگا اور ہر عیب کہ سلطاں بہ پسندد ہنر است کے ماتحت طعام تلاش شاعروں کا رجحان بھی اپنے آقاؤں کی چوکھٹوں کا پا انداز بن گیا اور ایسی شاعری ہونے لگی۔

باغ کو جاتے ہو پہنے ہو گلابی ٹوپی — بلبلِ بے ادب آ بیٹھے نہ اے جاں سر پر

یا

ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا — دو دوپٹّا تم اپنا ململ کا

ظاہر ہے کہ شاعری کا یہ مذاق کسی طرح ادب العالیہ کہے جانے کا مستحق نہیں اور پھر ایسے زمانے میں کہ چاروں طرف انقلابوں کی بلائیں گھری ہوئی ہوں، کوئی گھڑی، کوئی لمحہ اطمینان سے نہ گزرتا ہو۔ ملک کا ملک اور ایک ایک فرد مبتلائے مصائب ہو، ایسی شاعری کیا مطبوع و مقبول ہو سکتی ہے۔

تیرہویں صدی ہجری کے نصفِ آخر میں اِن ادبی ناہمواریوں کی طرف ہمدردانِ ادب متوجّہ ہوئے اور سب سے پہلے اُنھوں نے یہ کیا کہ اُردو نثر کو اُن اُلجھنوں اور اُلجھنوں سے پاک کیا جس نے اُردو کو فارسی کے پنج رقعہ۔ مینا بازار اور سہ نثر ظہوری کی بھول بھلیّوں اور گورکھ دھندوں میں پھنسا دیا تھا۔ جن کے سمجھنے کے لئے ایک اُردو خواں کی سمجھ کافی نہ تھی۔ اِس خصوص میں

سر سید احمد خاں مرحوم پہلے مصلح ہیں، جنھوں نے اُردو کے انداز کو بدلا اور صاف کیا، اگرچہ اُن کی تالیفِ اوّلین (آثار الصنادید) میں اکثر پرانی قسم کی عبارت ارائیاں اور مقفّی و مسجّع ترکیبیں پائی جاتی ہیں مگر اُس کے بعد اُن کی تالیفیں، تحریریں اور تقریریں ان ناپسندیدہ پیچیدگیوں سے بالکل صاف ہوگئیں۔

نثر کے ساتھ ساتھ نظم کے باب میں اربابِ ادب کا پہلا عملی قدم اس طرح اُٹھا کہ ۱۸۷۴ء میں کرنیل ہالرائیڈ ناظم سررشتۂ تعلیمات پنجاب نے لاہور میں مشورۂ شمس العلما محمد حسین آزاد مشاعرۂ منظوم کی طرح ڈالی۔ مصرعِ طرح کی جگہ کوئی عنوان کسی مضمون کا قائم کیا، چنانچہ اُسی وقت سے مختلف عنوانوں کے تحت میں نظمیں لکھکر مشاعرے میں پڑھنے کا رواج شروع ہوا۔ اسی سلسلۂ مناظمہ میں آزاد کی مثنویاں، شبِ قدر، دادِ انصاف، اور ابرِ کرم وغیرہ منسلک ہیں۔

یہ مجموعہ جس کا نام نظمِ لطیف تجویز کیا گیا ہے اس قسم کی نظموں کا بہترین انتخاب ہے جو ۱۸۷۴ء کے بعد شعرائے اُردو کے مذاقِ صحیح اور فکرِ بلند کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

یوں تو ہر موزوں شعر کو نظم کہہ سکتے ہیں لیکن فی الحقیقۃ نظمِ لطیف کی صحیح تعریف یہ ہے کہ لطفِ زبان اور لطافتِ بیان کے ساتھ، ایسکی موثر ایسی دل کش اور تاثیر بخش ہو کہ سننے والے شاعر کے جذبات وخیالات کو یہ سمجھیں کہ دراصل یہ ہمارے جذبات وخیالات ہیں۔

شاعری کی دو قسمیں مشہور و معروف ہیں، ایک وہ موزونیت جس کا شاعر کے قلب و دماغ اور حسیات وجذبات سے تعلّق ہو۔ اس کو داخلی شاعری کہا جاتا ہے دوسری وہ سخن سرائی جو دیکھی یا سنی ہوئی چیزوں سے متعلق ہو یہ خارجی شاعری کہی جاتی ہے۔

قومیت اور وطنیت کا احساس اور آزادی کی لہر جدید اُردو شاعری کا بڑا وصف ہے اور یہ چیز یورپ اور خصوصاً انگریزوں کا تحفہ ہے۔ اب سے ۶۰-۷۰ برس پہلے جدید شاعری میں خیالی اور انقلابی تغیرات رونما ہوئے اور نئے نئے موضوعات پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ جن کی چند قسمیں یہ ہیں:-

(۱) مناظر۔ یعنی کسی وقت، موسم، مقام، نباتات و حیوانات یا اوضاع و احوال انسانی کی تصاویر نظم میں کھینچنا۔ مثلاً صبح وشام۔ سردی گرمی۔ بہار۔ برسات۔ پہاڑ۔ دریا۔ کھیت۔ باغ۔ پھل۔ پھول۔ تتلی۔ پتنگے۔ میلے ٹھیلے۔ وضع ولباس۔ تہوار۔ اشنان۔ عید بقرعید۔ ہولی دیوالی وغیرہ پر نظمیں لکھی جائیں اس شاعری کو منظر کشی کہتے ہیں۔

(۲) جذبات، یعنی عشق و محبت۔ رنج والم، مسرت ونشاط۔ رشک وحسد صدق و وفا۔ جفا و قفا وغیرہ میں سے کسی جذبہ و کیفیت کی تصویر کشی۔ اس کو تخیلی شاعری کہا جاتا ہے۔

(۳) واقعات، یعنی اعمال وافعالِ انسانی میں سے کسی ایک واقعہ و عمل کو نظم کرنا۔ مثلاً حاتم کی سخاوت۔ سکندر و آئینہ۔ خضر و موسیٰ کا سفر۔ رام چندر جی کا بن باس۔ ان واقعات کا تاریخی یا سچا ہونا ضروری نہیں، فرضی واقعہ بھی ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ نتیجہ خیز اور امکانی ہو۔ اس کو بیانیہ شاعری کہتے ہیں۔

(۴) تمثیلات، یعنی غیر ذی روح یا غیر ذی عقل چیزوں کو انسانی اوصاف کی طرح اُن کے قصے بیان کرنا جس سے کوئی اخلاقی پہلو ذہن نشین کرنا مقصود ہو، جیسے نظیر اکبر آبادی کی نظم، ہنس نامہ۔ یا لومڑی اور انگور کا مشہور واقعہ، یا مولانا حالی کا مکالمۂ عقل و نفس اور مناظرۂ وقت و دولت، یہ تمثیلی شاعری کہی جاتی ہے۔

(۵) وطنیات وقومیات، یعنی ملک یا قوم کی محبّت اور اصلاح وفلاح کے متعلّق نظمیں۔ اس کو قومی وملکی شاعری کہتے ہیں۔ سیاسی نظمیں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔

قدیم زمانے میں مندرجۂ بالا عنوانات وموضوعات پر الگ اور مستقل نظموں کے لکھنے کا عام رواج نہ تھا۔ قصیدوں کی تشبیب میں نیز مثنویوں اور مرثیوں کے بعض حصّوں میں ضمنی طور پر موجودہ قومی وملکی شاعری کے علاوہ پہلی چار قسموں کے مضامین آجاتے تھے۔ قصائد کو کبھی کسی موسمی منظر سے شروع کرتے تھے کبھی شکایت زمانہ یا اپنی مصیبت کا بیان کرتے تھے، کبھی بے جان چیزوں کا مناظرہ لکھتے تھے، مثنویوں میں مختلف منظر اور سین، جذبات ومکالمات آتے تھے، مرثیوں میں بھی موسم ومقام کا حال، جذبات ومعاملات کی کیفیت بیان ہوتی تھی۔ یہ ٹکڑے اگر قصائد ومثنویات سے الگ کر لئے جائیں تو جدید شاعری کے ذیل میں آسکتے ہیں۔ میر انیس وغیرہ کے مرثیوں میں صبح کا سماں، گرمی کی شدّت، تلوار یا گھوڑے کی تعریف وغیرہ جدید شاعری کے عنوانات کہے جاسکتے ہیں۔

ان ضمنی نظموں کے علاوہ بھی قدیم زمانے میں بعض شاعروں نے تخییلی وتشریحی اور بیانیہ نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر نظر ڈالی ہے۔ پھولوں، میدانوں، پھلوں، سبزی، ترکاری اور شکاری پرندوں پر نظمیں لکھی گئی ہیں، شادی بیاہ کی رسمیں، سال گرہ کی تقریب، شب برات، میلادنبی، ہولی، بسنت وغیرہ کے مناظر وحالات بھی پرانے شاعروں کے کلام میں ملتے ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان پرانی اور طرز بیان معمولی اور فرسودہ ہے مگر وجود موجود ہے۔ یہ پہلے دور کی حالت ہے۔ اس کے بعد تقریباً شعرا نے اس طرح کی نظموں کی طرف توجہ نہیں کی۔ بارہویں صدی ہجری میں

مرزا رفیع السودا اور میر تقی میر نے مناظر قدرت، اور مظاہر صنعت اور واقعات وحوادث کے متعلق بہت سی نظمیں لکھیں۔ اور ایک ایک ایسی تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ لکھی کہ سماں باندھ دیا۔ میر صاحب خصوصیت کے ساتھ اس باب میں بھی اپنے معاصرین سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اُن کی زبان اب سے ڈیڑھ سو سال پرانی ہے اس لئے بعض الفاظ اور محاورے اور ترکیبیں اس وقت متروک ہیں لیکن جہانتک حسن بیان کا تعلق ہے آج بھی اُن کی نظمیں اپنے رنگ میں بے نظیر اور دل کش ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کا دور سودا و میر کے آخر زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ اس بے نظیر شاعر نے صدہا نظمیں اپنے جذبات و تاثرات سے ایسی لکھیں جن میں قدرتی مناظر، اخلاق و نصائح مقامی و ملکی مشاغلِ حیات وغیرہ سیکڑوں موضوع شامل ہیں۔ یعنی آدمی نامہ، فقیر نامہ، پیسہ نامہ، برسات کی بہاریں، ہولی، دیوالی۔ عید، عرس، تیراکی کا میلہ وغیرہ عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں۔ ممکن ہے کہ نظیر کی نظمیں اُستادانہ اور شاعرانہ پابندی قواعد کے اعتبار سے کوئی خاص وقعت نہ رکھتی ہوں تاہم اُن کے جدید شاعری کے پیش رو ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ان ادوار کے ختم ہونے اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد زمانہ انقلاب اور جدید شاعری کا اصلی مستقل اور مستند دور ہے۔ چنانچہ اُردو نثر کی تصانیف کی طرح اُردو کی جدید شاعری کا دور بھی اسی زمانے کے اُدبا و شعرا کے دامنوں سے وابستہ ہے۔

اس جدید شاعری کے بانیوں میں سب سے پہلے قابل قدر شخصیت شمس العلما محمد حسین آزاد کی ہے۔ انھوں نے قدیم شاعری کے تنزل کا مرثیہ پڑھنے کے بعد شعر کے حقیقی مطمع نظر کو اپنی طرزِ ادا کے ساتھ یوں واضح کیا ہے:۔

”شعر گلزار فصاحت کا پھول ہے، گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے، روشنی عبارت کا پرتو ہے۔ روح کے لئے آب حیات ہے، گردِ غم کو دل سے دھوتا ہے

طبیعت کو بہلاتا ہے، خیال کو عروج دیتا ہے دل کو استغنا اور بے نیازی اور ذہن کو قوتِ پرواز بخشتا ہے۔[۱]

آزاد نے اپنے طور پر نئی روش پر چلنے کے لئے اپنی کوششیں شروع کر دی تھیں، لیکن اُس وقت تک اُن کی غیر اہم شخصیت عوام پر اُن کے خیالات کا اثر جمنے نہیں دیتی تھی۔ اس لئے اُنھوں نے ناظمِ تعلیمات کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اُردو شاعری کے اندازِ قدیم کو بدلنے میں ان کی مدد کی جائے اور اس کے لئے اُنھوں نے یہ ترکیب سوچی کہ انجمن پنجاب کی سرپرستی میں جدید طرز کے مشاعرے منعقد کئے جائیں جن کا مقصد مصرع طرح کی جگہ کسی موضوع پر شعر لکھوانا ہو، چنانچہ آزاد کی یہ سعی بہت مشکور ہوئی۔

آزاد کی کوششوں میں ایک خامی رہ جاتی اگر شمس العلما حالی اُن کا ہاتھ نہ بٹاتے آزاد کا میدان صرف شاعری نہ تھا بلکہ اُن کے ادبی نظام میں یہ چیز ثانوی حیثیت رکھتی تھی، پھر آزاد کی طبیعت خاص پسند واقع ہوئی تھی کہ وہ عوام کو مخاطب کرتے اور اُن کو متاثر بنانے میں حالی کی سی مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ حالی پہلے شاعر تھے، پھر نثر نگار۔ ان کی طبیعت ہمہ گیر اور مُصلح واقع ہوئی تھی، اُنھوں نے جو کچھ لکھا وہ بڑی حد تک اُردو شاعری کی اصلاح سے متعلق ہے آزاد نے جس فن کی بنیاد ڈالی، حالی نے اس کو منضبط کیا اور اُس کی اشاعت کی قدیم اصنامِ خیالی کی شکست و ریخت اور نئے تصوّرِ شعری کی تعمیر میں حالی کی تحریروں اور نظموں نے جو کام کیا وہ حیرت انگیز ہے۔ وہ دُھن کے ایسے پکّے تھے کہ مخالفتیں سنتے، مضحکہ اُڑاتے دیکھتے لیکن اپنا کام کئے جاتے۔

دورِ جدید کی شاعرانہ خصوصیات کا اندازہ مولانا حالی کی نظم ذیل سے کرنا چاہئیے۔

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں ۔ پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری — قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز — جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو
ناک، اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ — معذور جان اُن کو جو ہے بے نیاز تو
چُپ چاپ اپنے سچ سے گئے جا دلوں میں گھر — اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو
جو نابلد ہیں اُن کو دکھا چور بن کے راہ — گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جبکہ پڑ لیا — پھر راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو نے نکل — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر، پہ بے قدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو ساز تو
جو قدرداں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ — حالی کو تجھ پہ ناز ہے۔ کر اُس پہ ناز تو

آزاد و حالی کے بعد جدید شاعری میں جن اہلِ سخن نے سب سے زیادہ نام پایا اُن میں بلحاظ کثرتِ تصنیف مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، اور بلحاظ قلت مگر بہ ندرت شمس العلما شبلی کو صفِ اوّلیں میں جگہ دی جائے گی۔ ان کے بعد شوق قدوائی۔ اکبر الہ آبادی کا نمبر ہے۔ پھر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وہ نمایاں حیثیت ہے کہ آج وہ اپنی اخلاقی۔ فلسفیانہ۔ اور قومی شاعری کے قابل تقلید نمونوں کے ساتھ اور اپنی گویائی کی وسعت کے ہاتھوں نہ صرف ہندوستان، ایران، انگلستان بلکہ سارے علمی جہان پر چھائے ہوئے ہیں، اُن کے معاصرین میں بہت سے شعرائے جدید پیدا ہوئے اور اپنی شاعری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے اور کر رہے ہیں مگر اقبال کی طرح ہمہ تن مفکّر اور فلسفی بن کر کوئی مقبولِ عام نہیں۔

عہد حاضر کے شعرا میں، اخلاقی، مذہبی، قومی اور اصلاحی وغیرہ شاعری کی

ایک طویل اور مختلف النوع فہرست ملتی ہے جس پر از روے اقسام۔ غزل قطعہ مثنوی، رباعی، مسدس، مخمس وغیرہ کا اطلاق ہوسکتا ہے اور معنوی حیثیت سے ان سب کی سخن آفرینی دورِ جدید کی خصوصیات سے وابستہ کہی جاسکتی ہے۔

ان اربابِ ادب میں۔ مولوی وحیدالدین سلیم۔ سرور جہان آبادی۔ عزیز لکھنوی چکبست، اصغر گونڈوی، اور ریاض خیرآبادی کے نام بھولنے کے قابل نہیں۔

ان حضرات کے بعد اس وقت سب سے زیادہ نمایاں جوش ملیح آبادی۔ کا نام ہے اور ان کے دوش بدوش۔ روش صدیقی۔ احسان دانش ظفر علی خاں آزاد انصاری۔ افسر میرٹھی۔ فانی۔ حسرت موہانی۔ ماہر القادری۔ خوشی محمد خاں ناظر۔ سیماب اکبرآبادی۔ وغیرہ جدید شاعری کے آسمان پر چاند سورج اور ستارے بن کر چمک رہے ہیں۔

یہ چند نام مقدم و موخر کی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر لکھے گئے ہیں، نیز یہ کہ نمونے کے طور پر دکھائے گئے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جاے کہ باقی اور اربابِ سخن جن کے کلام سے یہ مجموعہ تکمیل کو پہنچا ہے ناقابل تذکرہ ہیں۔ طوالت کے خوف سے یہاں اختصار کو مدِّنظر رکھا گیا ہے۔ اور نام بنام اُن تمام شعراے کرام کا مذکور جن کا کلام مجموعۂ ہٰذا میں مندرج ہوا ہے اُس فہرستِ تعارف میں لکھا گیا ہے جو ان سطروں کے بعد مسطور ہے۔ اسی ذیل میں سب کے کلام پر مجملاً تبصرہ کرکے دکھایا گیا ہے کہ ان کی دل آویز اور دل نشیں شاعری نظمِ لطیف کی تعریف میں آتی ہے اور فی زمانناٗ جدید شاعری کی دنیا میں انھیں کی ٹکسال کا سکّہ رواں ہے۔ فمن شاء الاطلاع فلیرجع الی الفہرس۔

اخلاقیات

بلند ہمّتی (شمس العلما آزاد)

اقبال اک برس جو مرا تاجِ سر ہوا — شملے پہ مجکو موسمِ سرما بسر ہوا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے — اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے
دامانِ کوہسار میں سُورج بھی لیٹ کر — دبکا لحافِ برف میں مُنہ کو لپیٹ کر
دیکھو جدھر کو سب درو دیوار تھے سفید — باہر چلو تو دامنِ کہسار تھے سفید
پتّے تھے آکے جاڑے نے سب دور کر دئے — اور تھے درخت برف نے بلّور کر دئے
اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آگیا — گھر سے نکل کے سوئے بیاباں چلا گیا
دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں — ہمت کے ہاتھ میں ہے اُٹھائے سیہ نشاں

ہے اُس پہ روشنی سے لکھا۔ ہاں بڑھے چلو

ہمّت کا اُس کی حال میں لکھ کر بتاؤں کیا — کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے — پیدا شکوہ و شان تھی اُس کے نشان سے
چلتا قدم اُٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا — گویا خروش و جوش کو اپنے دبائے تھا
کیا جانے فکر مند تھا یا کیا ملال تھا — تیور بگڑ گئے تھے کچھ ایسا خیال تھا

سینے میں نعرہ بند تھا منھ میں نہ تھی صدا — لیکن خموشی اس کی بآوازِ کرّنا
دیتی تھی ہر طرف یہ صدا۔ ہاں بڑھے چلو

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا — دامن تھا اُس کے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا
جو آگے کچھ سیاہیٔ شب راہ پر پڑی — آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی
خوشحال گھر اور ان میں خوشی بولتی ہوئی — باتیں کہ دل سے غم کی گرہ کھولتی ہوئی
گھر گھر اُجالے تھے سرِ دیوار سامنے — دروازوں سے چراغ نمودار سامنے
تھے ہر طرف سے جاڑے کا ساماں پکارتے — تارے بھی اک کنارے سے تھے آنکھ مارتے
آرام کہہ رہا تھا کہ آگے نہ جا نہ جا — اور میں بھی کہہ رہا تھا کہ بیچ بیچ بجا بجا
سمجھانے والے سب یوں ہی سمجھا کے رہ گئے — اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے
چپکے سے گر کہا تو کہا، ہاں بڑھے چلو

پھیرا تھا منھ ابھی نہ شبِ تیرہ فام نے — اک پیرِ مردِ تجربہ کار آیا سامنے
پیری کی برف نے تھا اُسے تن بدن دیا — موئے سفید نے نمدی پیرہن دیا
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے — اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور درختوں کی سائیں سائیں — چاروں طرف پہاڑوں میں تھیں دوڑتی بلائیں
طوفانِ برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہوا — یہ دَرّہ ہے کہ موت کا منھ ہے کھلا ہوا
مانا کہ لطف و عیش و طرب پر نظر نہیں — جانا کہاں ہے جان کا بھی تجھکو ڈر نہیں
یہ سن کے نکلا شعلہ، دلِ نوجوان سے — گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے
اور اُس نے دی کڑک کے صدا۔ ہاں بڑھے چلو

تھی رات رنگ ابھی رخِ عالم پہ پھیرتی — گہ مشک اڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی

کیا جانے ہم نکل کے کدھر کے کدھر گئے — دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اُتر گئے
موسم بھی معتدل ہے ہوا بھی لہک گئی — خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آواز دے رہے — مل جُل کے ساتھ جیسے ہوں دم ساز دے رہے
پانی کی ہیں پہاڑوں سے آوازیں آ رہی — جو زیر و بم کے دُور سے ہیں سُر ملا رہی
ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے — کی رمز گُل سے بُلبُلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے — آرام کیجیے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اس نے مگر چشمِ ناز سے — اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے

پر اتنا مسکرا کے کہا، ہاں بڑھے چلو

ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا — لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
مُنھ رات کا، جو صبح کے آنے سے فق ہوا — گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی — چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گُلِ تر کی لالیاں — اور راہیں سے بھری ہوئی پھولوں کی تھالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا — اور جھوم جھوم کر وہ رخِ گُل کو چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی — شبنم تھی آ کے رات کو موتی لُٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھاتے جاتے تھے — پارے کے سانپ گھاس پہ لہراتے جاتے تھے
سورج نے سر نکالا یکا یک پہاڑ پر — بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر

آرام کی نہیں ہے یہ جا، ہاں بڑھے چلو

تبدیل جب کہ دھوپ سے رنگِ سحر ہوا — اک مدرسے کے آگے سے اُس کا گزر ہوا
تھا پاس اک خرابۂ مسجد پڑا ہوا — مُلّا تھا اُس میں۔ برسرِ منبر چڑھا ہوا

تھا ہر طرف کو دامن تقریر کھینچتا — اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
حور و قصور پر تھا دلوں کو لبھا رہا — دوزخ دکھا کے خلق خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اس کی باتوں میں مدہوش ہو رہے — اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے
دیکھا جو نوجوان کو اس مرد پیر نے — اپنی لکیر پیٹی پرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم — بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اڑائیں ہم
بولا جواں کہ اب وہ زمانے گزر گئے — وہ رات ہو چکی وہ فسانے گزر گئے
اور سب سے پھر اشارہ کیا، ہاں بڑھے چلو

ملکِ فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے — بے پا و بے مدار ہر اک اس کی بات ہے
لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ — ہمت کے معرکوں کے لئے خوب جا ہے یہ
پر دیکھتا ہوں میں تو یہاں طرفہ حال ہے — مطلق ادھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے
دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض — ساقی سے مدعا ہے و یا جام سے غرض
باقی فلک زدوں کو تو پھر کیا ٹھکانا ہے — افلاس ان کے واسطے پہلا بہانہ ہے
اور وہ جو رہ گئے ہمت و غیرت سے کام ہیں — محنت سے پیٹ پال رہے صبح و شام ہیں
لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے — تنخواہوں پر ہیں محنتیں استاد کر رہے
پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صبح و شام — کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام
آزاد کی یہی ہے صدا - ہاں بڑھے چلو

پیغام وطن (آزاد انصاری)

اے معزز طبقۂ حکام رس — اے گروہِ کامگار و کام رس

اے حکومت کی نظر میں لائقو — اے وفا کیشی میں سب پر فائقو
اے اصولِ زرکشی پر عاملو — اے حصولِ منفعت میں کاملو
اے خوشامد کے سُروں سے واقفو! — اے غلامی کے گُروں سے واقفو!
اے اجانب سے وفا پر مائلو — اے وطن کی مخلصی کے حائلو
اے خلاصی کی لگن کے دشمنو — اے خود اپنے ہی وطن کے دشمنو
اے بدیسی چال سے ناواقفو — اے خود اپنے حال سے ناواقفو
اے ہمارے دشمنوں کے دوستو — اے ہمارے گوشتو اے پوستو

میں نے یہ مانا کہ تم لائق بھی ہو — فرد بھی ممتاز بھی، فائق بھی ہو
تم خطابوں سے بھی سرافراز ہو — مقتدر عہدوں پہ بھی ممتاز ہو
تم کسی سے مال میں بھی کم نہیں — اوج یا اقبال میں بھی کم نہیں
ملک کے صاحب وقاروں میں بھی ہو — سلطنت کے دوستداروں میں بھی ہو
موردِ الطافِ سرکاری بھی ہو — آلۂ کارِ ستم گاری بھی ہو
اختیاراتِ ستم رانی بھی ہیں — فوجداری بھی ہیں دیوانی بھی ہیں
اس طرف تقدیر سیم و زر فشاں — اُس طرف صاحب بہادر مہرباں
ٹھیک ہیں، جو جو اُمنگیں دل میں ہیں — خوبیِ قسمت سے پانچوں گھی میں ہیں
لیکن اک تشویش اک الجھن میں ہوں — کیا اجازت ہے کہ اتنا پوچھ لوں
تم میں سو گُن تم میں لاکھوں رکھ رکھاؤ — تم سبھی کچھ ہو مگر یہ تو بتاؤ
لب پہ آہِ سرد بھی ہے یا نہیں — دل میں قومی درد بھی ہے یا نہیں

قوم مدّت سے ذلیل و خوار ہے
ابتلا پر ابتلا ہے اور ملک
آفتیں ہیں اور دنیائے وطن
جس کو دیکھو، بندِ آفت کا اسیر
کوئی بے کاری کے غم سے جاں بلب
ملک کا ملک آفتوں سے ادھ موا
دوستو وہ پاسِ عزّت کیا ہوا
یوں نہ بے شرمی کی ٹھانی چاہئے
شرم کھو کر وقت ٹالا بھی تو کیا
زیست کا لطف آبرو کے ساتھ ہے
خودکشی کرنے سے کچھ حاصل نہیں
جورِ باطل سے نہ ڈرنا چاہئے
قوم کے یارو مدد کا وقت ہے
آؤ کارِ نیک میں سبقت کریں
آؤ قومی درد کا درماں کریں
آؤ ہر بندِ فلاکت کاٹ دیں
آؤ پھر تا منزلِ مقصد بڑھیں،
آؤ پھر مل جل کے جانیں لڑا دیں
آؤ قومی غم کی شب دن کر دکھائیں

ملک مدّت سے مصائب زار ہے
ازدحامِ صد بلا ہے اور ملک
شامتیں ہیں اور ابنائے وطن
جس کو پوچھو بینوا مفلس، فقیر
کوئی ناداری کے سَم سے جاں بلب
قوم کی قوم اور غلامی کا جُوا
وہ تیرا احساسِ عزّت کیا ہوا
اب تمھیں بھی غیرت آنی چاہئے
پت ڈبو کر پیٹ پالا بھی تو کیا
اور اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہے
جیتے جی مرنے سے کچھ حاصل نہیں
حق پہ جینا حق پہ مرنا چاہئے
ملک کے پیارو مدد کا وقت ہے
آؤ ملک و قوم کی خدمت کریں
آؤ ملکی مشکلیں آساں کریں
آؤ ہر غارِ ہلاکت پاٹ دیں
آؤ پھر تا بامِ آزادی چڑھیں
آؤ پھر عزّت کے جھنڈے گاڑ دیں
آؤ ناممکن کو ممکن کر دکھائیں

دستو آزاد نے بالکل کھلا تم کو پیغامِ وطن پہونچا

اب قبول و رد کے تم مختار ہو
اپنے نیک و بد کے تم مختار ہو

ترانہ (آزاد انصاری)

جو ہم اہل ہمّت کی اولاد ہوں گے تو ہمّت کریں گے اور آزاد ہوں گے
اُٹھو ملک کے بندِ ستم توڑ ڈالیں کہ ہوں گے تو کوشش سے آزاد ہوں گے
اُٹھو ملک و ملت کی عزّت بچائیں کہ مل جل کے دیوارِ فولاد ہوں گے
جو سب فتح یابی کے گُر جان لیں گے جو سب فتح یابی سے دل شاد ہوں گے
جو سب باہم امداد کی ٹھان لیں گے تو سب بے نیازِ ہر امداد ہوں گے
وہ دورِ عجیب و غریب آ رہا ہے کہ سفّاک ہوں گے نہ جلّاد ہوں گے
وہ عہدِ ہمایوں قریب آ رہا ہے کہ فرعون ہوں گے نہ شدّاد ہوں گے
ہم اس سرزمیں کی طرف جا رہے ہیں جہاں صید ہوں گے نہ صیّاد ہوں گے
ہم اُس بادشاہی میں در آ رہے ہیں جہاں کید ہوں گے نہ کیّاد ہوں گے

نہ روکو اب آزاد ہم کو نہ روکو
ہم آزاد ہوں گے ہم آزاد ہوں گے

تعلیم بیداری (آزاد انصاری)

کیا کہیں کیوں۔ یوں رو بہ قفا ہیں کیا کہیں کیوں غیروں سے خفا ہیں

کیا کہیں کیوں بیزارِ وفا ہیں ڈیڑھ صدی سے حرف جفا ہیں
آخر جبر گوارا کب تک
آخر صبر کا یارا کب تک

غفلت کر کے جی نہیں سکتے فاقے بھر کے جی نہیں سکتے
بھوکوں مر کے جی نہیں سکتے جی سے گزر کے جی نہیں سکتے
اب دل مرنے سے نہیں ڈرتا
آخر مرتا کیا نہیں کرتا

یارو حالِ ملک تو دیکھو رنگ و بالِ ملک تو دیکھو
قہرِ زوالِ ملک تو دیکھو قحطِ رجالِ ملک تو دیکھو
آنکھ ہے اور غم خیز مناظر
بالکل یاس انگیز مناظر

کوئی مائل کارِ غلامی کوئی حامل بارِ غلامی
جس کو دیکھو یارِ غلامی تیس کرور اور غارِ غلامی
کیا کہیں کیا کہنے کی جگہ ہے
ڈوب کے مر رہنے کی جگہ ہے

اُٹھّو ملک کے لالو اُٹھّو اُٹھّو ہمّت والو اُٹھّو
اُٹھّو کام سنبھالو اُٹھّو اُٹھّو وقت نہ ٹالو اُٹھّو
فتح کی حکمی شان دکھاؤ
شان دکھاؤ آن دکھاؤ

فکر عبث ہے جان نہ جائے جان کا کیا غم آن نہ جائے
ملکی قومی شان نہ جائے مرد ہو میدان نہ جائے
توپوں تک کے وار نہ مانو
جانیں دیدو ہار نہ جانو
بڈّھو، جوانو، عورتوں، مردو کردو ترک غلامی کردو
گھر دو، در دو، زر دو، سر دو بھر دو ملک کو ہُن سے بھر دو
گھر گھر شمعیں روشن کردو
چپّہ چپّہ گلشن کردو

درسِ آزادی (آزاد انصاری)

اہلِ غیرت ہے تو غیرت پیش کر ملکی و ملّی حمیّت پیش کر
کبر و نخوت دیکھ کر یوں چپ نہ بیٹھ اُٹھ، جوابِ کبر و نخوت پیش کر
التماسِ عاجزی کے دن گئے اب غرورِ تاب و طاقت پیش کر
عرضِ حالِ بے کسی کے دن گئے اب وفورِ عزم و ہمّت پیش کر
عجزِ درویشانہ کی خو چھوڑ کر بادشاہانہ جلالت پیش کر
خوفِ مرگ و زیست سے مُنہ موڑ کر شانِ اربابِ جلادت پیش کر
قوّتوں کے امتحاں کا وقت ہے تو بھی اُٹھ اور اپنی قوت پیش کر
دشمنوں کے سامنے بھی بار بار جذبۂ صلح و مودّت پیش کر
اور اگر بے جنگ چارہ ہی نہ ہو جنگ کی بے خوف دعوت پیش کر

مرد کو خوف و خطر زیبا نہیں — مرد بن مردانہ خصلت پیش کر
بے خطر گھمسان کی جنگوں میں کود — بے دھڑک شوقِ شہادت پیش کر
ہر طرف بڑھ اور آزادی دلا — ہر طرف جا اور یہ دولت پیش کر
لاکھ! اقوالِ شجاعت رائیگاں — چند اعمالِ شجاعت پیش کر
جنس آزادی بلا قیمت نہ مانگ — جنسِ آزادی کی قیمت پیش کر

بادشاہی کی ہوس برحق مگر
بادشاہی کی لیاقت پیش کر

خدمتِ وطن (آزاد انصاری)

آؤ کچھ باہمی صلاح کریں — آؤ کچھ کوششِ فلاح کریں
آؤ عزمِ خیالِ کار کریں — آؤ فکرِ مآلِ کار کریں
آؤ غم خواریِ حیات کریں — آؤ بھی بہرِ ترقیات کریں
آؤ بابِ شفا تلاش کریں — آؤ دکھ کی دوا تلاش کریں
آؤ دریائے جہل بند کریں — آؤ علمی نوا بلند کریں
آؤ تا منزلِ مفاد بڑھیں — آؤ تا غایتِ مراد بڑھیں
آؤ فکرِ حیاتِ ملک کریں — آؤ سعیِ نجاتِ ملک کریں
آؤ جو گر رہے ہیں اُن کو اٹھائیں — آؤ جو مر رہے ہیں اُن کو جلائیں
آؤ کچھ خدمتِ وطن کر جائیں — آؤ اس دشت کو چمن کر جائیں
مانو آزاد کا کہا مانو — فرصتِ [illegible] مغتنم جانو

کام کا موقع و محل سمجھو
ورنہ بربادیاں اٹل سمجھو

عالم آشفتگی (حاجی عبداللہ آشفتہ)

وہی عالم اچھا تھا آشفتہ جس میں — وجود و عدم کا نہ رنج و محن تھا
نہ ہستی کا نام و نشاں تھا ذرا کچھ — نہ ہم تھے نہ دل تھے غم جان و تن تھا
نہ خوف قیامت نہ تشویش دنیا — نہ مرگ اور نہ سودائے گور و کفن تھا
نہ سر تھا نہ شور جنوں کی یہ شورش — نہ دل تھا نہ اس کا یہ دیوانہ پن تھا

کھلی آنکھ خواب عدم سے تو دیکھا
اجل سر پہ اور روبہ رو گورکن تھا

طوفانی نغمہ (احسان دانش)

زمانہ ہو گیا گنگا میں اک آئی تھی طغیانی — جلو میں جس کا دامن تھام کر چلتی تھی ویرانی
تھا جل تھل ایک سو سو میل تک مسافر تھے نہ راہیں تھیں — یہ عالم تھا ہوائے شام کے لب پر بھی آہیں تھیں
جو ریلا سر پٹک کر ناگہاں کروٹ بدلتا تھا — بیابانوں کی پیاسی ریت کا دم سا نکلتا تھا
تھی دہشت آفریں پھنکارتی موجوں کی بے باکی — سر ساحل سراسیمہ تھی بیراگیوں کی بیراگی
درختوں کے قدم جمتے نہ تھے سیلاب کے آگے — فلک کی گردشیں بیکار تھیں گرداب کے آگے
عجب بکھری ہوئی موجوں کا نقشہ تھا روانی میں — کہ جیسے تنتی ہوں جل دیویاں قالین پانی میں
ہوائیں تیز کر دیتی تھیں جب تیور تھپیڑوں کے — کنارا دم سے گر کر پاؤں چھوتا تھا تھپیڑوں کے

ہر اک ریلے میں خونی موت کے قدموں کی آہٹ تھی
فضائے بحر میں سیلِ بلا کی سنسناہٹ تھی

جدھر پانی کا رخ ہوتا تھا ساحل گرتا جاتا تھا
کسانوں کی عرق ریزی پہ پانی پھرتا جاتا تھا

بسا کر بستیاں دھارے نے کی تھی رہ گزر پیدا
جو ٹکراتی تھیں دو موجیں تو ہوتے تھے شرر پیدا

یقیں ہوتا تھا اکثر جوشِ طوفاں کے قرینے سے
کہ اب مل جائے گا جھک کر فلک گنگا کے سینے سے

نہ بیڑوں کا پتہ تھا اور نہ کوسوں گھاٹ ملتا تھا
جہاں تک بھی نگاہوں کی رسائی پاٹ ملتا تھا

مویشی نیم جاں تھے ہوش پراں تھے درندوں کے
بہے جاتے تھے بچے آشیانوں سے پرندوں کے

کہیں بہتا نظر آتا تھا سامانِ خانہ داری کا
کہیں غرقاب ہوتا تھا سفینہ کشت کاری کا

گھلا تھا ہر طرف رنگِ شفق دریا کے پانی میں
کہ موجیں سرد انگارے اگلتی تھیں روانی میں

نہ کشتی کا نہ کوسوں تک پتا تھا ناخداؤں کا
تسلط تھا فقط طوفان کے خونی دیوتاؤں کا

بچارے بے گھرے ہالی موالی روتے جاتے تھے
غریبوں کے مکان موجوں کے لقمے ہوتے جاتے تھے

ہرن دلدل میں دھنس کر رہ گئے تھے خستہ جانی سے
نکل آئی تھیں اندھی مچھلیاں گھبرا کے پانی سے

فلک سے ہانپ کر سورج زمیں پر گرنے والا تھا
زمیں کی نعش پر کالا کفن فطرت نے ڈالا تھا

اسی نازک سمے میں جب تھے دونوں وقت ملنے کو
زمیں پر غش تھا طاری چیخ پر تھے پھول کھلنے کو

بہا آتا تھا اک چھپر پہ اک اندھا بھکاری بھی
جسے قسمت سے حاصل تھا کمالِ نغمہ باری بھی

بھجن گاتا ہوا آتا تھا اکتارے کی تانوں پر
ہوائیں جا رہی تھیں لیکے تانے آسمانوں پر

بدن پر جوگیا بانا لٹیں شانوں پر آوارہ
ہر اک موجِ نفس معراجِ روحانی کا ہرکارہ

نوائیں سوز بھی بشرے پہ نورِ حق پرستی بھی
تشکر بھی خوشی بھی جذبِ خودداری بھی مستی بھی

نہ بے صبری نہ بے ہوشی نہ بے چینی نہ بے تابی
وہی مضراب کی ضربت وہی چہرے کی شادابی

ترانے تیرتے تھے جب بھری گنگا کے دھارے پر تو اک گاتی ہوئی خوشبو بہو بجتی تھی کنارے پر
بھجن جل کر کے گردابوں میں گنگا بہتی جاتی تھی جو لے چھیڑتی تھی موجوں کے گریباں سیتی جاتی تھی
ہوائیں راگ کی پاکیزہ لہروں میں نہاتی تھیں اندھیری رات کے بچپن کی گھڑیاں گنگناتی تھیں
اندھیرا جب ذرا گہرا ہوا اک دم فضا بدلی ہوا کم ہانپتا طوفان، دیوانی ہوا بدلی

فسونِ گم روی فطرت نے پھونکا تیز دھارے پہ
وہ چھپّر رفتہ رفتہ آ لگا آخر کنارے پر

نکالا کھینچ کر دیہاتیوں نے اس بھکاری کو کہ وہ پہلا فریضہ جانتے ہیں غم گساری کو
حریمِ دل میں غیرت شرم ہے آنکھوں کے پردوں میں ابھی تک بھی یہاں مردانگی باقی ہے مردوں میں
گئے گزرے بھی یہ اچھے ہیں شہری کج کلاہوں سے برس پڑتی ہیں اب بھی بجلیاں ان کی نگاہوں سے
کہا میں نے بھکاری سے یہ آخر ماجرا کیا تھا کہ یہ کف در دہاں طوفان اور تو نغمہ پیرا تھا
جواب اُس نے دیا مجھ کو کہ سن اے شاعرِ دانا فنا کو تو نے کیا سمجھا بقا کو تو نے کیا جانا
قضا آتی ہے جب ملتی نہیں ساعت بھی جینے کو ڈبو دیتی ہے ظالم رہگزاروں میں سفینے کو
تو پھر ہم موت کو اک پل بھی کیوں دیں زندگانی کا کریں کیوں فکر کہ کے رنگ پھیکا شادمانی کا

جو موت آتی ہے آئے مرد کو مرنے کا غم کیسا
عمارت میں خوشی کی دفترِ رنج و الم کیسا

مادرِ گیتی (احسن مارہروی)

مادرِ گیتی جسے کہتی ہے دنیا پیر زال اتنی کہنہ ہے کہ آدم بھی ہیں اس سے خرد سال
لیکن اس عمر کی طوالت پر یہ حالت اُسکی ہے ہر گھڑی ہر لمحہ ہر آن اک نئی چلتی ہے چال

پھر سبک رو اس قدر محسوس تک ہوتی نہیں — گرد کو بھی اس کے پا سکتا نہیں پائے خیال
مستقل اس کی روش ہے منجمد اس کا خرام — پاؤں اس کے لڑکھڑائیں ڈگمگائیں کیا مجال
جتنی ہوتی ہے طویل العمر ہوتی ہے قوی — ہے عروج ارتقا اس کے لئے شدّ رحال
آدمِ اوّل سے لے کر آدمِ آخر تک کا آج — اہلِ شرق اربابِ غرب اہلِ جنوب اہلِ شمال
جتنے ابنائے زماں پروردۂ آغوش ہیں — حسبِ استعداد کی جاتی ہے سب کی دیکھ بھال
اُس کی پابندی سے ہر آزاد نے پایا فروغ — اس کی فرزندی سے ہر ناقص کو حاصل ہے کمال
اُن سپوتوں کو بتاتی ہے وہ رازِ ارتقا — جو سمجھتے ہیں کہ ماضی ہے سبق آموزِ حال
ہر گزشتہ چاہتا ہے بہتری آئندہ کی — وہ بُرا آغاز کب ہے جس کا اچھا ہو مآل
جس قدم کو ہر قدم درپیش عذرِ لنگ ہو — منزلِ مقصود تک اُس کو پہنچنا ہے محال

سچ ہے یہ ارشاد، زیرِ پائے مادر ہے بہشت
منحرف جو ماں سے ہو اچھی نہیں اسکی سرشت

شاعری کا ایک رخ (احسن مارہروی)

شاعری کا جذبہ ہر دل کے نہاں خانے میں ہے — لیکن اظہار اُس کا اکثر مہمل افسانے میں ہے
کوئی کہتا ہے ازل کے دن سے ہوں مستِ الست — کوئی کہتا ہے دو عالم ایک پیمانے میں ہے
کوئی کہتا ہے کہ دل ہے سرد مہری سے تپاں — کوئی کہتا ہے کہ ٹھنڈک آگ بھڑکانے میں ہے
کوئی کہتا ہے کہ مے نوشی میں لطفِ ہوش ہے — کوئی کہتا ہے مزا پی کر بہک جانے میں ہے
کوئی کہتا ہے کہ اک قطرہ مجھے ملتا نہیں — کوئی کہتا ہے وہ سب پی لوں جو میخانے میں ہے
اک طرف اپنی پریشانی میں دل اُلجھا ہوا — اک طرف مصروف کوئی زُلف سلجھانے میں ہے

اس طرف گم کردہ منزل پھر رہے ہیں راہ گیر
اُس طرف اک رہ نما مصروف بہکانے میں ہے

کوئی سچا ترجمانِ دردِ دل ملتا نہیں
ہر یگانے میں وہ خصلت ہے جو بیگانے میں ہے

کوئی یہ کہتا نہیں کہنے ہو کچھ کرتے ہو کچھ
راستی کا لطف ان دونوں کے مل جانے میں ہے

بے ضرورت، بے نتیجہ، بے محل، بے فائدہ
محو ہر اک شعر کہنے اور کہوانے میں ہے

شاعری اور اُس کی خوبی میں نہیں کوئی کلام
گفتگو بے وقت کے مصروف ہو جانے میں ہے

قدر ہوتی ہے اُسی شاعر کی بزمِ شعر میں
جس اتائی کو مہارت کچھ نہ کچھ گانے میں ہے

جب یہ ہے تو عقل کہتی ہے کہ لطف و دل کشی
شاعروں سے بڑھ کے قوالوں کے بلوانے میں ہے

شاعری کی جس جگہ یہ گت ہے احسنؔ تو وہاں
منہمک اک بے سری آواز پہنچانے میں ہے

داستانِ دل (احسن مارہروی)

زندہ انھیں کے دم سے ہے نام و نشانِ دل
جذباتِ حسن و عشق ہیں روح و روانِ دل

ناز و نیاز میں بھی یہ ہے پاسِ حسن و عشق
اک داستانِ دل ہے تو اک پاسبانِ دل

مفہوم حسن و عشق، ہوسناکیاں نہیں
گھٹتی ہے اس خیال سے توقیر و شانِ دل

کیا چیز حسن و عشق ہے؟ سمجھا ہے ہم نے کیا
سوچیں اسے بہ غور ذرا صاحبانِ دل

معنائے حسن، خوبی و نیکی ہے بالیقیں
اس کے سوا کہے تو غلط ہے بیانِ دل

ہے عشق کیا؟ طلب ہے فقط نیک و خوب کی
جو اس سے منحرف ہیں وہ ہیں دشمنانِ دل

وہ حسن بد سرشت جو ہو مرکزِ ہوس
ہوتا ہے اس سے نفع کے بدلے زیانِ دل

مطلوبِ بد خصال کا طالب ہے بدمآل
یہ آشنا ہے دشمنِ ایمان و جانِ دل

تہذیب جس کے ساتھ ہو اخلاق جس کے پاس — وہ عشق پاک وصاف ہے شایانِ شانِ دل
روحانیت نہ جس میں ہو وہ عشق ہے ہوس — ایسی ہوس سے چل نہیں سکتی دکانِ دل
سیرِ مجاز چھوڑ، فریبِ نظر ہے یہ — اُٹھ بامِ معرفت پہ لگا نردبانِ دل
اللہ رے عاشقانِ حقیقی کی ہمتیں — دیتے ہیں ہنس کے جان دمِ امتحانِ دل
موت اُن کی زندگی ہے فغاں اُن کی ہے بقا — ہے رشکِ عیش ان کو غمِ جاودانِ دل

باغِ خلیل، آتشِ نمرود بن گئی
تھی ایک یہ کرامتِ سوزِ نہانِ دل

فریبِ ہستی (احسن مارہروی)

مخلوقِ خدا جہاں کہیں ہے — اک ہستیِ نیستی قریں ہے
انجم، قمر، آفتاب افلاک — جلوہ اُن سب کا بالیقیں ہے
لیکن یہ یقیں بطورِ اذعان — بے حجّت و بے چناں چنیں ہے
سن سن کے جما لیا ہے دل میں — تحقیق کا کون خوشہ چیں ہے
ہستی کی طلسم سازیوں میں — اک خواب و خیال جاگزیں ہے
اس خواب و خیال کی بدولت — دھوکے میں نگاہِ خُردہ بیں ہے
فانی کو سمجھ لیا ہے باقی — غائب یہ گمانِ حاضریں ہے
زنگی موسوم ہے بہ کافور — متوالا عاقل و ذہیں ہے
رنگیں میوے کا نام نارنگ — میٹھا کھٹّے کا جانشیں ہے
بے بہرۂ گوش و ہوش بہرا — اعمی چشم و چراغِ دیں ہے

چلتی ہوئی شے کا نام گاڑی
گھویا گھُل مل کے خوش تریں ہے
القصّہ جدھر بہ غور دیکھا
رنگِ برعکس ہر کہیں ہے
بے شبہ یہ سازشِ زمانہ
دو دن کی نمائشِ زمیں ہے
پھیلا ہے جو سازِ دل گشی کا
پھندا ہے، کمند ہے، نگیں ہے
بچتے رہنا مدام اس سے
یہ یار وہ مارِ آستیں ہے
جس سے ہوئی تلخ جانِ شیریں
زہراب بہ شکلِ انگبیں ہے
سن لو غالبؔ سے نکتہ داں کا
اک شعر، جو وجد آفریں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے

اتحادِ حقیقی (احسن مارہروی)

تعینات کے پردوں کو چاک کر ڈالو
جدھر نہیں ہے تعیّن اُدھر نظر ڈالو
جو کچھ خیال و نظر کی طلسم سازی ہے
حقیقتہً وہ حقیقی نہیں مجازی ہے
یہ بیش و بیش یہ یمیں و یسار و پست و بلند
تخیلات نے ڈالی ہے ان پر اپنی کمند
توہمات نے جب سے بشر کو گھیرا ہے
مجالسِ خرد و فہم میں اندھیرا ہے
بشر کے حق میں عناصر کی چار دیواری
نہیں ہے مانعِ آزادی و رواداری
بہ غور دیکھئے آب و ہوا و آتش و خاک
بہم ہیں ضد کوئی سوزندہ ہے کوئی نم ناک
مگر جو ربط بڑھا ان میں حکمِ قدرت سے
تو جلوہ گر ہوئے وحدت میں بزمِ کثرت سے
یہی مناظرِ نوعی بشر کے ہیں جو ہر
نظر میں دو ہیں مگر دل میں ہیں بہم یکسر

سری کرشن کہ بھگوان بدھ کہ راجہ رام	ہوئے ہیں صرف تعارف کے واسطے یہ نام
وگرنہ کام میں ان سب کے رنگ وحدت ہے	نہ اختلاف ہے باہم نہ کچھ کدورت ہے
ازل سے نورِ مجسّم یہ بن کے آئے ہیں	بس ایک شمع ہدایت سے لو لگائے ہیں
پیامِ امن و امان ان کا اک تکلّم ہے	انھیں سے داد طلب صاحبِ تظلّم ہے
یہ جتنیں نہیں کرتے ہیں شور و غل کے لئے	ہر ایک جنگ ہے ان سب کی صلحِ کل کے لئے
بجائے خود انھیں نفرت کسی بشر سے نہیں	خمیر خیر سے اُن کا اُٹھا ہے شر سے نہیں
خدا کے بندوں میں تفریق یہ نہیں کرتے	غلط اصول کی تصدیق یہ نہیں کرتے

ہر ایک پنتھ میں ملتے ہیں ایسے نیک نہاد
نہ کیوں ملیں کہ یہ نص ہے لکلِّ قومٍ ھاد

نقشِ عبرت (احسن مارہروی)

زمانے کے موافق کب زمانے کے بشر ہوں گے	الٰہی وہ بھی دن ہوگا کہ سب شیر و شکر ہوں گے
چلیں گی آندھیاں بغض و حسد کی ہند میں کب تک	ہم اوراقِ پریشاں بن کے کب تک منتشر ہوں گے
سلامت ہے جو فقر و جہل موجودہ تو آئندہ	نہ ہم اہلِ دول ہوں گے نہ ہم اہلِ ہنر ہوں گے
خبر گھر کی نہیں لیکن نظر ہے نجد و صنعا پر	بہت کم دوربیں ہم سے کہیں اہلِ نظر ہوں گے
اگر سینچی گئی کشتِ عمل خونِ مشقّت سے	تو اشجارِ امل سرسبز ہوں گے بارور ہوں گے
روا داری ملنساری خوش اطواری گراں باری	انھیں کے بین الاقوامی مفاسد بے اثر ہوں گے
ہمیں زود تغیّر سے مٹیں گے ورنہ دنیا میں	یہی شام و سحر ہوگی یہی شمس و قمر ہوں گے
حوادث زلزلوں کے قحط کے امساکِ باراں کے	ق	ہماری ہی بداعمالی سے ہوں گے جس قدر ہوں گے

اثر قربِ قیامت کا ہے ظاہر ان عذابوں سے　　کہ ہوتے تھے بہت کم بیشتر اب بیشتر ہوں گے
رہیں گی نقشِ عبرت بن کے احسنؔ میری یہ باتیں
نہ ہو گا تو جہاں میں تذکرے تیرے مگر ہوں گے

سرگرانیاں (احسن مارہروی)

ناکارہ ہستیوں کی کیا زندگانیاں ہیں　　ہاں کام کرنے والے جانِ جہانیاں ہیں
دنیا میں ہیں وہ شاداں دنیا ہے اُنکی خواہاں　　کاموں پہ جن کے نازاں خود کامرانیاں ہیں
کل تک تو سرگراں تھے حالی سے یاراُن کے　　حالی کو آج اُن سے کچھ سرگرانیاں ہیں
ہو کیوں نہ سرگرانی ہو کیوں نہ بدگمانی　　غائب ترقّیوں کی ساری نشانیاں ہیں
ہے جنسِ علم ارزاں سب کے لئے جہاں میں　　قحطِ عمل سے لیکن ہم میں گرانیاں ہیں
اسباب ہیں میسّر، سامان ہیں فراہم　　کم ہمّتی کی پھر کیوں ریشہ دوانیاں ہیں
سن لو بہ گوشِ رغبت جُن لو گُل نصیحت　　رشکِ بہارِ جنت یہ گُل فشانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

شاعر کے مشاغل (احسن مارہروی)

کیوں پوچھ رہا ہے کوئی احسن کے مشاغل　　کیا حسنِ عمل دفترِ عصیاں میں ملے گا
اوقات ہیں بے ضابطہ حالات ہیں بے ربط　　ہر وقت وہ فکرِ غمِ دوراں میں ملے گا
اس پر بھی ہے اصرار اگر تم کو تو سن لو　　آوارہ دورنگی کے بیاباں میں ملے گا

یا صبح کو ہوگا وہ مصلّے پہ نمایاں
یا خفتہ کسی گوشۂ پنہاں میں ملے گا

جب تک نہ ڈھلے دوپہر اُس وقت تک اُس کو
ڈھونڈو گے تو اطفالِ دبستاں میں ملے گا

دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک
سویا ہوا، بیٹھا ہوا، ایواں میں ملے گا

پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک
مشغول ملاقاتِ عزیزاں میں ملے گا

ہوگی نہیں مغرب جو تلاش اُس کی تو اکثر
پڑھتا ہوا کچھ بزمِ شبستاں میں ملے گا

ہوگا اُنہیں اوقات میں جو وقت مُیسر
سرگرمِ عملِ شعر کے میداں میں ملے گا

جب تا بہ کمر زلفِ شب آئے گی تو اُس کو
پہلوئے سکوں، خوابِ پریشاں میں ملے گا

القصّہ جو ہے آج یہاں محوِ تکلّم
لب بستہ وہ کل شہرِ خموشاں میں ملے گا

"عقل اور خدا" (احسن مارہروی)

اے دوجہاں کے مالک اے انس وجاں کے خالق
ایمان ہے ہمارا تجھ پر یقین لانا

آنکھوں سے گو ہے اوجھل لیکن ہے دل میں تو ہی
تیری الوہیت کا شاہد ہے سب زمانا

کیوں کر نہ تجکو جانیں کیونکر نہ تجکو مانیں
تجھ پر ہی تو ہے شایاں مخلوق کا بنانا

انساں جب بنا تھا کچھ بھی نہ اُس کی ہستی
مٹّی کی مورتوں کو تو نے کیا توانا

سب ہیں ترے بنائے سب ہیں ترے ہی بندے
سلطاں ہو گدا ہو نادان ہو کہ دانا

یہ آنکھ ناک اپنی یہ ہاتھ پاؤں اپنے
بخشے ہوئے ہیں تیرے بے شک ہے تو یگانا

کیوں آفتاب نکلا کیوں ماہتاب ڈوبا
آتا نہیں سمجھ میں کچھ تیرا کارخانا

تاروں کا جھلملانا ٹھنڈی ہوا کا چلنا
ہوتا ہے کیا سحر کا وہ وقت بھی سہانا

بلبل کا وہ چہکنا غنچوں کا وہ چٹکنا — فصلِ بہار کا بھی کیا خوب ہے زمانا
یہ کائنات تیری دنیا میں جس نے دیکھی — قُدرت کو تیری یارب ہے دل سے اُس نے مانا
احسان مند تیرے اے خالقِ دو عالم — کچھ ہم نہیں اکیلے ہے بلکہ سب زمانا
تو نے ہماری خاطر وہ رہنما ہیں بھیجے — جن کا تھا کام ہردم نیکی بدی بتانا
جتنی برائیاں تھیں اُن سے ہمیں بچایا — البتہ نیکیوں کا تھا فرض انھیں سکھانا

حیران کیوں ہے منکر کہدو یہ اُس سے احسنؔ
دیکھا نہیں خدا کو ہے عقل سے تو جانا

انسدادِ مے نوشی (احسن مارہروی)

جو بندگانِ خدا حکمِ حق نہیں سنتے — سبک کرے گی بہت اُن کی یہ گراں گوشی
اِدھر کرم ہے خدا کا اُدھر ستم اُن کا — عجیب ہے یہ عطا پاشی و خطا کوشی
حقیقت اپنی وہ بھولے ہوئے ہیں دنیا میں — کرے گی حشر میں رسوا یہ خود فراموشی
رہِ صواب میں کوئی قدم نہیں اُٹھتا — بصد شغف ہے بد اعمالیوں سے ہم دوشی
خدا نے عقل جو دی ہے تو ہوش میں آئیں — خمارِ عیش سے کب تک رہے گی مدہوشی
ملیں گے خاک میں سب خاکداں کے باشندے — نہ کام گُل بدنی آئے گی نہ گُل پوشی
جو ولولے لئے اُٹھے ہیں اہلِ جوش و خروش — اُبال بن کے نہ رہ جائے اُن کی سرجوشی
کدھر ہے پیرِ مغاں آئے اور دکان بڑھائے — لگائے قلقلِ مینا پہ مُہرِ خاموشی
شراب جس میں ہے آمیزشِ شرارت و شر — نکالے گھر سے اُسے دے سزائے پاپوشی
گریز کس لئے ہے راہِ استقامت سے — سکھا دیا ہے یہ کس نے طریقِ خرگوشی

اسی پری نے بنایا بشر کو دیوانہ
خلافِ عقل نہ کیوں اُس کی ہو ہم آغوشی

لگائے مُنھ نہ کبھی بھول کر اُسے کوئی
ہمیشہ یاد سے اُس کی رہے فراموشی

نجاست اور خباثت نہ جائے گی اُس کی
ہزار پاک کریں پنڈت اُس کو یا جوشی

جو کچھ ہو دل میں ارادہ کہو علانیہ
یہ چپکے چپکے مناسب نہیں ہے سرگوشی

ہمیں ست ساعتِ گفتن ہمیں ست وقتِ غریو
عجب کہ محوِ خموشی! غضب کہ مخروشی

یقیں کیجیے ہو جائیں سب دلدّر دور
اگر ہو کلیتہً انسدادِ مے نوشی

بیکار مباش کچھ کیا کر (احسن مارہروی)

انسان وہ ہے جو زندگی میں
بیکار رہے نہ وقت پاکر

چوبیس ہیں رات دن میں گھنٹے
بیٹھے کوئی پل نہ وہ بُھلا کر

ایک ایک سکنڈ کی کرے قدر
آتا نہیں کوئی وقت جاکر

کاہل کی نہیں ذرا بھی عزّت
اے دوست نہ اُس سے تو ملا کر

آرام کے وقت ہیں جو عقلاً
اُن میں آرام کر لیا کر

ایسا نہ ہو کوئی کام رہ جائے
آخر میں ہو جس کا رنج آکر

اور کام نہ ہو جو کوئی اپنا
اوروں ہی کا کام کر دیا کر

گر کام ملے نہ دوستوں کا
تو نیکوں کی گفتگو سنا کر

گر کوئی ملے نہ کہنے والا
پھر سیرِ کتب کا مشغلہ کر

اس کہنے سے میرا ہے یہ مطلب
بے کار مباش کچھ کیا کر

تلاش

(احمد شجاع انصاری)

تاروں بھری رات کی فضا میں
مہتاب کی دل ربا ضیا میں
معشوقۂ شب کی ہر ادا میں
آنکھیں مری تجکو ڈھونڈتی ہیں

ہر پردۂ موجِ آبِ جو میں
کوئل کے ترانہ ہائے کو میں
پھولوں کی ادا میں رنگ و بو میں
آنکھیں مری تجکو ڈھونڈتی ہیں

ہر کاکلِ سنبلیں کے خم میں
برقِ رخِ روشنِ صنم میں
جادوئے نگاہِ پُرستم میں
آنکھیں مری تجکو ڈھونڈتی ہیں

ہر شاخ میں پھول میں ثمر میں
ہر لعل و زمرّد و گہر میں
ہر منظرِ کوہ و بحر و بر میں
آنکھیں مری تجکو ڈھونڈتی ہیں

خورشید کے ذرّوں کی چمک میں
گلہائے دمیدہ کی دمک میں
ہر غنچۂ باغ کی چٹک میں
آنکھیں مری تجکو ڈھونڈتی ہیں

فریادِ دلِ حزیں کی نے میں
شوخیِ سرود و رنگِ مے میں
ہر نغمۂ دل نشیں کی لے میں
آنکھیں مری تجکو ڈھونڈتی ہیں

انوارِ جبینِ نازنیں میں
تحریرِ نگاہِ سرمگیں میں
ہر ایک مکاں میں ہر مکیں میں
آنکھیں مری تجکو ڈھونڈتی ہیں

عاشق کے نیاز مندوں میں
رخسارۂ ماہ وش کے تل میں
آتش میں ہوا میں آب و گِل میں
آنکھیں مری تجکو ڈھونڈتی ہیں

شیخ و شباب (اختر لکھنوی)

کل شیخ بن کے مجتہدِ عصر سا قیا
دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا زراہِ تبختر مجھے یہ طنز
معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا
پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
لیکن نہ کیجئے مجھے موردِ عتاب کا
مے کنج اور کنج باغ ہو ساقی ہو ماہ وش
اور کوئی بھی مخل نہ ہو باعث حجاب کا
بمر دن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حیا
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا
کھینچ اُس کو اور اپنے ملا کر وہ منھ سے منھ
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالا شراب کا
اُس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

بی بی حوّا بابا آدم سے کہتی ہیں (اختر جوناگڈھی)

ہے کیسی مفرّح یہ ٹھنڈی ہوا
ہے دل چسپ کیسا سحر کا سماں
وہ مرغِ خوش آہنگ کے چہچہے
وہ اُڑ اُڑ کے جانا یہاں سے وہاں
مہکنا وہ گلہائے خوش رنگ کا
تر و تازہ ہوں جن سے روح و رواں
لپٹ جانا وہ شاخ کا شاخ سے
وہ غنچوں کے لب سے تبسّم عیاں
جوانانِ گلشن کی وہ چھیڑ چھاڑ
وہ پھولوں سے بلبل کی اٹھکھیلیاں
شعاعوں کا وہ عکس تالاب میں
وہ ہونا ہر اک موج کا زر فشاں
وہ پُر لطف لیلائے شب کا ورود
وہ راحت فزا چاندنی کا سماں
چمکتے دمکتے ستاروں کا نور
ہو جس سے منوّر یہ سارا جہاں
وہ مخلوق کا ایسا پیہم سکوت
کہ کانوں کو اک "ہوں" بھی گزرے گراں
شگفتہ مگر دل کو تیرے بغیر
کریں گی نہ ہرگز یہ دل چسپیاں

پردیسی کی فریاد (علی اختر حیدرآباد دکن)

اے موجِ صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا
وہ دیس جہاں کی خاک بھی ہے آنکھوں سے لگانے کے قابل
وہ دیس جہاں کا ہر ذرّہ ہے ایک عبادت خانۂ دل
وہ میرے خیالوں کی جنّت وہ میری اُمیدوں کا حاصل

وہ میری مرادوں کا مرکز وہ میرے ارادوں کی منزل
اے موجِ صبا کچھ حال سنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں طفلی کی بہاریں روشن و رقصاں گزری ہیں
وہ دیس جہاں غم کی گھڑیاں صد رنگ بداماں گزری ہیں
وہ دیس جہاں میری راتیں سرشار و غزل خواں گزری ہیں
وہ دیس جہاں میری صبحیں مسرور و درخشاں گزری ہیں
اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں ندّی کے کنارے بہروں کھیلا کرتا تھا
کس شوق سے پانی کی لہروں کے رقص کو دیکھا کرتا تھا
مہتاب سُلانے آتا تھا، خورشید جگایا کرتا تھا
ہستی کے ستم سے ناواقف جینے کی تمنّا کرتا تھا
اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس فضاؤں میں جس کی سرشار جوانی آئی تھی
وہ دیس جہاں دل میں اُلفت کی پہلی کرن تھرّائی تھی
وہ دیس جہاں اک شوخ نظر پیغامِ صراحت لائی تھی
رگ رگ میں نہاں اک درد سا تھا اک چوٹ سی دل پر کھائی تھی
اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

وہ دیس جہاں بیکار تھیں سب ہستی کی ستم پرور گھاتیں
دل چسپ وہ باغوں کی سیریں دل کش وہ سہانی برساتیں

گھنگھور گھٹاؤں کا اُٹھنا، ساغر کی کھنک سرخوش باتیں
اللہ کدھر پنہاں ہیں وہ دن اللہ کہاں ہیں وہ راتیں

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

للّٰلہ بتا مجھ بے کس کو یارانِ وطن کیا بھول گئے
پردیس کا عالم ہوتا ہے کس درجہ غم افزا بھول گئے
مدّت سے ہے اک آوارہ وطن محرومِ تمنّا بھول گئے
آتا ہوں کسی کو یاد بھی میں سب مجکو وہاں یا بھول گئے

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

کہنا کہ تمھارے ساتھی کو دنیا کے ستم نے لوٹ لیا
پردیس میں پیہم ناکامی کے رنج و الم نے لوٹ لیا
ہستی کی متاعِ عشرت کو بے مہری غم نے لوٹ لیا
اُمّید کو نا اُمّیدی کے احساسِ اتم نے لوٹ لیا

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

گھنگھور گھٹا ئیں آتی ہیں، وہ مُنھ اشکوں سے دھوتا ہے
غنچے متبسّم ہوتے ہیں وہ سر دُھنتا جاں کھوتا ہے
تم محوِ فغاں پاؤ گے اُسے، جب ذرّہ ذرّہ سوتا ہے
روتوں کو ہنساتا تھا جو، کبھی دن رات پڑا اب روتا ہے

اے موجِ صبا کچھ حال سُنا اُس دیس کے رہنے والوں کا

فاقے کی ایک شام (علی اختر حیدرآباد دکن)

(بچے کو روتا دیکھ کر)

رو نہ اے دلبند! اے تسکینِ جانِ بے قرار
تیری بے چینی کے صدقے تیرے رونے کے نثار

تیرے رونے کا یہ عالم ہے تو اے جانِ پدر
خون ہو کے بہہ نہ جائے میری آنکھوں سے جگر

ہنس کہ ہنسنے کے لئے ہے شوقِ بے پروا ترا
پھول سے یہ لب ترے یہ چاند سا چہرا ترا

مہر و مہ سے گرچہ رخشاں ہے زمانے کی جبیں
آہ میرے پاس مٹی کے کھلونے بھی نہیں

کس طرح بہلاؤں تجکو کس طرح تسکین دوں
زخم دارِ عسرت و بیچارگی ہوں کیا کروں

درد سے بے چین ہوں میں بھوک سے ہے تو نڈھال
درد کیا؟ اس عمر میں تیری اذیت کا خیال

ہائیں یہ مجھ سے لپٹ کر کس لئے چپ ہو گیا
روتے روتے دھیمی دھیمی سسکیاں بھرنے لگا

کیا تجھے بھی میری غمگیں زندگی کا پاس ہے
کیا تجھے بھی میرے سوزِ روح کا احساس ہے

تو سمجھ کر رو رہا ہے تیرہ بختی پر مری؟
ہے عیاں تیری نگاہوں پر مری بے چارگی

دیکھتا ہے مجکو غمگیں اس لئے ہے مضمحل
دردِ ہستی کو سمجھتا ہے ترا معصوم دل

جھلملائی شمع کی دھندلی سی اک تنویر ہے
مجھ پہ ہے جو حال طاری اُس کی تو تصویر ہے

نرم و نازک پنکھڑی بیگانۂ زلفِ نسیم
یعنی میری گود میں بھی تو ہے مانندِ یتیم

آہ یہ دنیا سراسر قلزمِ قہر و گناہ
کشتیِ انسان ہے طوفانِ مصائب میں تباہ

خاک کے ذرے نہیں یہ سطح پر بکھرے ہوئے
روحِ انسانی کے اجزاء ہیں مگر بکھرے ہوئے

دوڑتا ہے ہر طرف زیرِ فضائے آسماں
پیچ و خم کھاتا ہوا افلاس و حسرت کا دھواں

جنبشِ پیہم سے ہے ڈوبی ہوئی نبضِ حیات
اک نوائے درد بن کر رہ گئی ہے کائنات

اک فضا ہے اور اس پہنائے گیتی سے عظیم | جس میں غنچے مسکراتے ہیں نہ گاتی ہے نسیم
اور بھی ہے اک سمندر روز و شب سرگرم جوش | جس کے آگے ہیچ ہے عمّان و قلزم کا خروش
وہ فضا ہے کشتگانِ غم کے نالوں کی فضا | درد سے لبریز ہے حرفِ کلفت صبر آزما
اس سمندر میں رواں ہیں بے کسوں کے اشکِ غم | خونِ دل خونِ جگر سیلِ آفریں موجِ الم

کاش ان تاریکیوں میں بارشِ انوار ہو
کاش یہ دنیا ہوس کے خواب سے بیدار ہو

گُلِ افتادہ (گور سرن لعل ادیب لکھنوی)

کل صبح دم ہُوا جو چمن کی طرف گزر
دیکھا کہ حسنِ صحنِ چمن ہے بہار پر
اک مظہرِ عنایتِ پروردگار ہے
کلیاں کھلی ہوئی ہیں صبا مشک بار ہے
گلشن میں تھی عیاں چمنِ خلد کی بہار
احسان سے بہار کے شاخیں تھیں بار دار
مظہر تھے کردگار کے فیضِ عمیم کے
آتے تھے سرد سرد جو جھونکے نسیم کے
دل کش تھے طائرانِ خوش الحاں کے چہچہے
دیتے تھے لطفِ رقص کا سبزے کے لہلہے
کچھ دیر تک تو کرتا رہا سیرِ گلستاں
آخر کو شاد شاد چلا جانبِ مکاں
لطفِ خیالِ سیرِ چمن تھا دماغ میں
باہر تھا گرچہ باغ سے لیکن تھا باغ میں
اس حال میں پڑی مری اک پھول پر نظر
جو تھا تباہ حال پڑا فرشِ خاک پر
محروم تھا اگرچہ زبانِ مقال سے
جذباتِ دل عیاں تھے مگر اس کے حال سے
محوِ خیال دیکھ کے میں اس کو کھو گیا
پس دفعتاً یہ آنے لگی کان میں صدا

اے راہ گیر دیکھ ذرا غور سے ادھر
میں ہوں شکارِ گردشِ افلاک سر بسر

اک وقت تھا کہ زیبِ گلستان تھا آہ میں
رکھتا تھا بلبلانِ خوش الحان سے راہ میں

بلبل کہانی کہتی تھی سوز و گداز کی
کیا گفتگوئیں ہوتی تھیں راز و نیاز کی

چشم و چراغِ صحنِ گلستاں تھا ایک دن
ہر دردِ دل کے واسطے درماں تھا ایک دن

عالم عجیب تھا مرے رُخ پر جلال کا
رنگِ صبیح عطر تھا حسن و جمال کا

پڑتی تھی میرے حسن پہ ہر ایک کی نظر
تھا باغباں کی سخت ریاضت کا میں ثمر

اپنے وطن میں عالمِ عہدِ شباب میں
آتا تھا سب کی میں نظرِ انتخاب میں

کچھ انقلابِ دہر کی مجکو نہ تھی خبر
وہ وقت تھا کہ حسن تھا میرا شباب پر

القصہ یوں ہی عیش میں وہ دن ہوئے بسر
افسوس ایک بچے کی مجھ پر پڑی نظر

مجھ پہ پڑی نگاہ۔ جو اس نونہال کی
کچھ دیر اس نے خوب مری دیکھ بھال کی

بعد اس کے اُس نے شاخ سے مجکو کیا جدا
افسوس میرے حسن نے مجھ پر ستم کیا

آنا تھا میرا تھا کہ وہ باغ باغ تھا
خوش بو سے میری اس کا معطر دماغ تھا

کچھ دیر میرے بوسے پیا پے لیا کیا
لبہائے سرخ سے مجھے اپنے مُلا کیا

جب لے گیا مجھے گلِ رخسار کے قریب
پھر ایک ہم جمال کا پہلو ہوا نصیب

کچھ دیر اس طرح سے غرض کھیل کھال کے
آخر چلا گیا وہ یہاں مجکو ڈال کے

اُس وقت سے عجیب بلا میں ہوں مبتلا
پرساں نہیں ہے کوئی دلِ بے قرار کا

گھیرے ہوئے ہیں جو غم و آلام زندگی
پیغامِ مرگ ہے مجھے پیغامِ زندگی

اپنے وطن سے دور ہوں ننگِ وطن ہوں میں
یعنی غبارِ خاطرِ صحنِ چمن ہوں میں

افسوس ناک ہے مرا انجامِ زندگی
میں مبتلائے درد ہوں تا کامِ زندگی

اللہ یوں کرے نہ کسی کو وطن سے دور
قسمت نے جیسے پھینکا ہے مجکو چمن سے دور

منزلِ مقصود (عبدالرؤف۔ ادیب سہارن پوری)

جانتا ہوں منزلِ مقصود جتنی دور ہے
کامیابِ جستجو ہونا کسے منظور ہے

جا رہا ہوں جس طرف بھی جا رہا ہوں الاماں
صرف اس احساس کی ضد پر کہ منزل دور ہے

اور ہو جاتا ہے مستحکم مرا عزمِ طلب
جب کوئی آواز آتی ہے کہ منزل دور ہے

دیدۂ بیباک کو آتا نہیں ہے اعتبار
دل کو یوں بہکا ہی لیتے ہیں کہ تو مستور ہے

جانتا ہوں حُسنِ خودبیں کی فریب اندازیاں
احترامِ عشق ہے مانع زباں مجبور ہے

رازِ دل کہتا ہوں لیکن تحتِ آدابِ نیاز
میرے دل میں بھی مذاقِ شوخیِ منصور ہے

جذب ہو کر رہ گئیں میرے دلِ پُرشوق میں
آہ وہ کیفیتیں جن سے جہاں معمور ہے

الاماں طرزِ اصولِ بے نیازی الاماں
جس کو جو کچھ دیدیا ممنون ہے مسرور ہے

احتیاجِ پیرویِ غالب و مومن ادیبؔ
بات کہنے کی نہیں کہتے ہیں دلّی دور ہے

مُزدِ غریب (ارشد تھانوی)

مُزدِ طلب غریب کی سعیِ عمل کو دیکھئے
اور صلۂ محقّر اہلِ دول کو دیکھئے

جہد سے اُس کی لگ گئے بزمِ جہاں کو چار چاند
آج کو رکھ کے سامنے غور سے کل کو دیکھئے

کارگہِ حیات کے سلسلۂ نظام میں
اُس کے درست و کامیاب ردّ و بدل کو دیکھئے

خونِ پسند کرے ایک، اُس نے بسادئیے ہیں شہر
باغ و بہار کر دیا دشت و جبل کو دیکھئے

رنگ بکھر رہے ہیں، نو بہ نو منظرِ کائنات میں
کتنا فروغ دیدیا حُسنِ ازل کو دیکھئے

دہر میں پھر بھی اُس کا کیوں خیر طلب نہیں کوئی
اُس کے وجوہ سوچئے اُس کے علل کو دیکھئے

بے کس و بے نوا بھی ہے زار و نحیف بھی وہ آپ
آتا ہے آہ! رحم کیا اُس پہ اجل کو دیکھئے

عرض کئے ہیں واقعات ارشدِ دلفگار نے
آپ سمجھ کے مرثیہ اُس کی غزل کو دیکھئے

بارش کا پہلا قطرہ (اسمٰعیل میرٹھی)

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

ہر قطرے کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ

تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا
میں اور کی گوں نہ آپ جوگا

کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس
اپنا ہی کروں گا ستیاناس

آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
مٹّی پتھر تمام ہیں گرم

خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت
پھیکی باتوں میں کیا حلاوت

کس برتے پر میں کروں دلیری
میں کیا ہوں کیا بساط میری

ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم
سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم

کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی
کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمّت کے محیط کا شناور

فیاض و جواد و نیک نیّت
بھڑکی اس کی رگِ حمیّت

بولا للکار کر کہ آؤ — میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان — ڈالو مردہ زمین میں جان
یارو یہ ہیچ مچر کہاں تک — اپنی سی کرو بنے جہاں تک
مل کر جو کرو گے جاں فشانی — میدان پہ پھیر دو گے پانی
کہتا ہوں یہ سب سے بر ملا میں — آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ — دشوار ہے جی پہ کھیل جانا
ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت — کی اس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جرأت جو اس سخی کی — دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا — قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار — بارش لگی ہونے موسلا دھار
پانی پانی ہوا بیاباں — سیراب ہوئے چمن خیاباں

تھی قحط سے پائمال خلقت
اس مہ سے ہوئی نہال خلقت

ہوا (اسمٰعیل میرٹھی)

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈا ہوا چلی — کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی
لہرا دیا ہے کھیت کو ہلتی ہیں بالیاں — پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی — سویا ہوا تھا سبزہ اسے بھی جگا چلی
سرسبز ہوں درخت نہ باغوں میں تجھ بغیر — تیرے ہی دم قدم سے ہے بھاتی چمن کی سیر

پڑ جائے اس جہان میں تیری اگر کمی چوپایہ کوئی زندہ بچے اور نہ آدمی
چڑیوں کو یہ اُڑان کی طاقت کہاں رہے پھر کائیں کائیں ہوں نہ غٹر غوں نہ چہچہے
بندوں کو چاہئے کہ کریں بندگی ادا
اُس کی کہ جس کے حکم سے چلتی ہے یہ سدا

میدانِ جنگ (اسمٰعیل میرٹھی)

جہاں کل سپہدار تھے حکمراں کھڑے تھے جہاں ترچھے بانکے جواں
جہاں کل تھے فیلانِ جنگی ہزار گڈاتے تھے گھوڑے جہاں شہسوار
جہاں پاسباں کل تھے للکارتے پرندے بھی ڈرتے تھے پر مارتے
وہاں آج لاشوں کے انبار ہیں پڑے ہر طرف سینہ افگار ہیں
وہ سر جس پہ تھا کل جواہر کا تاج
سو ہے خاک اور خوں میں آلودہ آج

شاعر اور خطیب (اسد ملتانی)

ذوقِ ایثار و عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے زیست اس طرح کی زیبا نہ تجھے ہے نہ مجھے
ڈھونڈتے رہتے ہیں لذّت سخن آرائی میں عملی کام کا چسکا نہ تجھے ہے نہ مجھے
مست رکھتا ہے ہمیں نشۂ صہبائے سخن حاجت ساغر و مینا نہ تجھے ہے نہ مجھے
ہمہ تن قال ہی رہتا ہے گماں کی دانش مان لیتا ہوں کہ سودا نہ تجھے ہے نہ مجھے
اپنی ان باتوں کو ہم چاہتے ہیں منوانا جن پہ الہام کا دھوکا نہ تجھے ہے نہ مجھے

ہے وہ مسحور فقط سن کے ہماری باتیں — قوم نے غور سے دیکھا نہ تجھے ہے نہ مجھے
فکر پر فخر تجھے اور مجھے نطق پہ ناز — دست و بازو پہ بھروسا نہ تجھے ہے نہ مجھے
میرا چلتا ہے قلم اور تری چلتی ہے زباں — حوصلہ جنبشِ پا کا نہ تجھے ہے نہ مجھے
تجھکو تقریر سے مطلب مجھے اشعار سے کام — حالتِ قوم کی پروا نہ تجھے ہے نہ مجھے

لاکھ اسعد ہم کو دکھائے رہِ میدانِ عمل
اپنے کوچے سے نکلنا نہ تجھے ہے نہ مجھے

زمزمۂ بقا (اسعد ملتانی)

ہے خاک تغیّر کے سوا بادِ فنا میں — پانی جو سمندر سے اُڑا ہے وہ گھٹا میں
دنیا ہے تماشا گہہِ نیرنگِ تغیر — طوفانِ فنا موج ہے دریائے بقا میں
قانونِ فنا ڈھالتا رہتا ہے ہمیشہ — طاقت کو حرارت میں حرارت کو ضیا میں
اے دوست بظاہر جو فنا ہو گئی جل کر — موجود ہیں اُس شمع کے ذرّات ہوا میں
سورج نہیں معدوم اگر ڈوب چکا ہے — اس وقت بھی ہے نصف جہاں اُسکی ضیا میں
شبنم کے وہ قطرے جو اُڑے دامنِ گل سے — روپوش ہوئے پردۂ آغوشِ صبا میں
اشعار جو نکلے کسی شاعر کی زباں سے — محفوظ ہوئے سینۂ اربابِ صفا میں
ضائع نہ گئی قوّتِ انگشتِ مغنّی — تبدیل ہوئی جنبشِ مضراب صدا میں
خامی ہے سماعت کی جو ہم سن نہیں سکتے — پھرتا ہے ابھی نغمۂ داؤد ہوا میں
طے کرتے ہوئے عرصۂ ہستی کے منازل — ہم چھوڑتے جاتے ہیں نقوش اپنے فضا میں
اک بار پھر اس زیست کی تصویر مکمّل — آئے گی نظر آئینۂ روزِ جزا میں

دعا (اسد ملتانی)

اے دل تو ہی بتا کہ میں مانگوں خدا سے کیا / ہوتا ہی ہے جہان میں میری رضا سے کیا
ہے زیست اپنے بس میں نہ موت اختیار میں / مطلب ہمیں پھر اپنی فنا و بقا سے کیا
طوفاں کا زور شور ہے دریا ہے موجزن / آب و ہوا کو آرزوئے ناخدا سے کیا
وقتِ معینہ پہ خزاں آئے گی ضرور / ہوتا ہے عندلیب کے شورِ نوا سے کیا
اس کے سوا کہ دل کا نکل جائے کچھ بخار / ہوتا ہے غم نصیب کی آہ و بکا سے کیا
جو حلقۂ کمانِ قضا سے نکل چکا / رک جائے گا وہ تیر مری التجا سے کیا
وہ بھی تو اپنے کام میں مجبورِ محض ہیں / شکوہ کروں میں کارکنانِ قضا سے کیا
ہر بات سے وہ قادرِ مطلق ہے بے نیاز / اُس کو بھلا غرض ہے مرے مدّعا سے کیا

اُٹھتے ہیں خود بخود مرے دستِ دعا اسدؔ
ہر چند سوچتا ہوں کہ ہوگا دعا سے کیا

تازیانہ (اسد ملتانی)

کب تک اے غافل یہ بے حاصل خیال آرائیاں / ایک گوشے میں پڑے رہ کر فلک پیمائیاں
اُڑ کے پہنچے رفعتِ گردوں پہ اربابِ عمل / اپنے بستر ہی پہ تو لیتا رہا انگڑائیاں
اپنے ہم جنسوں کی صحبت سے ہمیشہ اجتناب / اور نجومِ آسماں سے انجمن آرائیاں
اک خیال و خواب کی دنیا میں رہنا رات دن / عالمِ ہستی کے ہنگاموں سے بے پروائیاں
رفتہ رفتہ کر گئے زائل قوّتِ سعی عمل / تجھ کو لے ڈوبیں نہ تیری فکر کی گہرائیاں

کب تلک باغِ تصوّر کا تماشا کب تلک
کھول آنکھیں دیکھ فطرت کی چمن آرائیاں

کیوں حقیقت کے سمندر کو سمجھتا ہے سراب
اے ترے دم سے فروغِ دیں کی سوفسطائیاں

تجربات زندگی پر جب نہیں اُن کی بنا
سربسر اوہام باطل ہیں تری دانائیاں

تیری نظروں میں نہ ہو جب تک فضائے کائنات
کیا کھلیں تجھ پر خود اپنی ذات کی پہنائیاں

تاکہ تیرا دیدۂ باطن کرے کسبِ ضیا
دیکھ چشمِ ظاہری سے حسن کی رعنائیاں

آہ تو نے حلقۂ الفاظ تک محدود کیں
حسن کی دارائیاں اور عشق کی گیرائیاں

اے کہ تو دنیا میں ہے تفسیرِ مالا یفعلون
عاقبت میں بھی تجھے حاصل نہ ہوں رسوائیاں

مجاز و حقیقت (اصغر گونڈوی)

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی

گزر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے
جمال دوست شبِ ماہ و بادۂ عنبی

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادا و رسمِ بلالی و طرز بو لہبی

ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا
کہاں ہے آج تو اے ماہتابِ نیم شبی

سرشتِ عشق طلب بحرِ حسن بے پایاں
حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اُڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیرِ لبی

عالمِ کیف میں (افسر میرٹھی)

حسن والے دیکھنے دے حسنِ بے پروا مجھے
آ بنا دے پھر ذرا موسیٰ کا چہرہ وا ہا مجھے

تو ہو میں ہوں اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو
ہو اگر خلوت تو خلوت ہی رہے موسیٰ نہ ہو

پردہ جو حائل من و تو میں ہے وہ بھی چاک ہو
حسنِ مطلق بے حجابانہ رہے بے باک ہو

تو تبسم بن کے لہرائے جائے اور میں لب بنوں
نور تیرا مجھ میں چمکے اور میں کوکب بنوں

میں بنوں بادل تو اس بادل میں پانی تو بنے
میں بنوں دریا تو دریا کی روانی تو بنے

پھول میں ہوں اور پھر اس پھول کی خوشبو ہو تو
اور ہوا کے ساتھ پھیلے ہر طرف ہر سو ہو تو

میں بنوں بلبل اور اس بلبل کا نغمہ تو بنے
یوں ملیں دونوں کہ موسیقی کا اک دریا بنے

میں تو دل ہو جاؤں تو دل کے لئے پہلو بنے
پھر محبّت میں ہوں اور دل کی دھڑکن تو بنے

ایک جب ہو جائیں ہم دونوں تو پھر کھو جاؤں میں
تیرے پہلو میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں میں

پیامِ روح (افسر میرٹھی)

مسافر زندگی کے کس لئے مغموم ہوتا ہے
تجھے شاید یہ رستہ کچھ کٹھن معلوم ہوتا ہے

ادھر آسن میں تیرے واسطے پیغام لایا ہوں
سفر میں میں بھی تیرے ساتھ ہی چلنے کو آیا ہوں

ہے منزل تجھ میں خود موجود اپنا راہ پر ہو جا
خود اپنی روح کی گہرائیوں سے با خبر ہو جا

خبر تجھ کو نہیں شاید کہ ہے در باز ہستی کا
ہے مضمر ذات میں تیری ہی خود کل راز ہستی کا

ہے تجھ میں جلوہ افگن مہرِ تاباں تو وہ ذرّہ ہے
تری ہستی بڑی ہستی ہے تو یہ بھی سمجھتا ہے

نظر گر خود یہ اک منظر ہے تو شانِ جلالی کا
کہ تیری ذات میں ہے عکس حسنِ لازوالی کا

نظر آتا ہے تو بھی جلوۂ معبودِ برحق میں
کہ تیری روح بھی جلوہ نما ہے روحِ مطلق کا

ابھی تک تو نے رکھی ماسوا ہی پر نظر اپنی
تجھے کرنا ہے پیدا کچھ بھروسا ذات پر اپنی

تری نادانیوں کا چشم و دل پر تیرے قبضہ ہے
انھیں نادانیوں کا نام تو نے غم بھی رکھا ہے

طلوعِ صبحِ نو ہے رات دنیا سے ہوئی رخصت
ابھی تک تیری آنکھوں پر پڑا ہے پردۂ غفلت

حیاتِ نو کا جلوہ ہو گیا طاری فضاؤں میں
ہیں نغمے منتشر راحت کے دنیا کی ہواؤں میں

محبّت اور خوشی ہے زندگی تجکو خبر بھی ہے
محبّت اور خوشی کا نام ہی دنیا میں نیکی ہے

محبّت اس جہاں کے ذرّے ذرّے سے ٹپکتی ہے
نہ دیکھے تو تو یہ تقصیر خود تیری نظر کی ہے

خوشی ہر چیز سے پیدا ہے اس دارِ مسرت میں
خوشی کا حس نہ ہو تجکو تو خود ہی تو ہے غفلت میں

جہاں لبریز ہے جب جلوۂ نورِ حقیقی سے
خوشی نورِ حقیقی میں نہو کیوں کر یہ ممکن ہے

جہاں میں ہر طرف سرچشمۂ راحت کا جلوہ ہے
کوئی طالب تو ہو راحت کا راحت کی کمی کیا ہے

فرشتے سے خطاب (افسر میرٹھی)

اے فرشتے اے مقدّس روح تجھ پر ہو سلام
آج ہمّت کر کے ہوتا ہوں میں تجھ سے ہم کلام

میرے دل میں جاگزیں ہیں تیری سب اعلیٰ صفات
پوچھتا ہوں میں بصد تعظیم تجھ سے ایک بات

تیری دنیا ہے جہاں ہوتا نہیں ہے غم وہاں
غم سے تو نا آشنا ہے تو سکونِ دل کہاں

غم میں کتنا کیف ہے یہ بھی تجھے معلوم ہے
کیفیت سے یہ تری روحانیت محروم ہے

لطف راحت کا نہیں ملتا ہے جب تک غم نہ ہو — وہ خوشی کی قدر کیا جانیں جہاں ماتم نہ ہو
ہوتی ہے رنج و مصیبت سے جِلا ہر روح کو — غم سے رفعت ہوتی ہے اکثر میسّر روح کو

کچھ خبر ہے دل کی دھڑکن میں ہے لذّت کس قدر
آنسوؤں میں کیف بھرتی ہے محبّت کس قدر

خواب میں بھی جب نظر آئے نہ تاریکی تجھے — نور والے! نور ہی کی قدر کیا ہو گی تجھے
رنج و غم لازم نہیں ہے کچھ گناہوں کے لئے — اور بھی اکثر سبب ہوتے ہیں آہوں کے لئے
حد سے جب گزرے اولوالعزمی تو ہوتا ہے ملال — غم گناہوں کا نتیجہ ہی نہیں اے خوش خصال
میں نے یہ مانا خدا سے ہے بہت ہی تو قریب — جانتا ہوں تجکو ہر لحظہ حضوری ہے نصیب
لیکن اے نورِ مجسّم یہ بھی ہے تجکو خبر — ہم سے ہے نزدیک تیرا حسن والا کس قدر
آ کے دیکھے گر تو رگ رگ میں اُسے پائے گا تو — اتنی قربت دیکھ کر حیران رہ جائے گا تو
خاک کے پتلوں میں جلوہ اپنا دکھلاتا ہے وہ — دیکھو تو آ کر ہر انساں میں نظر آتا ہے وہ

ہائے افسرؔ ہے ہمارا دُکھ مبارک کس قدر
دل میں سُکھ بن کر وہ آتا ہے کبھی دکھ ہو اگر

زندگی اور موت (افسر میرٹھی)

زندگی کیا ہے کسی نادان سے پوچھو اگر — یہ کہے گا گھپ اندھیرے میں شعاعِ نور ہے
زندگی کیا ہے جواب اسکا یہ دے گا اک فہیم — نور میں دھبّا ہے تاریکی کا لیکن دور ہے

بعد مرنے کے جو پوچھو تم کہ کیا پیش آئے گا — میں کہوں گا وہ جو پیش آتا ہے پیدائش کے بعد

زندگی اور موت دو ساتھی ہیں جو ہر روح کو
باری باری سے لئے جاتے ہیں منزل کی طرف

فلسفۂ کامیابی (افسر میرٹھی)

جو سب سے بدتر تھے اس جہاں میں ہیں اُن کے وارث ہی سب سے بہتر
رکاوٹیں جس قدر ہوں پیدا اُسی قدر کامیاب ہو گے
یہ چھاؤں جس سے گزر رہے ہو ثبوت بیّن ہے دھوپ کا خود
شکست کا لطف پا چکے ہو تو ایک دن فتح یاب ہو گے
خزاں اُجاڑے گی جس چمن کو بہار آئے گی اُس چمن میں
اُسے خوشی بھی نہ ہو گی حاصل جسے کبھی غم نہیں رہا ہے
خدا رسیدہ بزرگ ہونا اُسی سے ممکن ہے اس جہاں میں
گناہ گاروں میں جو یہاں کے کسی سے کچھ کم نہیں رہا ہے
جو بے بسی میں گرے ہیں افسرؔ وہی تو گہرائی سے ہیں واقف
جو دل سے نکلا ہے کوئی نالہ فلک پہ وہ با اثر رہا ہے
بلندیوں پر وہی چڑھے گا نشیب میں جو اُتر سکے گا
جو چوٹیوں پر گیا ہے رستہ وہ گھاٹیوں سے گزر رہا ہے

کمزوریاں (افسر میرٹھی)

مبارک ہیں دنیا کے کمزور لوگ مبارک ہیں دنیا میں کمزوریاں

یہی وصف کچھ کم نہیں ہے کہ تو
جہاں میں کسی پر نہیں ظلم راں
سمجھ لو کہ اب جنگ ہونے کو ہے
اکٹھے ہوئے زور والے جہاں
ہلاکت کے سامان ہوتے ہیں روز
ہیں کٹ کٹ کے مرنے کی تیاریاں
یہ آپس میں زور آزمائیں گے جب
خود اپنا مٹا دیں گے نام و نشاں
نہ ہوں زور والے تو ہوں گی نہ پھر
خدا کی زمیں پر یہ شرخیزیاں
اگر صرف کمزور دنیا میں ہوں
محبّت سے بھر جائے سارا جہاں

خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں (افسر میرٹھی)

درد جس دل میں ہو اُس دل کی دوا بن جاؤں
کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں
دکھ میں جلتے ہوئے لب کی میں دعا بن جاؤں
اُف وہ آنکھیں کہ ہیں بینائی سے محروم کہیں
روشنی جن میں نہیں نور جن آنکھوں میں نہیں
میں اُن آنکھوں کے لئے نور و ضیا بن جاؤں
ہائے وہ دل جو تڑپتا ہوا گھر سے نکلے
اُف وہ آنسو جو کسی دیدۂ تر سے نکلے
میں اس آنسو کو سُکھانے کو ہوا بن جاؤں
دور منزل سے اگر راہ میں تھک جائے کوئی
جب مسافر کہیں رستے سے بھٹک جائے کوئی
خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں
عمر کے بوجھ سے جو لوگ دبے جاتے ہیں
ناتوانی سے جو ہر روز جُھکے جاتے ہیں
اُن ضعیفوں کے سہارے کو عصا بن جاؤں

خدمتِ خلق کا ہر سمت میں چرچا کر دوں　　مادرِ ہند کو جنت کا نمونہ کر دوں
گھر کرے دل میں جو افسرؔ وہ صدا بن جاؤں

رموزِ توحید (افسرؔ میرٹھی)

ہر پھول کے رنگ و بو میں تو ہے　　کونپل میں نمو، نمو میں تو ہے
یہ رنگِ خمار کہہ رہا ہے　　تو ہے میرے سبو میں تو ہے
جلوہ ترا چارسو عیاں ہے　　چھایا ہوا چارسو میں تو ہے
سر کیوں نہ جھکے براہمن کا　　بہتے ہوئے آب جو میں تو ہے
جلوہ کس کا کلیم کیسا　　اس پیار کی گفتگو میں تو ہے
کیسا گوتم کہاں کا جنگل　　خود اپنی ہی جستجو میں تو ہے
دل میں مرے آرزو ہے تیری　　تو ہے مری آرزو میں تو ہے

جب شرق میں صبح مسکرائی　　تو نے اپنی جھلک دکھائی
ذرّے ذرّے پہ ہے یہ تحریر　　زیبا ہے تجھے تری خدائی
ظاہر ہو ہزار رنگ سے خود　　دنیا اس واسطے بنائی
ہر چیز میں تو ہے جلوہ فرما　　اللہ رے تیری خود نمائی
سب ہو گئے محو سننے والے
افسرؔ نے جو تیری حمد گائی

پیرِ حرم (سر اقبال)

ہر شے مسافر ہر چیز راہی ‏ ‏ کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی
تو مردِ میدان تو میرِ لشکر ‏ ‏ نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی ‏ ‏ یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی ‏ ‏ یا راہبی کر یا پادشاہی
پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز! گفتار واہی

مقامِ کبریا (سر اقبال)

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے ‏ ‏ کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ‏ ‏ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں ‏ ‏ یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں ‏ ‏ نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں ‏ ‏ تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے
نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

پروازِ شاہیں (سر اقبال)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ‏ ‏ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
انھیں روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

دُرِ ناب (سر اقبال)

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش
کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش
میں نے پایا ہے اسے اشکِ سحر گاہی میں جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش
نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش
صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

علم و عشق (سر اقبال)

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں حجاب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتحِ باب

دولت فقر (سر اقبال)

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
علم کا موجود اور، فقر کا موجود اور
اَشْھَدُ اَن لَّا اِلٰہ، اَشْھَدُ اَن لَّا اِلٰہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ

آدابِ جنوں (سر اقبال)

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بُجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹّی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کار گہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

تعریفِ آدم (سر اقبال)

اک رات ستاروں سے کہا نجمِ سحر نے
آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار
کہنے لگا مرّیخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار
زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا
اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار
بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار
واقف ہو اگر لذّتِ بیداریِ شب سے
اونچی ہے ثریّا سے بھی یہ خاکِ پراسرار
آغوش میں اس کی وہ تجلّی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

نام پیدا کر (سر اقبال)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

کرگس و شاہیں (سر اقبال)

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بہ تدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

پیامِ صبح (سر اقبال)

اُجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا

جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں ۔۔۔ کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا
طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنّور سے توڑا ۔۔۔ اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا
پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری ۔۔۔ برہمن کو دیا پیغام خورشیدِ درخشاں کا
ہوئی بامِ حرم پر آ کے یوں گویا موذّن سے ۔۔۔ نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا
ہلائی اس نے زنجیرِ درِ مے خانہ یہ کہہ کر ۔۔۔ اٹھو شیرازہ کھولو نسخۂ خوابِ پریشاں کا
اٹھایا آ کے سبزے کو صدائے قُم باذنی نے ۔۔۔ دبایا پائے نازک اس نے ہر طفلِ دبستاں کا
صدا دی اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر ۔۔۔ چٹک او غنچۂ گل تو موذّن ہے گلستاں کا
دیا یہ حکم صحرا کو چلو اے قافلے والو ۔۔۔ چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرّہ بیاباں کا
گئی گورِ غریباں کو جو وہ زندوں کی بستی سے ۔۔۔ تو یوں بولی نظارہ دیکھ کر شہرِ خموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب میں تم کو جگا دوں گی

عقل و دل (سر اقبال)

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا ۔۔۔ بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر گزر فلک پہ مرا ۔۔۔ دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا ۔۔۔ مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسّر کتابِ ہستی کی ۔۔۔ مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن ۔۔۔ غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے ۔۔۔ پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

علم تجھ سے تو مغفرت مجھ سے
تو خدا جو خدا نما ہوں میں

علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

شمع تو محفلِ صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں

تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربّ جلیل کا ہوں میں

خاموشی (سر اقبال)

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
فطرت ہے مراقبے میں گویا

وادی کے صدا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
ٹینگر کا خرام بھی سکوں ہے

اے دل خاموش تو بھی ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

حُسن (سر اقبال)

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
دیکھتی ہے آنکھ ہر قطرے میں یاں طوفانِ حسن

حسن کوہستان کی سنسان خاموشی میں ہے — مہر کی ضوگستری شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے — ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں — طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں

چشمۂ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں صحرا میں ویرانے میں آبادی میں حسن

گلِ رنگین (سر اقبال)

اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں — تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں — یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

توڑ لینا شاخ سے تجھکو مرا آئیں نہیں — یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں
آہ یہ دستِ جفاجو اے گلِ رنگیں نہیں — کس طرح تجھکو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

کام مجھکو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

سوز بانوں پہ بھی خاموشی تجھے منظور ہے — راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے — میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیّت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوّت نہ ہو
رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو

یہ تلاشِ متّصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

فلسفی (سر اقبال)

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھکو ترے احوال کہ میں بھی
مدّت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
جس معنیِ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

بیداری (سر اقبال)

جس بندۂ خود بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و بُرّاق
اُس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرّے میں پوشیدہ ہے جو قوّتِ اشراق
اُس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجکو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیِ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق

شعاعِ اُمید (سر اقبال)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دُنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام

مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایام

نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اُٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
اَفرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

مشرق نہیں گو لذّتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳)

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اُٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازہ میں سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلمان تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

جذبات ارتقا (سر اقبال)

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کہ حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

تربیت (سر اقبال)

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذّت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

تہذیبِ حاضر (سر اقبال)

وہی بُت فروشی وہی بُت گری ہے ۔ سنیما ہے یا صنعتِ آذری ہے
وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا ۔ یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا ۔ یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹّی یہ دوزخ کی مٹّی
وہ بت خانہ خاکی یہ خاکستری ہے

زندگیِ مستعار (سر اقبال)

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا ۔ کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک ۔ اُس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا
میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس ۔ شعلے سے بے محل ہے اُلجھنا شرار کا
کر پہلے مجھکو زندگیٔ جاوداں عطا ۔ پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو ۔ یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

لذّتِ خودی (سر اقبال)

وہ حرفِ راز کہ مجکو سکھا گیا ہے جنوں ۔ خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا ۔ وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں
حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی ۔ خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

عجب مزا ہے مجھے لذّتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستئ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

سراغِ زندگی (سر اقبال)

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھکو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

دلِ بینا (سر اقبال)

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنّت ہے جس میں حور نہیں

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

بے حضوری ہے تیری موت کا راز
زندہ ہو تو تو بے حضور نہیں

ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا
یہی آمادۂ ظہور نہیں

اَرِنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر
یہ حدیثِ کلیم و طور نہیں

تعلیمِ عمل (سر اقبال)

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور سے
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اُٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ　　چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جلیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

جلوۂ دربار دہلی (اکبر الہ آبادی)

سر میں شوق کا سودا دیکھا　　دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا　　کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

نظم ہے مجھکو بادۂ صافی　　شغل یہی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی　　خیر اب دیکھئے لطفِ قوافی

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا　　اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا　　حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے　　گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینں اور بھالے دیکھے　　بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اک جنگل دیکھا　　اُس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا　　عزّت خواہوں کا دنگل دیکھا

کچھ چہروں پر مردی دیکھی　　کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی　　دل نے جو حالت کر دی دیکھی

ڈالی میں نارنگی دیکھی　　محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی　　دہر کی رنگا رنگی دیکھی

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا — بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا — دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم — اُن کا چلنا کم کم تھم تھم
زرّیں جھولیں نور کا عالم — میلوں تک وہ چم چم چم چم

پُر تھا پہلوئے مسجد جامع — روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع — سب کے سب تھے دید کے طامع

سرخی سڑک پہ کٹتی دیکھی — سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی — لُطف کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اک چولکھی دیکھی — خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی — شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حصّہ منّ و سلوےٰ — ایک کا حصّہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا — میرا حصّہ دور کا جلوا!

اوج برٹش راج کا دیکھا — پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگِ زمانہ آج کا دیکھا — رخ کرزن مہراج کا دیکھا

اوجِ بخت ملاقی اُن کا — چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا — آنکھیں میری باقی اُن کا

آپ لوڈور (اکبر الہ آبادی)

اچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا — اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا

یہ بنتا ہوا اور وہ تنتا ہوا   پٹکتا ہوا اور جھنتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا   رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو ٹپکتا ہوا   چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا   یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
جھٹکتا ہوا غل مچاتا ہوا   وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا   یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
ادھر جھومتا اور مٹکتا ہوا   ادھر گھومتا اور اٹکتا ہوا
بپھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا   بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا
سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا   تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا
ادھر گونجتا گنگناتا ہوا   اُدھر خود بخود چھنچھناتا ہوا
لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا   یہ پھٹتا ہوا وہ سمٹتا ہوا
سماتا ہوا اور چلتا ہوا   سرکتا ہوا اور ملتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا   اُترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
یہ ہٹتا ہوا اور وہ بچتا ہوا   دباتا ہوا اور لچکتا ہوا
پھسلتا ہوا ڈگمگاتا ہوا   کچلتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا
وہ روئے زمیں کو چھپاتا ہوا   وہ خاکی کو سیمیں بناتا ہوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہوا   ہر اک سے برابر الجھتا ہوا
بہاتا ہوا اور بہتا ہوا   ہوا کے تمانچوں کو سہتا ہوا
لرزتا ہوا تلملاتا ہوا   بلکتا ہوا بلبلاتا ہوا

بلندی سے گرتا گراتا ہوا — نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
اُچھلتا ہوا اور اُڑتا ہوا — اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا — زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا — وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گجرے بہاتا ہوا — وہ چکّر میں بجرے پھنساتا ہوا
لپکتا ہوا دندناتا ہوا — اُمنڈتا ہوا سنسناتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا — سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا — حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا
تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا — شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا

یوں ہی الغرض ہے یہ پانی رواں
بس اب دیکھ لیں شاعرِ نکتہ داں

دنیا کی بے ثباتی (اکبر الٰہ آبادی)

فنا اُسی رنگ پر ہے قائم فلک وہی چال چل رہا ہے — شکستہ و منتشر ہے وہ کل جو آج سانچے میں ڈھل رہا ہے
یہ دیکھتے ہو جو کاسۂ سر غرور و غفلت سے کل تھا مملو — یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹّی میں گل رہا ہے
سمجھ ہو جس کی بلیغ سمجھے نظر ہو جس کی وسیع دیکھے — کبھی یہاں خاک بھی اُڑے گی جہاں یہ قلزم اُبل رہا ہے
کہاں کے شرقی کہاں کے غربی تمام دکھ سکھ ہے یہ مساوی — یہاں بھی اک بامراد خوش ہے وہاں بھی اک غم سے جل رہا ہے
ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے — اگر زمانہ بدل رہا ہے بدلنے ہی کو بدل رہا ہے
جنھوں نے طاعت میں جان دی ہے انھیں کے حصّے میں زندگی ہے — مقدّموں کی ہوں لاکھ شکلیں یہی نتیجہ نکل رہا ہے

خدا سے تم دل ملاؤ اپنا زبان کو پھر ملاؤ دل سے
تو دیکھ لوگے کہ پُر اثر ہے زبان سے جو نکل رہا ہے

حالتِ قوم (اکبر الہ آبادی)

مسلمانو بتاؤ تو تمھیں اپنی خبر کچھ ہے
تمھارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے
حریفوں کی تعلّی باعثِ سوزِ جگر کچھ ہے
تمھیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آ نکلے ہو راہِ ترقّی سے جدا ہو کر

کوئی آگے نہ تھا تم سے ترقّی کی تگ و دو میں
کوئی دس میں چمکتا تھا تو تم ممتاز تھے سو میں
تمھیں نے فرق بتلایا تھا سب کو گندم و جو میں
تمھیں سے سیکھ کر بنتی تھیں عالم غربی قومیں
شرف پایا تھا تم نے امتیازِ حق و باطل سے
مخالف بھی تمھاری قدردانی کرتے تھے دل سے

تمھاری عزتیں تھیں اوج تھا رتبہ تھا شانیں تھیں
تمھاری بات تھی احکام تھے کہنا تھا آنیں تھیں
تمھارے ذکر میں سرگرم دنیا کی زبانیں تھیں
تمھیں تم تھے زمانے میں تمھاری داستانیں تھیں
غرور و ناز کم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو
سرِ تسلیم خم کرنا پڑا تھا ایک عالم کو

تمھارا التفاتِ باہمی دیوارِ آہن تھا
مخالف ایک کا جو تھا وہ گویا سب کا دشمن تھا
تمھاری ہمّتوں کا عرشِ اعظم پر نشیمن تھا
تمھارے ہاتھ میں آفاق کا ہر علم ہر فن تھا

تم اپنی حق پرستی سے دبا لیتے تھے دنیا کو
خدا کے سامنے جھک کر جھکا دیتے تھے اعدا کو

نہ یہ آپس کے جھگڑے تھے نہ یہ ناحق پرستی تھی — طبیعت پر نہ دیوِ نفس کی یہ چیرہ دستی تھی
نہ دل میں بدگمانی تھی نہ ہمّت میں یہ پستی تھی — نظر میں مظہرِ نورِ حقیقت ساری ہستی تھی

تمھاری وضع دل کش تھی تمھاری شان عالی تھی
خوش اخلاقی تمھاری مظہرِ شانِ جمالی تھی

نہیں ہے ہائے افسوس اب تمھارا وہ چلن باقی — نہ وہ حسنِ عمل باقی نہ اب وہ حسنِ ظن باقی
نہ وہ ذوقِ ہنر مندی نہ شوقِ علم و فن باقی — نہ دل میں ہے وہ جوشِ حُبِّ یارانِ وطن باقی

جو فکریں ہیں تو اپنے نفس کو راحت رسانی کی
تو قطع کیا اسی پر ہے خدا کی مہربانی کی

غضب ہے حُبِّ اسلامی سے خالی سب کا سینا ہے — حسد ہے ناتواں بینی ہے بے مہری ہے کینا ہے
بس اپنے ہی مزے کے واسطے ہر اک کا جینا ہے — یہی قومی ترقی کا ذرا سوچو تو زینا ہے

کہاں ہے اب مسلمانوں میں باہم بے غرض الفت
جو باقی شاعروں میں ہے تو ہے وہ اک مرض الفت

میں تم سے کیا کہوں اس وقت دل پر کیا گزرتی ہے — تصوّر دل میں آتا ہے تو آنکھ اشکوں سے بھرتی ہے
طبیعت بات کرنے کو بھی مشکل سے ٹھہرتی ہے — خلش سینے میں ایسی ہے کہ وہ بے چین کرتی ہے

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو — اُٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو

بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بر سیکھو

خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

سخن معقول و موزوں ہو تو سب کا دل بہلتا ہے
کلامِ خوش کلاماں رنگِ با معنی بدلتا ہے

زباں سے نعرۂ مدح و ثنا ہر دم نکلتا ہے
مگر شوقِ عمل ہو واقعی تب کام چلتا ہے

توجہ گر نہ ہو دل سے تو پھر تاثیر کیونکر ہو
کلامِ دل کش اکبرؔ ہو یا مہدی کا لکچر ہو

قطعہ (اکبر الہ آبادی)

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبرؔ
تو صاف کہتے ہیں سیّد یہ رنگ ہے میلا

جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا

جو اعتدال کی کہیئے تو وہ اِدھر نہ اُدھر
زیادہ حد سے دئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا

اِدھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا

اِدھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت ناپاک
اُدھر ہے وحیٔ ولایت کی ڈاک کا تھیلا

غرض دوگونہ عذابست جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

مشورہ (اکبر الہ آبادی)

پیر و مرشد نے کیا قوم میں بچپن پیدا
وہ یہ سمجھے تھے کہ ہو جائے گا جوبن پیدا

وہ تو پیدا نہ ہوا ہاتھ سے لڑکوں کے مگر / ہو چلے دین کی دیوار میں روزن پیدا
پستیٔ قوم کے جب آ گئے دن اے اکبر / اونچے درجوں میں ہوئے عقل کے دشمن پیدا
دین کیا چیز ہے شیرازۂ قومی ہے فقط / جس سے ملت کی ہے اک صورتِ احسن پیدا
آج ہوتا نہیں اس کا ضرر اُن کو محسوس / ہو رہے ہیں ابھی کچھ لالہ و سوسن پیدا
بالیقیں آئے گا اس باغ میں ایسا اک وقت / کہ چلیں گی روشیں نشتر و سوزن پیدا
صورتِ برگِ خزاں دیدہ بکھریں گے اُڑتے / نہ بہار آئے گی پھر ہو گا نہ گلشن پیدا
باپ کے خون سے ہوگی جو جمعیت زائل / ہوں گے اطفال بھی بے غیرت و کودن پیدا
کاہ کی طرح سے اُڑ جائیں گے دینی اعمال / اختلافات کے ہو جائیں گے خرمن پیدا
ظلمتِ جہل سے گھر جائیں گے دل کے اطراف / سینوں میں ہو نہ سکیں گے دلِ روشن پیدا
کون کہتا ہے تکلف سے نہ کر زیست بسر / کون کہتا ہے کہ نہ کر وضع میں جوبن پیدا
کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ / کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول / راہِ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا
قوم قوم آٹھ پہر سنتے ہیں ہم قوم کہاں / تار باقی نہیں تو کرتا ہے دامن پیدا
مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی / یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

بزمِ تہذیب سے ہو جائیں گے قطعاً خارج
حس ہی باقی نہ رہے گا کہ ہو شیون پیدا

آمدِ بہار (اکبر الہ آبادی)

بہار آئی کھِلے گُل زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر / عنادل نے مچائی دھوم سرگرمِ فغاں ہو کر

بچھا فرشِ زمرّد اہتمامِ سبزۂ تر میں — چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہو کر
عروجِ نشۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں — ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہو کر
بلائیں شاخِ گل کی لیں نسیمِ صبحگاہی نے — ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگینِ بتاں ہو کر
جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا — کسی نے یاسمن ہو کر کسی نے ارغواں ہو کر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں — صدائے نغمۂ بلبل اُٹھی بانگِ اذاں ہو کر
ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو — ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتّی زباں ہو کر
زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں — خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے میں
کہیں چھپتا ہے اکبرؔ پھول پتّوں میں نہاں ہو کر

خوابِ غفلت (اکبر الہ آبادی)

بنائے ملّت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا اُبھر رہے ہیں
اِدھر ہے قومِ ضعیف و مسکیں اُدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
کٹی رگِ اتحادِ ملّت رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آبِ صافی نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں
صدائے الحاد اُٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اُٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اُٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گزر رہے ہیں

قفس ہے کم ہمتی کا سیمیں پڑے ہیں کچھ دانہائے شیریں
اُسی پہ مائل ہے طبعِ شاہیں نہ بال ہیں اب نہ پر رہے ہیں
اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے وہاں بھی پھیلی یہی بلا ہے
خیالِ میٹر کا بڑھ چلا ہے خدا کا انکار کر رہے ہیں
مگر وہاں کی بنا ہے نیشن رُکا ہے ملحد کا آپریشن
نہیں ہے گم لفظ سالویشن خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے نماز گپ ہے وہاں وہی عزتِ "بشپ" ہے
یہاں مساجد اُجڑ رہی ہیں وہاں کلیسا سنور رہے ہیں
جنابِ اکبرؔ سے کوئی کہدے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

قولِ درست (اکبر الٰہ آبادی)

کہا کسی نے یہ سیّد سے آپ اے حضرت
نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں
نہ آپ عالمِ برزخ سے مانگتے ہیں مدد
نہ فاتحے کے طریقِ ادا کو مانتے ہیں
نظر تو کیجئے اس بات پر جو ہیں ہندو
بہ صدق خلوص ہر اک دیوتا کو مانتے ہیں
بہت وہ ہیں جو عناصر پرست ہیں دل سے
وہ آگ پوجتے ہیں یا ہوا کو مانتے ہیں
کرسچین بھی فدائی ہیں نامِ مریم کے
بہ دل مسیح علیہ الثنا کو مانتے ہیں
خود آپ ہی ہیں جو ہیں شیعیانِ با تمکیں
وہ اہلِ بیت کو آلِ عبا کو مانتے ہیں
وہ لوگ جو ہیں ملقّب بہ صوفیانِ کرام
فدا قبور پہ ہیں اولیا کو مانتے ہیں

مرادیں مانگتے ہیں لوگ پاک روحوں سے — کسی بزرگ کو یا مقتدا کو مانتے ہیں
پھر آپ میں یہ ہوا کیا سما گئی ہے کہ آپ — نہ دست گیر نہ مشکل کشا کو مانتے ہیں
جواب انھوں نے دیا ہم ہیں پیروِ قرآں — ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں
سند ہماری ہے ایّاک نستعین اے دوست — اُسی یگانۂ حاجت روا کو مانتے ہیں
اُسی کا نام زباں پر ہے حیّ اور قیّوم — اُسی کی قدرتِ بے انتہا کو مانتے ہیں
یہ بوئے شرک ہی ہے جنگ و اختلاف کی جڑ — تو عقل مند کب ایسی بلا کو مانتے ہیں
جواب حضرتِ سیّد کا خوب ہے اکبرؔ — ہم اُن کے قولِ درست و بجا کو مانتے ہیں
ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر — خدا کو اور نہ طریقِ دعا کو مانتے ہیں
زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں — وہ صرف قوّتِ فرماں روا کو مانتے ہیں

لطیفہ (اکبر الہ آبادی)

ایک بوڑھا نحیف و خستہ و زار — اک ضرورت سے جاتا تھا بازار
ضعفِ پیری سے خم ہوئی تھی کمر — راہ بے چارہ چلتا تھا جھک کر
چند لڑکوں کو اُس پہ آئی ہنسی — قد پہ پھبتی کمان کی سوجھی
کہا اک لڑکے نے یہ اس سے کہ بول — تو نے کتنے کو لی کمان یہ مول
پیر مردِ لطیف و دانش مند — ہنس کے کہنے لگا کہ اے فرزند

پہنچو گے میری عمر کو جس آن
مفت مل جائے گی تمھیں یہ کمان

یادِ دہی (امجد حیدر آبادی)

موزوں نہیں گر نغمہ تو فریاد سہی
کچھ بھول گیا ہوں میں یہی یاد سہی

جب زینتِ دنیا سے مرا گھر بھر جائے
جب حرص ہوا کی مے سے ساغر بھر جائے
احباب بھی ہوں، لطف کا ساماں بھی ہو
جب عطر بھی ہو، ڈلی بھی ہو، پان بھی ہو
دلچسپ فضا ہو، چاندنی رات بھی ہو
اک ماہ جبیں کے ہاتھ میں ہات بھی ہو
جب ناچ بھی ہو، راگ بھی ہو، رنگ بھی ہو
روئی بھی ہو، چقماق بھی ہو، سنگ بھی ہو
جب اُڑتے ہوں قہقہے ہر اک تال کے ساتھ
جب طبلے پر پڑ رہے ہوں قوّال کے ہاتھ
جب ہر دلِ مردہ شادماں ہو جائے
جب گھر مرا گشتِ زعفراں ہو جائے
جب مجکو جہان کے خزانے مل جائیں
سارے عالم کے کارخانے مل جائیں
جب ہو یہ خیال "خاک پر کون چلے"
ہو سونے کی اینٹ ہی میرے پاؤں تلے
قدموں کے نشان نقشِ تسخیر بنے
لوں خاک بھی ہاتھ میں تو اکسیر بنے
جب پھولوں کی سیج پہ مجھے نیند آئے
جب میرا دماغ عرشِ اعلیٰ بن جائے

کر دے اس وقت باخبر اے مولا
بس یاد دلا دے اس قدر اے مولا
بس اتنے ہی نشہ میں یہاں چور ہے تو
اصلی آرام سے ابھی دور ہے تو
جب ٹوٹ پڑے پہاڑ غم کا سر پر
باقی رہے جب نہ زور زور و زر پر
اس وقت کہ رہنما بھی رہزن بن جائے
اس وقت کہ خاص دوست دشمن بن جائے
تنکے کا غریق کو سہارا نہ ملے
ظلمت کدۂ دہر میں تارا نہ ملے
اعصاب، حصارِ کرب میں گھر جائیں
اس وقت کہ غم سے پتلیاں پھر جائیں

جب جل اُٹھے غم سے تن کا ذرّہ ذرّہ
قُل نارُ جہنّم اَشَدُّ حَرّاً

حملِ امانت (امجد حیدرآبادی)

تو ہے مجھے بزم میں بلانے والا
میں ہوں تری بارگہ میں آنے والا

ظالم ہوں جہول ہوں سیہ کار ہوں میں
کس منہ سے کہوں تیرا طلب گار ہوں میں

میں کیا ہوں جبال و آسماں کے آگے
کیا گرد کا ذکر کارواں کے آگے

ہوں بحرِ عظیم میں مثالِ خاشاک
اک قطرہ ہے میری ہستی وہ بھی ناپاک

اے لو وہ عرضنا کی صدا گونج اُٹھی
اِنّا کے جلال سے فضا گونج اُٹھی

سب ہٹ گئے ڈر کے پیچھے آنے والے
کترا گئے صاف سر اُٹھانے والے

سب لرزہ براندام نظر آتے ہیں
کہتے ہوئے سارے الحذر آتے ہیں

جو سر بفلک تھے اُن کا اُترا چہرا
دیکھیں رہتا ہے کس کے سر پہ سہرا

سب صاحبِ عقل و ہوش بے ہوش ہیں آج
سب بولنے والے کیسے خاموش ہیں آج

اُٹھی نہیں جب کہیں سے کوئی آواز
جب کوئی ہوا نہ اس صدا کا دمساز

میری غیرت میں ایک طوفان اُٹھا
یعنی لبیک کہہ کے انسان اُٹھا

لینے کو عطیہ دستِ محتاج اُٹھا
فی احسنِ تقویم کا حُسن آج بڑھا

سر دیدیا میں نے آبرو کی خاطر
ٹھکرا دیا میں نے میں کو تو کی خاطر

مبہوت ہے خلق سُن کے قصّہ میرا
ہے عبدیّتِ تمام حصّہ میرا

فلسفۂ حیات و ممات (پنڈت اندرجیت شرما)

سفر میں زیست کے آئی ہے شام غربت کی
پیام موت کا لائی ہے شام غربت کی

بھلائے بیٹھا ہے دل نام بھی جوانی کا
اُتر کے رہ گیا دریا سے جوش پانی کا

بدل دیا ہے خزاں نے بہار کا نقشہ
بنا دیا ہے چمن کو مزار کا نقشہ

کنول سا دھوپ سے کمھلا کے رہ گیا چہرا
جہاں کے باغ میں جو صبح کو شگفتہ تھا

ہوا چلی ہے یہ کیا زندگی کے گلشن میں
لگاتی آگ ہی آئی کسی کے خرمن میں

سفر سے دن کے ہوئیں چور ہڈیاں ساری
ہوئی ہیں شام کو بے نور آنکھیں دکھیاری

اندھیری رات کا ہے سامنے وہ نظارہ
کہ جس کو دیکھ کے شیروں کے دل میں ہو دہڑکا

کہیں بھی روح کو تسکیں نظر نہیں آتی
مصیبتوں کی کہانی کہی نہیں جاتی

نظر کے سامنے نقشہ کھچا قیامت کا
پہاڑ چرخ نے توڑا ہے کیا قیامت کا

کہاں سے لائی ہے تقدیر اُٹھا کے بے بس کو
دیا ہے دھوکا کہاں لا کے ہائے بیکس کو

اماں کا دہر میں رستہ کہیں نہیں ملتا
کسی طرح بھی یہ دل کا کنول نہیں کھلتا

ہوا ہے کیسی مصیبت کا سامنا افسوس
کہ جس کا ہو نہیں سکتا مقابلہ افسوس

ہوا کے تند ہیں جھونکے گھٹا ہے غم کی سیاہ
چڑھی ہی آتی ہے سر پر مصیبتوں کی سیاہ

ضعیف کھا کے گرا یوں زمیں پر ٹھوکر
کہ تن بدن کی رہی کچھ نہ بے نوا کو خبر

اجل کی نیند نے غافل بنا دیا اُس کو
تھپک تھپک کے زمیں پر سلا دیا اُس کو

مصیبتوں سے زمانے کی دل ہوا آزاد
رہا نہ غم ہی تو غم کی ہو کس لئے فریاد

اُٹھے گا صبح کو پھر ہو کے تازہ دم بیکس
جہاں کا پائے گا دل میں نہ کوئی غم بیکس

حیات نام ہے دنیا میں دن کے نقشے کا
ممات راز ہے پوشیدہ شب کے پردے کا

تارے (بے نظیر شاہ)

کہاں ہے تو اے ساقیِ بزم زیب
کہ تاروں بھری رات ہے دل فریب

کواکب یہ افلاک پھولے ہوئے
کنول حوضِ گردوں میں پھولے ہوئے

سمندر میں بہتے ہوئے یہ چراغ
بنے صحنِ گردوں میں تاروں کا باغ

نہیں چاند کا گو فلک پر نزول
کھلے ہیں گلِ چاندنی کے یہ پھول

مسہری سجی قدرتِ پاک کی
بسی سیج پھولوں سے افلاک کی

قنادیلِ روشن عجائب نگار
مصابیحِ آیاتِ پروردگار

ستاروں کا یہ عکس تالاب میں
کہ لہراتی ہیں بجلیاں آب میں

تناسب سے قدرت نے چھوٹے بڑے
زبرجد کے گنبد میں ہیرے جڑے

یہ خورشید تاباں کے آنکے ہوئے
گہر چتر گردوں میں ٹانکے ہوئے

غضب جگمگاتی ہوئی فردیاں
بنا کامدانی کا تھا آسماں

بھری بوٹیوں سے ردائے فلک
بنی ہیل خود کہکشاں کی سڑک

شبِ تار کی شال تانے ہوئے
جہاں نیند کی دل میں ٹھانے ہوئے

مگر چشمِ انجم جھپکتی نہیں
ستاروں کی بوندیں ٹپکتی نہیں

کچھ ایسا ہی خوف شبِ تار ہے
کہ ہر نجم اک چشمِ بیدار ہے

کھلے کوڑیالے سرِ کوہسار
کہ شبنم سے بھیگا ہوا سبزہ زار

جو سیارے رہتے ہیں ان میں رواں — وہ ہیں اُن کی ترتیب کے پاسباں
جو ثابت ہیں محور بدلتے نہیں — کہ گرد اپنے پھرتے ہیں چلتے نہیں
مرتّب جو یہ شکل تنجیم ہے — مہ و سال کی اس میں تقسیم ہے
ہُوا بوجھ سب کا سنبھالے ہوئے — فضا میں کُروں کو اُچھالے ہوئے
بہم ان میں جو ربطِ جذبات ہے — علیٰ قدرِ جسم مسافات ہے
کشش ان میں ہے اور تاثیر بھی — جداگانہ تکثیف و تنویر بھی
کچھ آباد کچھ ان میں خالی بھی ہیں — جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی ہیں
وسیع اس قدر ہے فضائے جہاں — ہیں ذرّوں سے کم یہ کُرے بیگماں
تپش دن کو خورشید تاباں کی تھی — خبر کس کو اس بزمِ شاہاں کی تھی

فضا آبِ انجم سے دھوئی ہوئی
شبِ ماہ حیرت میں کھوئی ہوئی

برسات کا سماں (بے نظیر شاہ)

جو سوکھی زمیں پر ترشّح ہوا — نکلتی ہے بو سوندھی سوندھی سی کیا
گرجتے ہیں بادل چمکتی ہے برق — ہُوا صحن کا صحن پانی میں غرق
گئی نیند اُچٹ پانی کے شور سے — بہی جاتی ہیں نالیاں زور سے
ٹپکتی ہے بنگلے کی وہ اولتی — کہ ہے تارِ سیمیں کی چلمن پڑی
ہوا زور سے چلتی ہے بار بار — پہنچتی ہے کمروں کے اندر پھوار
بنا ہے جو وہ ٹین کا سائبان — ہے اس وقت ارگن کا اس پر گماں

عجب بے سے پانی برستا ہے آج — کہ زاہد بھی مے کو ترستا ہے آج
چٹانوں پہ کیا لطفِ نظارہ ہے — کہ جو بوند ہے ایک فوارہ ہے
صبا کے تماچے جو کھاتے ہیں آج — تو پودے سروں کو جھکاتے ہیں آج
چلی آتی ہے بدلیوں کی قطار — ہوا کے ہیں گھوڑے پہ بادل سوار
دھواں دھار اس وقت چھایا ہے ابر — فلک پر سیہ مست آیا ہے ابر
اُٹھی شاخِ گل سبزے کو چوم کر — برستی ہے کیا کیا گھٹا جھوم کر
ہیں آراستہ سبز پوشانِ باغ — ہوا غسل سے ہر شجر کو فراغ

یکایک رُکی بوند ٹھہری ہوا
نظر آتی ہے اور کچھ ہی فضا

طلوعِ آفتاب (بے نظیر شاہ)

ہے کچھ دھوپ کا عکس کہسار پر — شعاعیں چمکتی ہیں اشجار پر
تری اوس کی دھوپ کھونے لگی — ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی
پرندے زمیں پر اُترنے لگے — ہرن کھُل کے جنگل میں چرنے لگے
اُڑے کھول کر قاز و سرخاب پر — گرے مرغ آبی وہ تالاب پر
وہ کھیتوں میں چڑیاں بھی آنے لگیں — وہ چُن چُن کے دانے اُٹھانے لگیں
ہُوا پھر وہی کاروبارِ جہاں — ہوئے لوگ مصروفِ کارِ جہاں
ہوا میں ابھی تک نہیں کچھ غبار — رطوبت لگی اُڑنے بن کر بخار
مگر شہر میں یہ نہیں آب و تاب — کہ ٹیلوں کی ہے اوٹ میں آفتاب

بلندی پہ کچھ دھوپ آنے لگی | وہ کلسوں پہ سونا چڑھانے لگی
منڈیروں پہ کچھ کچھ جھلکنے لگی
اُتر کر وہ در پر چمکنے لگی

ریل اور پہاڑ کا سفر (بے نظیر شاہ)

عجب شان سے آج جاتی ہے ریل | کہ صرصر کو پیچھے ہٹاتی ہے ریل
مسرت میں سیٹی بجاتی ہے ریل | دھوئیں دشتِ غم کے اُڑاتی ہے ریل
اندھیرا پہاڑوں کے اندر کہیں | چڑھائی کہیں اور چکر کہیں
وہ ٹھنڈی ہوا اور بادل کی سیر | وہ سرسبز وادی وہ جنگل کی سیر
قدم سست و آہستہ دھرنا کہیں | پہاڑوں پر چڑھ کر اُترنا کہیں
مقام ایسے دو چار پائے گئے | جہاں دو دو انجن لگائے گئے
کہیں کوئی دریا کہیں کوئی جھیل | کہیں سلسلے کوہ کے مستطیل
کہیں سیکڑوں فٹ وہ سڑکیں بلند | نہ تا فرطِ پستی سے پہنچے گزند
برنگِ خطوطِ رمل کوہسار | کہیں چشمے جاری کہیں مرغزار
بنے ہیں جو قلعے سرِ کوہسار | ہیں کیا جانے کس عہد کے یادگار
پہاڑوں کے اندر ہے رستہ جہاں | وہاں دن کو روشن ہوئیں بتیاں
اسی طرح چڑھتی اُترتی ہوئی | چلی مرحلے قطع کرتی ہوئی
جو رستے میں تھے چھوٹے چھوٹے مقام | کسی جا نہ اُس نے کیا کچھ قیام
جو سنگل نظر آ گیا ایک بار | لگی سیٹیاں دینے بے اختیار

غرض اب وہ اسٹیشن آیا نظر
کہ تھا جس کی خاطر یہ سارا سفر

آندھی (بے نظیر شاہ)

درختوں پہ سنّاٹا پیدا ہوا — غبار ایک جانب ہویدا ہوا
ہوا میں بڑھا حبس شورش بڑھی — یکایک مگر کوئی ندی چڑھی
کہ اتنے میں جھونکے بھی آنے لگے — درختوں کی گردن جھکانے لگے
گیا صحن محشر کا نقشہ وہ بن — گرے دور جاجا کے نخلِ کہن
غضب کی قیامت کی آندھی چلی — کہ رفتار سے رک گئی ریل بھی
زمین و فلک سب پہ چھایا غبار — کہ یہ وقت ہے رشکِ شبہائے تار
یکایک جو کڑکا ہوا برق کا — تو دی رعد نے بھی گرج کی صدا
بڑے زور سے مینہ برسنے لگا — کسی کے لئے جی ترسنے لگا
وہ سیلاب صحرا وہ ٹھنڈی ہوا — اِدھر اور اُدھر خوب پانی بھرا

اُسے فضل میں دیر لگتی نہیں
نہ ہو اُس سے مایوس کوئی حزیں

نمودِ صبح (بے نظیر شاہ)

نجومِ فلک جھلملانے لگے — چراغِ سحر ٹمٹمانے لگے
وہ ٹھنڈی ہوا اور تاروں کی چھاں — نزولِ ضیا کا وہ پیارا سماں

وہ شہنا میں سوہنی کی دُھن دل فریب　　شہانے سے وہ شادیانے کی زیب
کھنچے کس لئے دل نہ ہر تان پر　　کہ ہے کر رہی ہے اثر جان پر
سریلی صدا ہوش کھونے لگی　　ستاروں کو وحشت سی ہونے لگی
وہ بوٹوں میں کلیاں چٹکنے لگیں　　وہ شاخوں پہ چڑیاں چہکنے لگیں
وہ شبنم نے چھڑکا چمن پر گلاب　　نہ رہ جائے تا کوئی سرگرم خواب
نسیم سحر گل کھلانے لگی　　فضائے چمن رنگ لانے لگی
ضیا آسماں سے اُترنے لگی　　نظر دور تک کام کرنے لگی
عنادل گلستاں میں گانے لگے　　طیورِ سحر دل لبھانے لگے
وہ اللہ اکبر کی آئی صدا　　نہا دھو کے مسجد چلے پارسا
ہوئی آسماں پر وہ سرخی نمود　　بنا کانِ شنجرف چرخ کبود
شعاعیں دکھانے لگیں وہ جھلک　　ہوئی زعفرانی بساطِ فلک
شفق میں بسنتی کرن خوش نما　　گلے مل رہی ہے بہار و خزاں
مُطلّا ہوا گنبد ہر شجر
برسنے لگا ہر طرف آبِ زر

چاندنی کی بہار (بے نظیر شاہ)

ہے اس ناز سے چاندنی جلوہ گر　　کہ سکتے کے عالم میں ہے ہر شجر
تجلی سے وادی یہ معمور ہے　　کہ موج ہوا موجۂ نور ہے
وہ پھول اُجلے اُجلے جو ہیں سامنے　　کٹوری سی چاندی کی سر پہ لیے

دکھاتے ہیں اس وقت کیسی بہار — کہ ہوں ٹوٹ کر جن پہ تارے نثار
چمک ریگ پر صحنِ بلّور کی — بچھائے ہوئے چاندنی نور کی
یہ عالم جو دیکھا تو شکلِ کتاں — ہوا پارہ پارہ دلِ عاشقاں
جو بھیگی ہوئی آبِ رحمت سے رات — کہ تر دامنوں کو ہو جس سے نجات
وہ شبنم کی خنکی وہ ٹھنڈی ہوا — وہ اشجار و آبِ رواں کی صفا
وہ شاخوں کا جھکنا لچک کر کہیں — وہ لہروں کا اٹھنا چمک کر کہیں
وہ میدان میں چاندنی کا سماں — وہ شبنم کا گرد اس کے کچھ کچھ دھواں
نجوم و قمر کا وہ عکس آب میں — وہ پانی میں جلتی ہوئی مشعلیں

وہ ہر سمت چھایا ہوا نورِ بدر
وہ شب لیلۃ القدر کو جس کی قدر

پیغامِ بیداری (مولوی برکت علی)

اُٹھ بیٹھ مسافر جاگ ذرا یہ وقت نہیں ہے سونے کا — ہر تارِ نفس ہے بانگِ درا یہ وقت نہیں ہے سونے کا
لو نورِ سحر بیدار ہوا یہ وقت نہیں ہے سونے کا — ہر ذرّہ جہاں کا جاگ اُٹھا یہ وقت نہیں ہے سونے کا

اے نیند کے ماتے ہوش میں آ یہ وقت نہیں ہے سونے کا

کیا پھونکا جانے ساقی نے مستانہ گھٹائیں جاگ اُٹھیں — خمخانہ بدوش اب ابر اُٹھا مدہوش ہوائیں جاگ اُٹھیں
پُرکیف بھیگے چھینٹے رحمت کے مخمور فضائیں جاگ اُٹھیں — یہ نور سرور کا عالم ہے فطرت کی ادائیں جاگ اُٹھیں

اے نیند کے ماتے ہوش میں آ یہ وقت نہیں ہے سونے کا

اُٹھ دیکھ فلک کی محفل میں سب چاند ستارے جاگ اُٹھے — کیا کیا پیارا پیارا منظر ہے مسرور نظارے جاگ اُٹھے

موجوں کی جھپیٹے دینے سے دریا کے کنارے جاگ اُٹھے ۔۔۔ یہ عالم ہے بیداری کا قدرت کے اشارے جاگ اُٹھے
اے نیند کے ماتے ہوش میں آ یہ وقت نہیں ہے سونے کا

دریا کی روانی بن کے دکھا تو ساحل کا محتاج نہ ہو ۔۔۔ رہ پا بہ سفر ہر شام و سحر اور منزل کا محتاج نہ ہو
جل سوزِ جگر کی آگ میں شمعِ محفل کا محتاج نہ ہو ۔۔۔ کر پیدا شورِ انگیز جنوں جو محمل کا محتاج نہ ہو
اے نیند کے ماتے ہوش میں آ یہ وقت نہیں ہے سونے کا

ہمہ اوست (برق دہلوی)

وہی شعلۂ سرِ طور ہے، وہی برقِ حسنِ نگار ہے
وہی ایک جلوۂ یار ہے وہی نور ہے وہی نار ہے
وہی جلوہ ریز حرم میں ہے وہی نورِ بیتِ صنم میں ہے
وہی تم میں ہے، وہی ہم میں ہے وہی سب کا دار و مدار ہے
وہی رند جام بہ دست ہے وہی مستِ روزِ الست ہے
وہی کیفِ بادۂ ہست ہے وہی اس نشے کا خمار ہے
وہی ضَو فروشِ حیات ہے وہی عکس ریزِ صفات ہے
وہی نورِ جلوۂ ذات ہے وہی ایک بر سرِ کار ہے
وہی جلوہ ہے وہی جلوہ گر وہی خود نما وہی خود نگر
وہی حُسن ناز فروش ہے، وہی رخ پہ اپنے نثار ہے
وہی حسن ہے وہی عشق ہے وہی ہے صفا وہی صدق ہے
وہی تاب بخشِ جمالِ گُل، وہی روحِ صوتِ ہزار ہے

وہی ہے فنا وہی ہے بقا، وہی ابتدا، وہی انتہا
وہی جزو میں ہے وہی کل میں ہے وہی اصل و آخرِ کار ہے
وہی مہر ہے وہی ماہ ہے وہی برقِ چشمِ سیاہ ہے
وہی تابِ شعلۂ آہ ہے وہی حسنِ روئے شرار ہے

غریبوں کی فریاد (برق دہلوی)

آوارۂ جہاں ہیں، بربادِ خانماں ہیں — بیزارِ زندگی ہیں قسمت کے نوحہ خواں ہیں
ہم سر سے پاؤں تک ہیں اک نقشِ نامرادی — تصویرِ بےکسی ہیں رودادِ بےکساں ہیں
ہے یاس کا مرقع حالِ زبوں ہمارا — ہم نالۂ مجسم سر تا بہ پا فغاں ہیں
بسمل ہیں تیغِ غم سے، دل خستہ ہیں الم سے — نخچیرِ زخم خوردہ، صیدِ شکستہ جاں ہیں
ہر دل پہ بار ہیں ہم نظروں میں خار ہیں ہم — افتادۂ زمیں ہیں مردودِ آسماں ہیں
خانہ بدوش ہیں ہم حسرت فروش ہیں ہم — گم کردہ راہ بر ہیں گم گشتہ کارواں ہیں
غم سے شکستہ دل ہیں صدموں سے مضمحل ہیں — نالوں سے جاں بہ لب ہیں فاقوں سے نیم جاں ہیں
دنیا میں کس میرسی ہے میزبان اپنی — بزمِ جہاں میں گویا ناخواندہ مہماں ہیں
نظروں سے گر چکے ہیں مانندِ اشکِ حسرت — کون آنکھ اٹھا کے دیکھے ہر سو رواں دواں ہیں
کانوں پہ ہاتھ رکھ کر سنتا ہے جس کو عالم — وہ درد کا بیاں ہیں وہ غم کی داستاں ہیں
دامن کشاں ہیں ہم سے بیگانے اور یگانے — بےکس ہیں ناتواں ہیں محتاجِ آب و ناں ہیں
پرسانِ حال کوئی اپنا نہیں جہاں میں — ہیں وقفِ کس میرسی وہ جنسِ رائیگاں ہیں
غربت نصیب ہیں ہم خود اپنے ہی وطن میں — جل جائیں شاخ پر جو وہ پھول ہیں چمن میں

پھولوں میں تلنے والے سن لیں ہمارے نالے   ہاتھوں سے لیکن اپنے دل کو رہیں سنبھالے
فریاد غم زدوں کی دل توڑ کر رہے گی   دیکھیں ہماری حالت احساس رکھنے والے
کوئی سنے تو غم کی ہم داستاں سنائیں   دل چیر کر دکھائیں اب تک ہیں زخم آلے
سردی کی رات کاٹیں ہم آہ سرد بھر کر   سوتے رہیں سحر تک وہ اوڑھ کر دوشالے
فاقوں سے دن گزاریں ہم نیم جاں تڑپ کر   تن پروری کریں وہ کھا کھا کے تر نوالے
تن ڈھانکنے کو ہم کو کپڑا نہ ہو میسّر   پوشاک کے ہوں اُن کی فیشن نئے نرالے
غم سے کیا کریں ہم رو رو کے لال آنکھیں   اُن کے مئے طرب سے لبریز ہوں پیالے
پہنچے کوئی تو یارب فریاد کو ہماری   بھر آئے دل کسی کا سن کر ہمارے نالے
کوئی تو ہم کو اپنی آغوش میں جگہ دے   کوئی تو اپنا سایہ ہم بے کسوں پہ ڈالے
در در کی ٹھوکریں ہم کھایا کریں گے کب تک   کب تک پڑے رہیں گے ہم بے کسی کے پالے
آوارہ کو بہ کو ہیں ریگِ رواں کی صورت   مٹّی میں مل رہے ہیں معصوم بھولے بھالے
کوئی ثواب لے لے دل خستگانِ غم کا   امداد کا ہماری بیڑا کوئی اُٹھا لے

فریاد یہ ہماری جو آج کان دے گا
معصوم بے کسوں کی لاکھوں دعائیں لے گا

چند سوال (برق دہلوی)

عقلِ دقیقہ رس سے تھا کل شب میں ہم کلام   پر تو فگن ہوئے مرے دل میں خیال چند
میں نے کہا یہ عقل سے اے مایۂ علوم   بتلا کہ پوچھتا ہوں میں تجھ سے سوال چند
ہے یہ طلسمِ ہستیِ موہوم کیا بلا   اُس نے کہا یہ خواب ہے یا ہیں خیال چند

میں نے کہا کہ حاصلِ ہستی ہے چیز کیا ۔۔۔ اُس نے کہا کہ دردِ سری اور وبالِ چند
میں نے کہا کہ زیرِ نگیں کس طرح ہو نفس ۔۔۔ اُس نے کہا ملیں جو اسے گوشمالِ چند
میں نے کہا کہ اہلِ ستم کون لوگ ہیں ۔۔۔ اُس نے کہا یہی سگ و گرگ و شغالِ چند
میں نے کہا کہ بحثِ خلائق ہے چیز کیا ۔۔۔ اُس نے کہا کہ بے سر و پا قیل و قالِ چند
میں نے کہا کمال ہے اہلِ جہاں کا کیا ۔۔۔ اُس نے کہا کہ جمع کریں گنج و مالِ چند

میں نے کہا سنا مجھے خیّام کا کلام
اُس نے کہا کہ پند ہیں یہ حسبِ حال چند

اچھوتوں سے نفرت (برق دہلوی)

سب کے لئے ہے یکساں قدرت کا فیض جاری ۔۔۔ مُفلس ہو یا تونگر راجہ ہو یا بھکاری
ٹوٹی سی جھونپڑی ہو یا قصرِ کامگاری ۔۔۔ دونوں پہ مہرِ انور کرتا ہے جلوہ باری

ہیں خاک بوس کرنیں مہتابِ ضوفشاں کی
ہر گھر میں روشنی ہے قندیلِ آسماں کی

سیراب سب کو یکسر کرتا ہے آبِ باراں ۔۔۔ تختہ ہو زعفراں کا یا کشتِ خشکِ دہقاں
جوشِ بہار کا ہے یکساں اثر نمایاں ۔۔۔ ہو گلبنِ گلستاں یا لالۂ بیاباں

تاثیرِ فصل سے ہے سود و زیاں برابر
ہیں نخلِ دشت و گلشن وقتِ خزاں برابر

عصیاں شعار ہے یا کوئی مہاتما ہے ۔۔۔ خاکی لباس دونوں کو ایک سا ملا ہے
شاہنشہِ جہاں ہے یا کوئی بے نوا ہے ۔۔۔ جس کو بقا ملی ہے آخر اُسے فنا ہے

فطرت کا سب پہ حاوی قانون ایک ہی ہے
عنوان گو جدا ہیں مضمون ایک ہی ہے

پست و بلند کا ہے پھر امتیاز کیسا ادنیٰ کی رمز کیا ہے اعلیٰ کا راز کیسا
سائے سے بے کسوں کے ہے احتراز کیسا پتلوں کو خاک کے ہے، ہستی پہ ناز کیسا
کیفِ مئے خودی سے ہے وہم برتری کا
حاصل ہے ورنہ سب کو رتبہ برابری کا

تفریق جو ہے قائم یہ غیر قدرتی ہے اسفل بھی آدمی ہے افضل بھی آدمی ہے
دور از رہِ حقیقت یہ فرقِ ظاہری ہے ہر قصرِ تن میں روشن اک شمعِ زندگی ہے
جلوے ہیں سب اُسی کے رازِ حیات کیا ہے
ہیں پھول اک چمن کے تخصیصِ ذات کیا ہے

مثلِ حباب کیا ہے لازم ہوا میں بھرنا بحرِ جہاں میں سب کو اک گھاٹ ہے اُترنا
زیبا نہیں کسی سے بے جا سلوک کرنا منھ سے اچھوت کہنا نفرت سے نام دھرنا
تذلیل دوسروں کی تحقیر ہے خود اپنی
اُپنوں کو غیر کہنا تشہیر ہے خود اپنی

جوان کا مستقر ہے وہ ہے وطن ہمارا ہے وجہ نازان کو دورِ کہن ہمارا
تہذیب ایک سی ہے یکساں چلن ہمارا بیگانہ ان کو سمجھیں دیوانہ پن ہمارا
اس خاک کے ہیں پتلے بھارت سپوت ہیں سب
گر یہ اچھوت ہیں تو ہم بھی اچھوت ہیں سب

دلِ درد آشنا (برقِ دہلوی)

جسے راہِ طلب میں کھیل ہو اپنا مٹا دینا ہمیشہ جس کی خو ہو جل کے بھی بوئے وفا دینا
جسے آتا ہو جورِ ناروا سہ کر دعا دینا ودیعت جس کی فطرت میں ہو دونوں کو ہنسا دینا
مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

کمر بستہ رہے جو ہر نفس امدادِ بے کس پر ہمیشہ گوش بر آواز ہو فریادِ بے کس پر
جو اشکِ خوں بہائے خاطرِ ناشادِ بے کس پر تڑپ اٹھے جو دردانگیزیِ رودادِ بے کس پر
مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

اثر انداز ہوں جس پر نہ یہ جذباتِ نفسانی جو مثلِ آئینہ ہو پرتوِ وحدت سے نورانی
خیال و خواب میں جس کو نہ ہو فکرِ تن آسانی جو سمجھے دل نوازی مدعائے جسمِ انسانی
مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

جو ہمدردی رکھے حسرت زدہ محتاج بندوں سے کرے جو پرسشِ سوزِ نہانی دردمندوں سے
نہ رکھے کام جز رسمِ وفا دنیا کے دھندوں سے اسیرانِ بلا کو جو چھڑائے غم کے پھندوں سے
مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

جو آنکھیں نم پئے افتادگانِ خاک رکھتا ہو گراں جانوں کے ماتم میں گریباں چاک رکھتا ہو
اشاروں سے سمجھ لے حالِ دل، ادراک رکھتا ہو جسے بے چین دردِ خاطرِ غمناک رکھتا ہو
مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

نہ لائے تاب جو مظلوم کے دل دوز نالوں کی شعارِ خاص ہو جس کا مدد آشفتہ حالوں کی
جسے مدِ نظر ہو قدردانی بے کمالوں کی کرے سو جان سے جو دستگیری پائمالوں کی

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

جو خدماتِ خلائق اپنا فرضِ منصبی سمجھے
شریکِ درد و غم ہونا طریقِ راستی سمجھے
یتیموں کی مدد کرنے میں اپنی بہتری سمجھے
جو بے کس پروری پہلا اصولِ زندگی سمجھے

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

جو چارہ سازیِ زخمِ نہاں بے مدّعا کردے
تصدّق بےکسوں پہ اپنی جانِ مبتلا کردے
جو کارِ خیر کرکے نقشِ دامانِ فنا کردے
جو نیکی کرکے بھولے قطعِ امیدِ وفا کردے

مرے پہلو میں یارب وہ دلِ درد آشنا دینا

خدمتِ خلق (باسط بسوانی)

بیٹھ کر کنجِ حرم میں سبحہ گردانی سے کیا
دل ترا تاریک ہے ملبوسِ نورانی سے کیا
پائے بت پہ سجدہ ریزی رات دن بے سود ہے
تیرہ باطن ہے ترا ظاہر کی قربانی سے کیا
سیکڑوں بےکس ترے، امداد کے محتاج ہیں
کنجِ خلوت سے نکل یوں شغلِ روحانی سے کیا
قلبِ عالم کو مسخّر کر تو عالم ہو ترا
حسرتِ کشور ستانی سے جہاں بانی سے کیا
بج رہی ہے نوبتِ شاہی بھی در پہ صبح و شام
نفس کا بندہ بنا ہے تیری سلطانی سے کیا
بے خبر تو ہے اگر آفت زدوں کے حال سے
اے امیرِ وقت، ثروت کی فراوانی سے کیا
بے سر و ساماں جو ہیں ان پر نظر کرتا نہیں
تیری عشرت کوشیوں سے عیش سامانی سے کیا
کی نہ بڑھ کر دستگیری جب کسی مجبور کی
رستمِ دوراں بنا، اس زورِ جسمانی سے کیا
تیرے ہم جنسوں کو مشکل ستر پوشی الاماں
تیری جامہ زیبوں سے، زیب دامانی سے کیا
جب کسی کو فائدہ پہنچے نہ تیرے علم سے
اے ادیبِ بے بدل تیری ہمہ دانی سے کیا

دل جو پہلو میں ہے اہلِ درد کا ہمدرد بن — جو ہو صرف اپنے لئے تم اس چارہ سامانی سے گیا
بے نتیجہ ہے ترا ذوقِ ادب، شوقِ ادب — شاعرِ رنگیں نوا، ایسی سخندانی سے گیا
تیری نظریں جب نہ بہبودِ خلائق پر رہیں — اے تغافل کیش و خود بیں پھر نگہبانی سے گیا
عقدۂ قومی نہ تیری سعی سے جب وا ہوا — منطق آرائی سے باسط، فلسفہ دانی سے گیا
شمعِ الفت تک رسائی جب تجھے دشوار ہے — صورتِ پروانہ محفل میں پرافشانی سے گیا

خدمتِ خلق خدا کر تو اگر انسان ہے
خدمتِ خلق خدا ہی دین ہے ایمان ہے

اُمید (بیانِ یزدانی)

زمانہ اگر صحنِ باغِ ارم ہے — تو تو اے اُمید اس کی ابرِ کرم ہے
شگوفوں میں چھپتی ہے تو مسکرا کر — تو ہی کھِل کھِلاتی ہے پھولوں میں آ کر
تمنا کے کھیتوں میں ہل چل ہے تیری — تمدن کے میداں میں چہل پہل ہے تیری
تو ہی یاں کے پودوں کو دیتی ہے پانی — ہر اک تجھ سے ہے گلشنِ زندگانی
شگوفوں کے کوچوں میں تو دوڑتی ہے — یہ تو دوڑتی ہے کہ بو دوڑتی ہے
ترے سر پہ تاجِ شہی سج رہا ہے — ترے سر پہ کوسِ شہی بج رہا ہے
چڑھی تو مخالف پہ لشکر کو لے کر — پھری باج لے کر چلی تاج دے کر
دیا تو نے سلطاں کو خلعت کا سہرا — ہوا میں تری اُڑ رہا ہے پھریرا
رہی کوندتی عشق کے دنگلوں میں — پھری قیس کے ساتھ تو جنگلوں میں
رہِ چاہِ یوسف کو تو نے سنبھالا — کیا تو نے یعقوب کے گھر اُجالا

خلیلِ خدا کو جب آتش میں بھیجا — کیا تو نے چھینٹوں سے ٹھنڈا کلیجا
تو ہی ہے جوانوں کے گھوڑوں کی کاٹھی — تو ہی ہے ضعیفوں کے ہاتھوں کی لاٹھی
اُٹھایا اپاہج کو بستر سے تو نے — جِلایا ہے مُردوں کو ٹھوکر سے تو نے
جگاتی ہے چھینٹوں سے تو غافلوں کو — اُٹھاتی ہے شوخی سے تو کاہلوں کو
رگوں میں لہو بن کے تو دوڑتی ہے — ترے ساتھ ساتھ آرزو دوڑتی ہے
تو ہی ڈوبتی ناؤ کا ہے کنارا — تو ہی دیتی ہے ڈوبتے کو سہارا
دلھن کربلا میں بنی تو مچل کر — بن آئی شہادت کا بانا بدل کر
سمندر میں نلسن کو لے کر بڑھی تو — ولنگٹن کو میداں میں لے کر چڑھی تو

کلمبس کو تیری ہی لہر آ رہی تھی
ڈگاما کی آنکھوں میں لہرا رہی تھی

وحدت الوجود (بیانِ یزدانی)

کلیسا میں بت کی ادا بن گیا تو — حرم میں پہنچ کر خدا بن گیا تو
یہ پردے کی ہے بات سن لے نہ کوئی — کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گیا تو
لگائی ہے لو تجھ سے اُجڑے ہوؤں نے — اندھیرے گھروں کا دیا بن گیا تو
ہر اک رنج و غم کو کیا محو تو نے — ہر اک درد دکھ کی دوا بن گیا تو

بیاں کے سوا تو نے سب سے نبا ہی
یہیں آن کر بے وفا بن گیا تو

اشعار (تاجور نجیب آبادی)

جفائے دوست بنی رہنمائے منزلِ دوست
وہ کھو رہے ہیں مجھے اُن کو پا رہا ہوں میں

ہے میرے خاک کے ذرّوں میں کیوں نمودِ حیات
کہیں اُنھیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں

مرا فسانۂ غمِ دل نے بھی کبھی نہ سُنا
قتیلِ شیوۂ دردآشنا رہا ہوں میں

محبت آہ محبت کی زندگی مت پوچھ
بڑی مصیبتوں میں آج مبتلا رہا ہوں میں

متاعِ زیست ہوئی نذرِ بے نیازئ دوست
نیازِ وعدۂ صبر آزما رہا ہوں میں

ہے کائنات کا ہر ذرّہ ہم نوا میرا
کچھ ایسا محفلِ ہستی پہ چھا رہا ہوں میں

نیرنگِ عالم (شاہ تراب علی تراب)

چشمِ عبرت سے ہم نے دیکھا خوب
اس جہاں کا عجیب عالم ہے

یک طرف شور و غل ہے عیش و خوشی
یک طرف آہ و درد و ماتم ہے

پھول ہنستا ہے اور کلی چپ ہے
منھ پہ دونوں کے روتی شبنم ہے

تعمیرِ خانہ (تاثیر ایم۔اے)

وہی اچھّی تھی گھر کی ویرانی
دشمنِ عشرتِ تن آسانی

در و دیوار دیو واژدر تھے
بام اک بیشۂ نیستانی

اب گریباں گلے کا پھندا ہے
کیا فراغت تھی وائے عریانی

دل کو چھلنی کیا حوادث نے — وہی اچھے تھے تیر بارانی
واہمے کے پیچ و تاب نے مارا — اب کہاں سیر سنبلستانی
گھر کو سمجھا تھا وجہِ جمعیت — اور افزوں ہوئی پریشانی
ہے تخیل بھی چار سو محدود — آپ اپنا ہوا ہوں زندانی
دل ہے اور اعتبار وعدۂ وصل — میں ہوں اور اپنے گھر کی دربانی

عقل نے سو طرح سے سمجھایا
عشق نے ایک بھی نہیں مانی

یادِ وطن (تسکین قریشی)

وطن! وطن! مرے دل سوز و غم گسار وطن — ترے فراق میں ہر دم ہوں بے قرار وطن
خوشا وہ وقت کہ حاصل تھی تیری دید مجھے — خوشا وہ روز کہ تجھ سے تھا ہم کنار وطن
مجھے تو گردشِ قسمت سے یہ نہیں امید — کہ دیکھنے کو ملے پھر تری بہار وطن
بری گھڑی تھی برے دن، برا زمانہ تھا — جب آسماں نے چھڑایا ترا دیار وطن
گھٹائیں جھوم کے آئیں بھی اور چلی بھی گئیں — مگر یہ آنکھ ابھی تک ہے اشکبار وطن
یہ بات کیا ہے کہ میں اس قدر ہوں وارفتہ — یہ وجہ کیا مجھے اتنا ہے انتشار وطن
مری طرح ہیں غریب الدیار بہتیرے — مری طرح نہیں اوروں کو بھی قرار وطن
فقط فراق ہی تیرا انھیں ستاتا ہے — وہ صرف یاد میں تیری ہیں اشکبار وطن
مگر مجھے تو ترے رنج کے سوا ہر دم — لہو کے اشک رلاتی ہے یادِ یار وطن
مرا حبیب جدا ہو ترا بھی ساتھ چھٹے — تو ہی بتا کہ ہو کیوں کر مجھے قرار وطن

میں بے نشان ہوں میرا نشان تجھ میں ہے
بدن یہاں ہے مگر میری جان تجھ میں ہے

فصلِ بہار (ثاقب لکھنوی)

سبزۂ گردوں سے اونچا ہے خیابانِ بہار
برق بھی ہے اک چراغِ زیرِ دامانِ بہار
غازۂ رنگِ شفق میں ہے مہ ماہِ ربیع
مژدہ اے گلشن کہ رنگیں ہے گریبانِ بہار
ڈال دے تخمِ تلوّن اے سپہر سبزہ رنگ
پھوٹ نکلیں خاک سے گلشن میں ایوانِ بہار
مائدہ ہے نعمتِ الواں کا ابرِ تیرہ میں
اک دن اس سرپوش سے ہوگا عیاں خوانِ بہار
زرد ہے رنگِ خزاں گھر کر سوادِ ابر میں
اک حصارِ آہنی ہے فوجِ سلطانِ بہار
صیقلی تیروں کی شکل آتی ہے باراں میں نظر
سر سے پا تک آب میں ڈوبے ہیں پیکانِ بہار
کام اپنا کر چکی تیغِ مہِ اُردی بہشت
سرِ خزاں کا ہو گیا ہے گوئے چوگانِ بہار

غروبِ آفتاب (ثاقب لکھنوی)

خدا کا نام لے اے طالبِ نور
کہ دن کی روشنی ہوتی ہے کافور
سرِ مشرق پہ آ پہنچا اندھیرا
عنانِ مہر کو گردوں نے پھیرا
غضب ڈھایا شبِ نو میہماں نے
اُفق کو آگ دیدی آسماں نے
رخِ مشرق پہ رنگِ سوسنی ہے
درِ مغرب پہ کچھ کچھ روشنی ہے
شفق میں ہے یہ سورج کا قرینہ
کہ جیسے آگ میں نانِ شبینہ

تڑپ مدھم ہے روئے شعلہ زا کی — جلا کم ہو چلی طشت طلا کی
شعاعوں نے جو آنکھیں پھیر لی ہیں — اندھیرے نے بھی راہیں گھیر لی ہیں
فروغ مہر تھا جن کے سہارے — وہ تارا اب ہو گئے معدوم سارے
جو دیکھا یہ چراغ زیر دامن — پرندوں کو ملی راہ نشیمن
چلا ہے کوئی سوئے آشیانہ — بٹھائے ہے کسی کو حرص دانہ
کسی جانب اڑا جاتا ہے اک غول — کہ جس کی سبز پوشاکیں ہیں انمول
صدا پرواز کی آتی ہے ہر گام — بیاباں میں ہے سنّاٹا سر شام
توقف کا زمانہ ہے بہت کم — گلے ملتے ہیں دونوں وقت باہم
ہٹا کر طائروں کو زیر اشجار — سیہ بستر لگاتی ہے شب تار
سفر بھی ساتھ ہی دن کے ہے آخر — قریب آئے ہیں منزل کے مسافر
کہیں مارے ہوئے منزل کے بیٹھے — وہ گیا بیٹھے سفینے دل کے بیٹھے
بہم پہنچے نہیں راحت کے ساماں — تھکے ماندے مسافر ہیں پریشاں
گئی ہمراہ مہر اس کی روانی — تھما بہتے ہوئے دریا کا پانی
کیا دریا نے پیدا رنگ گیسو — سیہ ہونے لگا آئینۂ جو
نظر آئی جو پانی میں سیاہی — تو جل اٹھے چراغ فلس ماہی

نوید رحلت پروانہ لائیں
گھروں میں سولیاں شمعوں کی آئیں

دیدۂ بینا (ثاقب لکھنوی)

جانِ خوش ہے باغِ ہستی میں نہ دل مسرور ہے ۔ کیا بہارِ زندگی جب آنکھ ہی بے نور ہے
صورتِ راحت کہاں، آنکھوں میں دنیا ہے سیاہ ۔ جل رہا ہے دل کہ ٹھنڈا کیوں چراغِ طور ہے
دید کے قابل تماشا گاہِ عالم ہے مگر ۔ وائے محرومی اگر آنکھوں سے تو معذور ہے
وہ طلسمی لوح سب کہتے ہیں جس کو مردمک ۔ سات پردوں میں یہ رازِ منجلی مستور ہے
ایک نقطہ ہے جو ہے صورت کشِ ارض و سما ۔ ایک تل ہے جس میں عالم کی فضا محصور ہے
صنعتیں ہیں، کلکِ قدرت کا مرقع دیکھئے ۔ انطباعِ شکل کا، حیرت نما دستور ہے
کیا چھپی تصویر کب آنکھوں سے غائب ہوگئی ۔ نقشِ اوّل کیا ہو جب دوسرا منظور ہے
منطبع ہوتی ہیں لاکھوں رنگ کی شکلیں مگر ۔ کوئی دھبّا لوح پر رہ جائے کیا مقدور ہے
دیدۂ بینا بڑی نعمت ہے، دیکھو غور سے ۔ لطفِ ہستی ہے جو آنکھوں میں ضیا و نور ہے

کور ہونا ہے گوارا یا بصارت ہے عزیز
اے مریضِ چشم بتلا کیا تجھے منظور ہے

شاعر (ثاقب کانپوری)

ساری دنیا سو رہی ہے اور تو بیدار ہے ۔ دور ہے راحت سے اور لذت کشِ آزار ہے
لے رہا ہے ذرّے ذرّے سے تو عبرت کا سبق ۔ یعنی ہر ہر گام پر ہوتا ہے سینہ تیرا شق
تیری نظریں دیکھتی ہیں انتہا آغاز میں ۔ محو ہو جاتا ہے جب تو انکشافِ راز میں
ظاہری رنج و الم سے دل ترا بیگانہ ہے ۔ انکشافِ رازِ یزدانی کا تو دیوانہ ہے

مضطرب ہوتی ہے تیری روح لہریں دیکھ کر — تو سمجھتا ہے انھیں سے کیا ہے انجامِ بشر
دیکھ کر پھولوں کو روتا ہے کبھی تو زار زار — وجد میں کرتا ہے اپنا ہی گریباں تار تار
قطرۂ شبنم ہیں گویا اک کتابِ زندگی — دیکھتا ہے جس کو تو پڑھ پڑھ کے خوابِ زندگی
تو ہے عکاسِ ازل، فطرت میں تیری درد ہے — گو بظاہر خوش ہے لیکن لب پہ آہِ سرد ہے
تو نے فطرت کے سبق کو پھر سے دہرایا یہاں — آشکارا کر دئے جو راز تھے اب تک نہاں
فطرتِ خوابیدہ کو بیدار کر دیتا ہے تو — زندگی سے عیش کی بیزار کر دیتا ہے تو
مست ہو جاتا ہے تو ابرِ سیہ کو دیکھ کر — چشمکوں سے برق کی لیتا ہے تو گویا اثر
اے کہ تیری ذات سے ہے رونقِ بزمِ جہاں — اے کہ ہستی ہے تری سرمایہ دارِ کن فکاں
اے کہ تیری ذات سے ہے رونقِ بزمِ شہود — اے کہ تیرے رنگ سے ہر شے میں ہے رنگِ نمود
تو نہ ہوتا تو نہ ہوتا یہ جہانِ رنگ و بو — تو نہ ہوتا تو نہ ہوتی حسن کی کچھ آبرو

تو نہ ہوتا تو نہ ہوتے منکشف رازِ حیات
تو نہ ہوتا تو نہ ہوتا نقشِ فانی کو ثبات

حقیقتِ زندگی (ثاقب کانپوری)

زندگی ہے یا ہوائے خانماں برباد ہے — یا کوئی سیارۂ محور و غیر آباد ہے
یا کوئی طائر جو اڑتا ہے فضا میں دم بدم — جوش جس کا ہو نہیں سکتا ہے کم کرنے سے کم
یا کہ ہے یہ فصلِ گل میں اک طرب انگیز جوش — کھو دئے ہیں جس نے اربابِ بصیرت کے بھی ہوش
قطرۂ شبنم ہے یا برگِ گلِ گلزار پر — جذب کر لیں گی شعاعیں جن کو ہوتے ہی سحر
یا کہ جھونکا ہے کوئی یہ بادِ طوفاں خیز کا — یا یہ دورہ ہے کوئی جوشِ جنوں انگیز کا

یہ سطحِ آب پر ہے اک حبابِ بے ثبات
دم زدن میں جس کی گل ہونے کو ہے شمعِ حیات
اس حقیقت پر بھی ناداں کس قدر غافل ہے تو
اور دل میں یہ سمجھتا ہے بڑا عاقل ہے تو
بادۂ ہستی کے اک ساغر سے تو سرشار ہے
اپنے کاموں پہ نظر کرنے سے بھی بیزار ہے

شاعر کے تأثرات (جوش ملیح آبادی)

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں
مجھے ہر ایک پتی نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے
فضائے تیرہ پر جس وقت چھا جاتا ہے سناٹا
مجھے جنبش میں ذروں کی زباں معلوم ہوتی ہے
شفق کے ہر نفس اڑتے ہوئے اوراقِ سوزاں پہ
مجھے بیتابیِ عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے
زمین و آسماں جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں رائگاں معلوم ہوتی ہے
دلِ وادی سے اٹھتا ہے دھواں جس وقت ہلکا سا
پہاڑوں کی بلندی سرگراں معلوم ہوتی ہے
چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے دامن میں
بشر سے روحِ عالم سرگراں معلوم ہوتی ہے
دیا کچھ فلک صلے پر ٹمٹما اٹھتا ہے جب بن میں
سیاہی روشنی کی راز داں معلوم ہوتی ہے
جھلک اٹھتا ہے جب پہلا ستارہ بامِ گردوں پہ
کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے
فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اداسی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے
کلی کے مسکراتے ہی حیات و موت میں مجھکو
فقط لے دے کے اک شب درمیاں معلوم ہوتی ہے
سبک پودوں کی میداں میں لچک جاتی ہیں جب شاخیں
کسی کی یاد دل میں پر فشاں معلوم ہوتی ہے
شفق کو دیکھتے ہی وہ محبت جس کو جگ بیتا
مرے دکھتے ہوئے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے
یہ بیداری کہ جس پر ناز ہے اربابِ دانش کو
مجھے تو جوش اک خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے

ترانۂ بہار (جوش ملیح آبادی)

پھر بہار آئی ہوا سے بوئے یار آنے لگی
پھر پپیہے کی صدا دیوانہ وار آنے لگی

پی کہاں کا شور اُٹھا حق سرّہ کا غلغلہ
کوئلیں کوکیں صدائے آبشار آنے لگی

کھیت جھومے، بور آیا پھول مہکے دل کھلے
کونپلیں پھوٹیں ہوائے مشکبار آنے لگی

پھر درختوں نے زمیں سے رنگ چوسے نو بہ نو
پتیوں میں پھر نظر شکلِ بہار آنے لگی

پھر مری ہر سانس اک خوشبو کی دنیا ہو گئی
پھر ہوائے طرّۂ گیسوئے یار آنے لگی

پھر گھنے باغوں میں چھیڑا مست چرواہے نے راگ
پھر صدائے نغمہائے شاخسار آنے لگی

پھر ہوائے سرد کے جھونکوں میں مے خانے کھلے
پھر لبِ جاں بخش سے بوئے خمار آنے لگی

کھینچتی پتوں پہ خط، رنگینیاں بھرتی ہوئی
پھر صبا پہنے ہوئے پھولوں کے ہار آنے لگی

پھر سماعت سے ملائم ساز نے کی چھیڑ چھاڑ
پھر صدائے بربط و چنگ و ستار آنے لگی

پھر شگوفے مسکرائے پھر چلی ٹھنڈی ہوا
یاد اک عالم کی پھر بے اختیار آنے لگی

جوش پھر رسنے لگے ٹوٹے ہوئے وعدوں کے زخم
پھر مرے سینے سے بوئے انتظار آنے لگی

بھوکا ہندوستان (جوش ملیح آبادی)

ایک مفلس کے مکاں میں کل ہوا میرا گزر
خاک پر بیٹھا تھا بچہ اور بیوی تخت پر

تخت اینٹوں کی کمی بیشی سے ناہموار تھا
وزن اک نازک سی عورت کا بھی جس پہ بار تھا

تیرہ قسمت گھر کا مالک پائمالِ صد جنوں
بوریئے پر اک طرف بیٹھا ہوا تھا سرنگوں

فرقِ پیشانی پہ تھا چھایا ہوا دل کا دھواں
جس میں رقصاں تھیں شرافت کی سبک چنگاریاں

اس کی ہستی تھی اک ایسی ہستیِ نا معتبر
مارتے ہیں قہقہے جہال جس کے علم پر

تھا وہ یوں اس نا سزا دنیا میں پابندِ قلق
ہر سبک سر کو تھا جس پر معترض ہونے کا حق

تھا وہ اس عالم میں جب رہتی نہیں چہرہ پر آب
مانتا ہے شیب کے دعوے جب انساں کا شباب

منہ لٹک جاتا ہے اوہام بکھر جاتا ہے جب
آدمی خود اپنی ہی نظروں سے گر جاتا ہے جب

فاقہ کش انساں جب ہوتا ہے یوں زیر و زبر
جھینپتا ہے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر

جب سبک ہوتا ہے اس درجہ محبت کا نیاز
خود شریکِ زندگی بھی ترک کر دیتی ہے ناز

جب کوئی عزت سے پیش آتا ہے تو مردِ حزیں
سوچنے لگتا ہے یہ ہم کو بنانا تو نہیں

زندگی جس وقت ہو جاتی ہے یوں زار و حزیں
وہم بن جاتا ہے خود اپنی شرافت کا یقیں

دل میں جب احساسِ رحمت کا نہیں رہتا ہے دم
کفر کی سرحد پہ جب پڑتے ہیں انساں کے قدم

جب زبون و خستہ جاں انساں کا ذوقِ وفا
خلق کی نظروں میں ہوتا ہے مدد کی التجا

زندگی ہوتی ہے جب اس درجہ حسرت آفریں
تخلیے کا دوست بھی موقع کبھی دیتا نہیں

جب حقائق معلوم ہوتے ہیں خود اپنے ہی گھر
وہم ہوتا ہے یگانگت کا خود اپنی وضع پر

رخ پہ جب ہوتے ہیں ایسی خستہ حالی کے نشاں
جس کے سچ پر جھوٹ کا ہوتا ہے دنیا کو گماں

اس مصیبت سے تھی اس کی زندگی زیر و زبر
جس مصیبت پر شرافت تولنے لگتی ہے پر

اس کے سر پہ تھا تہیدستی کا وہ بارِ گراں
بولنے لگتی ہیں جس سے زندگی کی ہڈیاں

مفلسی کے اس کنارے پر تھا وہ گرمِ خرام
ترک کر دیتا ہے بیٹا باپ کا جب احترام

الغرض چھائی ہوئی تھی یاس سقف و بام پہ
روح تھرّانے لگی میری یہ منظر دیکھ کر

گھر تھا یا اک کارواں بھٹکا ہوا کھویا ہوا
خفتہ تھی قسمت مکینوں کی مکاں سویا ہوا

یہ کھنڈر اس قصر عالی کا تھا اک ایسا مقام
تھا جہاں کل اس کے آبا کے غلاموں کا قیام

جس طرف اس کا لڑکپن بھول کر آتا نہ تھا
عہد طفلی میں جدھر یہ کھیلنے پاتا نہ تھا

جو مکاں کل نغمۂ خدّام سے پر جوش تھا
آج آقا کو لئے آغوش میں خاموش تھا

پوچھتا جاتا تھا لیکن خیر سے تو ہیں مکیں
مجھ میں اک مدّت سے کوئی قہقہہ گونجا نہیں

طاق پر رکھا ہوا تھا ایک سویا سا چراغ
طاق کے نیچے تھے کڑوے تیل کے دو ایک داغ

تیل بہنے کا نشاں دیوار پر اصلا نہ تھا
ایک دن بھی وہ دیا شاید کبھی چھلکا نہ تھا

اس حقیقت کو سمجھ سکتے نہیں اہلِ فراغ
اور ظلمت کو بڑھا دیتا ہے مفلس کا چراغ

سرد چولھے کے قریب اڑتا ہوا ہلکا غبار
الگنی پر چند کپڑے اور وہ بھی تار تار

ایک گوشے میں بچھا بستر کے عوض تھوڑا سا پیال
جس پہ دو ٹکڑے دری کے اور اک صد پارہ شال

شال کے ہر تار میں خوابیدہ سو نقش و نگار
عہد ماضی کی بچی لے دے کے یہی اک یادگار

بچہ بہلا سا ہوا اٹھا خاک کے اک ڈھیر سے
ماں دوپٹہ سی رہی تھی سر جھکائے دیر سے

کھیلنے میں طفلکِ گلفام تھا ڈوبا ہوا
آئی اتنے میں گلی سے آم والے کی صدا

کانپتی آئی صدا ہلنے لگا بچے کا دل
سانس لی یوں جیسے رکھی ہو کوئی چھاتی پہ سِل

ہو گئی اگلی ضدوں کی یاد سے دنیا سیاہ
ماں کے چہرے کی طرف ڈالی جھجکتی سی نگاہ

ماں کی نظریں اٹھ گئیں اٹھ کر پڑیں پھر جھک گئیں
ہائے میرے لال میرے پاس تو کچھ بھی نہیں

دیکھ کر ماں کی اداسی ہو گئی پامال پیاس
انکھڑیوں میں آم کی سرخی تخیّل میں مٹھاس

ہونٹ کانپے خود بخود اور رہ گئے پھر کانپ کے
آنکھ میں غلطاں ہوئے ماضی کے دھندلے تجربے

راستے ہی میں آ گئی دیوار نالے چڑھ گئے
منہ میں تھرّائی زباں الفاظ آگے بڑھ گئے

چھا گیا آنکھوں میں سناٹا دلِ ناکام کا
اشک بن کر آنکھ سے ٹپکا تصوّر آم کا

چہرہ مرجھایا نفس بوجھل سا کچھ ہونے لگا ‏ دل کے سناٹے میں بچپن کھو گیا سونے لگا

نیم جاں ماں باپ کی نظروں کے خط ملنے لگے
باپ کا سر اور دیکھا ماں کے لب ہلنے لگے

غنچۂ پژمردہ (جوش ملیح آبادی)

چشمِ عبرت دیکھ رنگِ بے کسی چھایا ہوا ‏ خاک پر غنچہ پڑا ہے آہ مرجھایا ہوا
کھو گئے جورِ چرخ سے گہوارۂ ناز و نعیم ‏ خاک پر سوتا ہو جیسے کوئی ننھا سا یتیم
روح ہے خاکِ چمن کی لب پہ یہ آئی ہوئی ‏ یا تمنا ہے دلِ گلشن کی مرجھائی ہوئی
یہ دلِ افسردۂ عشاقِ شور انگیز ہے ‏ یا چمن کی مختصر سی نظمِ درد آمیز ہے
سینۂ نشو و نما کا ہے یہ قلبِ داغ دار ‏ یا دلِ فطرت کے ارمانِ تبسم کا مزار
یا گرہ ہے دل کی، ہو جس سے طبیعت بے قرار ‏ یا کسی بیمار دوشیزہ کی چشمِ سوگوار
یا کسی کے کان کا موتی ہے لیکن چور ہے ‏ یا نسیمِ عہدِ گل کی سعیِ نامشکور ہے
محفلِ گلزار میں اک درد کا پہلو ہے یہ ‏ دیدۂ گلشن سے یا ٹپکا ہوا آنسو ہے یہ
یہ شگوفہ آہ ٹھکرایا ہوا گلزار کا ‏ آئینہ ہے زندگی کے سیکڑوں اسرار کا
ابنِ آدم کھول آنکھیں دیکھ حالاتِ جہاں ‏ ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے زندگی کی داستاں
سن رہا ہے کیوں انھیں تو نیند لانے کے لیے ‏ یہ فسانے تو ہیں سوتوں کو جگانے کے لیے
اہلِ غفلت کا ہمیشہ مطلبِ دل فوت ہے ‏ فکر کی قندیل کا خاموش رہنا موت ہے

عالمِ فانی کی رگ رگ میں اترنا چاہیے
خاک کے پتلے تجھے کچھ غور کرنا چاہیے

چاندنی رات اور خوابِ نوشیں (جوش ملیح آبادی)

چودھویں مرگِ ناگہانی ہے | چاندنی رات کی جوانی ہے
ہاتھ تخئیل کا رباب پہ ہے | چاند کی سادگی شباب پہ ہے
چشمِ اہلِ نظر میں ہیں آنسو | بھینی بھینی ہوا میں ہے خوشبو
نازشِ عالمِ شباب کوئی | فرشِ گُل پر ہے محوِ خواب کوئی
خوش نما نقش ہے نگینے پر | ہاتھ رکھا ہوا ہے سینے پر
سانس لینے میں ہونٹ ہلتے ہیں | سرد جھونکے ہیں پھول کھلتے ہیں
نیم وا آنکھیں حشر کا ساماں | زیرِ مژگاں وہ سایۂ مژگاں
صحنِ گلشن میں حسن کی ضو ہے | پھول پر چاندنی کا پرتو ہے
روئے شفّاف پر ہے خواب کا رنگ | یا صراحی میں ہے شراب کا رنگ
رخ پہ لہریں سی ہیں تلاطم ہے | ہائے کیا نیند کا تبسّم ہے
زلف بکھری ہوئی قیامت ہے | جھٹپٹے وقت کی سی صورت ہے
کچھ سیاہی ہے کچھ درخشانی | زلف سے چھپ گئی ہے پیشانی
حسن ڈوبا ہوا ہے صنعت میں | کیا تناسب ہے نور و ظلمت میں
تو کہے رخ کی برق پاشی میں | صبح کیا ہو رہی ہے کاشی میں
لوٹتی ہے زمین پر چادر | سر ہے تکیے کے ایک گوشے پر
رُخ نے چمکا دیا ہے گلشن کو | چاندنی چومتی ہے گردن کو
روئے رنگین و گیسوئے برہم | نیند میں ہائے حسن کا عالم

بے کہے گو میں رہ نہیں سکتا — پھر بھی لفظوں میں کہہ نہیں سکتا
دل سے جو تیر کھینچ سکتا ہے — وہ یہ تصویر کھینچ سکتا ہے

جوشؔ اس وقت کوئی کام نہ کر
غور سے دیکھ اور کلام نہ کر

مسلمان (جوشؔ ملیح آبادی)

تم نہ بگڑو تو میں پوچھوں ڈرتے ڈرتے ایک بات — سچ بتاؤ کون ہے اس وقت ننگ کائنات
ہٹ گیا ہے کون ابرِ زندگی کی چھاؤں سے — کس نے اپنا تاج روندا ہے خود اپنے پاؤں سے
اس زمین و آسماں کی شہریاری چھوڑ کر — کون بھاگا ہے غلامی کی طرف منھ موڑ کر
صاف کہنا کون ہے ان ذیل کے عیبوں میں طاق — کذب و غیبت، افترا، اسراف، بدبینی، نفاق

آج کتراتا ہوا وحدانیت کی راہ سے — یہ مرادیں مانگتا ہے کون غیر اللہ سے
جھومتا ہے کون قوالوں کے ہر اک بول پر — کون یہ عرسوں میں بہروں ناچتا ہے ڈھول پر
بن کے ذاکر سیم و زر کے ڈھیر پر گرتا ہے کون — خونِ اولادِ پیمبر بیچتا پھرتا ہے کون
پشتِ مرکب چھوڑ کر تکیوں پہ ہے کس کا مدار — جنگ کے میداں میں کس نے پھینک دی ہے ذوالفقار
حجلۂ عشرت میں کی ہے یوں خدا کی کس نے یاد — فربہی کی کشمکش سے کر نہیں سکتا جہاد
کون چلّوں کی مشقت سے ہے یوں زار و حزیں — ضعف کی شدت سے جو تلوار اٹھا سکتا نہیں
گر گیا ہے آسماں سے کس کا پرچم خاک پر — جم گئی ہے برف کس کے شعلۂ چالاک پر
بن چکا ہے کس کا خود آہنی رشکِ حباب — مل چکا ہے کس کے انگاروں کو شبنم کا خطاب
کون ہیں یہ لوگ کچھ سمجھے بھی اے اطفالِ دیں — مجھ کو تو یہ وہم ہوتا ہے کہیں تم تو نہیں

تم نہیں تو پھر یہ جینے کے عوض مرتا ہے کون
روز و شب آیاتِ حق سے دل لگی کرتا ہے کون

محبت کا قدم (جوش ملیح آبادی)

اگر قدم نہ محبت کا درمیاں ہوتا — تو یہ زمیں ہی نہ ہوتی نہ آسماں ہوتا
نوائے عشق نہ کرتی اگر حدی خوانی — نہ کارواں نہ کوئی میرِ کارواں ہوتا
نہ چھیڑتی اگر انسانیت ترانۂ شوق — زمانہ کشتۂ تسبیحِ قدسیاں ہوتا
صراحیوں کی ہر اک بوند اشک بن جاتی — جوانیوں کا ہر اک عشوہ رائیگاں ہوتا
نہ یہ بہارِ طرب خیز و غم ربا ہوتی — نہ یہ فروغِ مئے تندِ ارغواں ہوتا
نہ قدرِ زمزمۂ لعلِ دل نشیں ہوتی — نہ شورِ عربدۂ حسنِ بے اماں ہوتا
نہ یہ خرامِ سبک رو نسیم کو ملتا — نہ یہ نظام ستاروں کے درمیاں ہوتا
نہ خونِ تازہ ٹپکتا دلِ برہمن سے — نہ آبِ رنگِ نقوشِ دلِ بتاں ہوتا
نہ کوئی زمزمۂ عمرِ جاوداں سنتا — نہ کوئی بہرہ ورِ مرگِ ناگہاں ہوتا
نہ عقل عشق و جوانی کے بھید پا سکتی — نہ علم لالہ رخوں کا مزاج داں ہوتا
نہ آہِ سردِ لبِ زندگی پہ آ سکتی — نہ خونِ گرم رگِ دہر میں دواں ہوتا
نہ کوئی سیم بدن آفتِ زماں بنتا — نہ کوئی زہرہ جبیں فتنۂ جہاں ہوتا
خدائی قلب کا ہلکا سا وسوسہ ہوتی — خدا ضمیر کا دھندلا سا اک گماں ہوتا
بلند و پست کی نبضیں چھٹی چھٹی رہتیں — حیات موت کا چہرہ دھواں دھواں ہوتا
خدا نہ کردہ جو ہوتا یہی مزاجِ حیات — نہ جانے جوش ٹھکانا مرا کہاں ہوتا

مظلوم بچّہ (جوش ملیح آبادی)

بہ حسرت مالکہ کے حکم سے اک ناتواں بچّہ — جھکا میداں میں جھاڑو دے رہا تھا گیہ و تنہا
سحر کا وقت ہے شادابیاں ہیں نرم جھونکوں میں — گلی سے آ رہی ہیں کھیل کی مخلوط آوازیں
پیاپے کھیل کا میدان جب آواز دیتا ہے — ذرا سا سر اُٹھا کر مالکہ کو دیکھ لیتا ہے
صدائیں کھیل کی آ آ کے جب اوسان کھوتی ہیں — اسے اپنی جگہ پر ٹھوکریں محسوس ہوتی ہیں
تقاضا کمسنی کا دل میں جب دھومیں مچاتا ہے — لرز اُٹھتا ہے، گردن موڑتا ہے، سر کھجاتا ہے
دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے — رخِ طفلی پہ اک بے چارگی سی دوڑ جاتی ہے

غریب افلاس، تجکو دھیان میں لانے نہیں دیتا
مرے معصوم بچّوں تک کو بہلانے نہیں دیتا

مفلسوں کی عید (جوش ملیح آبادی)

اہلِ دول میں دھوم تھی روزِ سعید کی — مفلس کے دل میں تھی نہ کرن بھی امید کی
اتنے میں اور چرخ نے مٹی پلید کی — بچّے نے مسکرا کے خبر دی جو عید کی

فرطِ محن سے نبض کی رفتار رک گئی
ماں باپ کی نگاہ اُٹھی اور جھک گئی

آنکھیں جھکیں کہ دستِ تہی پر نظر گئی — بچّے کے ولولوں کی دلوں تک خبر گئی
زلفِ ثبات، غم کی ہوا سے بکھر گئی — برچھی سی ایک دل سے جگر تک اُتر گئی

دونوں ہجومِ غم سے ہم آغوش ہو گئے
اک دوسرے کو دیکھ کے خاموش ہو گئے

بازیِ ازل (جوش ملیح آبادی)

تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

اے شوخ دل سے تیری شوخی کو مانتا ہوں — اکسیر گر کبھی ہوں، گہہ خاک چھانتا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

گھٹ کر کبھی ہوں ذرّہ بڑھ کر کبھی ہوں سورج — آج ابتدا کا جلوہ، کل شانِ انتہا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

وادیِ معصیت میں مرکز ہوں تیرگی کا — میدانِ معرفت میں خورشید حق نما ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

میں مرجعِ فراغت میں ساز و برگِ عشرت — میں غرقِ عیش و عشرت میں درد آشنا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

خشکی کبھی، کبھی میں کف در دہاں سمندر — گہ کشتیِ شکستہ گہہ سعیِ ناخدا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

آج آئینہ طرب کا کل گردِ بے قراری — آج آفتِ زمانہ کل خاکِ نقشِ پا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

آج آفتابِ عزّت کل ذرّۂ حقارت — آج انتہائے صحت کل دردِ لادوا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

میری بھی کوئی ہستی آندھی کی زد پہ شعلہ — میری کوئی حقیقت دم بھر میں کیا سے کیا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

کانٹے اگر بچھے ہیں پروا نہیں ہے مجھکو — ذوقِ رہِ طلب میں طوفان ہوں بلا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

سختی و ناخوشی کی طے کر چکا ہوں راہیں — اک آنچ کی کسر ہے اکسیر ہو چلا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

جا اور جا کے دھوکے دے اور ہی کسی کو — اچھّی طرح میں تیری چالیں سمجھ چکا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

چھوڑوں گا میں نہ دامن کتنا ہی تو چھڑائے — میں جوش میں ہوں جوشِ اسرار آشنا ہوں
تو مجھ سے کھیلتا ہے میں خوب جانتا ہوں

مشاہدہ (جوش ملیح آبادی)

میں یکایک ہو گیا کیوں اس قدر نازک مزاج — یہ تخیّل مجھ کو کس عالم میں لے آیا ہے آج
کس قدر اسرار سے معمور ہے یہ سرزمیں — اک ادائے دلکشی کے ساتھ ہیبت آفریں
موتیے کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے دور دور — یاسمن کے برج میں شبنم کے ایوان و قصور
منجمد کرنوں کی محرابیں قطار اندر قطار — جن پہ ہیں رنگِ شفق کے پردہ ہائے زرنگار
موتیوں کو گوندھ کر لکھّے گئے ہیں جن پہ نام — تیرگی کا ہے یہ مسکن، یہ تجلّی کا مقام
جائیے جس سمت پردوں پر بپا ہے انقلاب — یہ ہے غم کی یہ خوشی کے راز کی محراب ہے
اک فرشتہ میرے دل میں نور پھیلاتا ہوا — پھر رہا ہے لوحیں محرابوں کی دکھلاتا ہوا

یہ حقیقت شادمانی کی ہے، یہ آلام کی
یہ نکاتِ حسنِ شیریں، یہ رموز کو ہائے کُن
اے خدا لیکن اس آگاہی میں ہیں یہ کیا صفات
اُڑتا جاتا ہے برابر رنگ موجودات کا
منکشف جس وقت ہو جاتا ہے رازِ جزو کُل
عقل پا لیتی ہے جس شئے کی حقیقت کا سراغ
جہل کے پھولوں کو اے محمود مرجھانے نہ دے

یہ حقیقت صبحِ جاں پرور کی ہے، یہ شام کی
یہ حقیقت ہے شمیمِ گُل کی یہ رازِ چمن
دل فریبی سے مٹی جاتی ہے ساری کائنات
جتنا جتنا بڑھ رہا ہے نور معلومات کا
روح فرسا خار میں تبدیل ہو جاتا ہے گُل
دل ہیں ہو جاتا ہے گُل اُس کی لطافت کا چراغ
آدمی کو بارگاہِ عقل میں جانے نہ دے

ذکرِ رنگیں (جگر مراد آبادی)

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قدِ بالا، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں پہ جنبش نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
وہی لطافت وہی نزاکت وہی تبسّم وہی ترنّم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں
خرام رنگیں، نظامِ رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گُل کھلا رہے ہیں
شباب رنگیں جمال رنگیں وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بنا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے اُچھل رہی ہے پیئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں
خود اپنے نشے میں جھومتے ہیں وہ اپنا منھ آپ چومتے ہیں
خرابِ مستی بنے ہوئے ہیں ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں
وہ روئے رنگیں وہ موجۂ یم کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیِ حسن کا ہے عالم عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں
یہ مست بلبل بہک رہی ہے قریبِ عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں
یہ موجِ دریا یہ ریگ و صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں
فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موجِ دریا ٹھہر گئی ہے
سکوتِ نغمہ بنا ہوا ہے وہ جب سے کچھ گنگنا رہے ہیں
اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدّر رہے گا لیکن یہ نقش دل پر
ہم ان کا دامن پکڑ رہے ہیں وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہیں
یہ اشک جو بہہ رہے ہیں اگرچہ سب ہیں یہ حاصلِ غم
مگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے کچھ مسکرا رہے ہیں
خوشی سے لبریز شش جہت ہے زباں پر شورِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

مجذوب کی صدا (جگر مرادآبادی)

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر؟ جو ہوں تو کیا ہوں میں

فریب خوردۂ رنگینیِ ادا ہوں میں
نظر کی چند شعاعوں میں گھر گیا ہوں میں

کمالِ بے بصری پر بھی کیا بلا ہوں میں
وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے یہ دیکھتا ہوں میں

تمام اصل و حقیقت کا آئنہ ہوں میں
خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں

کرشمہ سازیِ ہنگامۂ جہاں معلوم
خود اپنے حسنِ صفاتی پہ مبتلا ہوں میں

فتاگی میرا شیوہ شکستگی مری شان
خود اپنی راہِ حقیقت کا رہنما ہوں میں

سمجھ میں خاک نہ آئیں گے معنی و مطلب
مجھے نہ سن کہ بہت دور کی صدا ہوں میں

گراں ہے میری لطافت پہ یہ غبارِ وجود
اُسے بقا مری سمجھو اگر فنا ہوں میں

کدھر ہے؟ منظرِ ہستی کے دیکھنے والے
یہ ساز وہ نہیں جس ساز کی صدا ہوں میں

قدم ذرا جو ہٹے جادۂ وفا سے کہیں
ہر ایک ذرّہ پکارا کہ دیکھتا ہوں میں

مٹائے لاکھ زمانہ، مٹا نہیں سکتا
اگر یہ سچ ہے کہ تیری ہی اک ادا ہوں میں

ہر ایک شے نظر آتی ہے خود مری تصویر
جہاں سے منظرِ فطرت کو دیکھتا ہوں میں

فضائے دہر کی ہر موج جس سے رقص میں ہے
وہ ایک نغمۂ بے ساز و بے صدا ہوں میں

جہاں نہ پھونک دیں آتش نوائیاں میری
کہ سوزِ سینۂ اربابِ با صفا ہوں میں

تصوّرات کی آئینہ بندیاں بے سود
تعیّنات کی دنیا سے ماورا ہوں میں

مجھے تلاش کرا اے بے خودیِ شوقِ سجود
پہنچ کے منزلِ مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

مجھے نہ چھیڑ بہت اے نسیمِ صبحِ کرم
تمام شوق و شکایت کا ماجرا ہوں میں

مٹا نہ صفحۂ ہستی سے میرا نقشِ وجود
کہ فخرِ عاشقی و نازشِ وفا ہوں میں

جگر یہ ہرزہ سرائی مری یہ بے ربطی
یقیں ہوا کسی مجذوب کی صدا ہوں میں

نغمۂ اسلام (جگر مرادآبادی)

ہر طرف غل ہے وہ آیا جگر بادہ پرست
اثرِ نشۂ صہبا سے سراپا بد مست
شعرِ حافظ بزباں جام بہ کف شیشہ بدست
بے خبر از ہمہ عالم چہ بلند است و چہ پست

شورِ مستانہ کہاں اور سخنِ وعظ کہاں
آج یہ رند کہاں، انجمنِ وعظ کہاں

جمع مومن بھی ہیں عالم بھی ہیں دیندار بھی ہیں
معتدل رنگ کے بھی لوگ ہیں احرار بھی ہیں
واقفِ رازِ سراپردۂ اسرار بھی ہیں
دیں کے طالب بھی ہیں دنیا کے طلبگار بھی ہیں

کیا سمجھ کر یہ چلے آئے ہیں اپنے جی میں
اُن سے پوچھو تو کوئی آپ ہیں کس گنتی میں

جانتا ہوں کہ ہوں دراصل میں ننگِ اسلام
کچھ نہ اندیشۂ آغاز نہ خوفِ انجام
میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام
وہی مے خانہ و ساقی وہی بادہ وہی جام

مجکو اپنی روشِ خاک سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریاکاری و پندار نہیں

با ہمہ رندی و سرمستی و عشرت طلبی
ہوں درِ احمدِ مرسل کا غلامِ نسبی
مرحبا سیّد مکی مدنیؐ العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کیوں نہ پھر رحمت باری کا طلبگار ہوں میں
ہاں مجھے فخر ہے اس پر کہ گنہگار ہوں میں

وہ رسولِ عربی فخرِ رسولانِ سلف ذاتِ اقدس سے ملا جس کی زمانے کو شرف
جس پہ نازل ہوا قرآن سا کامل مصحف جس کے تابع جن و انساں بھی ملائک کی بھی صف

اک وہی شمعِ نبوّت جو ضیا بار ہوئی
ساری تاریک فضا مطلع الانوار ہوئی

ہر زمانے میں پیمبر بھی نبی بھی آئے مُصلحِ ملّی و ملکی بھی، رشی بھی آئے
حق کے جوئندہ بھی اور حق کے ولی بھی آئے واقفِ محرمِ سرِّ ازلی بھی آئے

آئے دنیا میں بہت پاک مکرّم بن کر
کوئی آیا نہ مگر رحمتِ عالم بن کر

کس نے جامِ مئے توحید پلایا سب کو؟ کس نے پیغامِ مساوات سنایا سب کو؟
راستہ کس نے حقیقت کا دکھایا سب کو؟ کس نے اُس حُسن کا دیوانہ بنایا سب کو؟

تم نے دیکھا ہے بہت دفترِ پیغام اس کا
اور ایسا کوئی گزرا ہو تو لو نام اُس کا

تم میں صدیق سا گزرا ہو تو للّٰہ دکھاؤ تم نے فاروق سا دیکھا ہو تو للّٰہ دکھاؤ
کوئی عثمان سا آیا ہو تو للّٰہ دکھاؤ کوئی حیدر سا جو پایا ہو تو للّٰہ دکھاؤ

ثانیِ احمدِ بے میم تو کیا لاؤ گے
اُس کی اُمّت کی مثالیں بھی نہیں پاؤ گے

غم نہ کر مسلمِ حیرت زدہ و مُہر بہ لب آشنا رنگِ فنا سے نہیں تیرا مذہب

یہ حوادث ہیں ترے تیری ترقی کے سبب
تیرے حامی ہیں نبی تیرا نگہباں ہے رب

فتنے اکثر بہت اس طرح کے اُٹھوائے گئے
ایسے دجّال زمانے میں بہت آئے گئے

پیامِ مستقل (جگر مرادابادی)

نورِ مطلق کی ضیا اس عرش کے تارے میں دیکھ
اپنی خوابیدہ حقیقت دل کے گہوارے میں دیکھ

اعتبارِ حسن پر یہ شورش و مستی تری
کچھ خبر بھی ہے تجھے کیا چیز ہے ہستی تری

ختم ہونے کے قریب آیا ہے افسانہ ترا
خود پیامِ مرگ ہے محدود ہو جانا ترا

قعرِ پستی سے اُبھر اور اپنی خود آواز بن
نغمہ بنتا ہے اگر تو نغمۂ بے ساز بن

تو چھپاتا کیوں ہے اپنے حُسنِ عُریانی کا راز
بوئے گل کی طرح پھیلا دے پریشانی کا راز

اک جدائی کے سبب ہنگامہ برپا ہو گیا
مل گیا دریا سے جب قطرہ تو دریا ہو گیا

تشنگی کو بحرِ ناپیدا کنارِ دل بنا
پھر انھیں موجوں کو تو کشتی بنا ساحل بنا

ہر نفس میں تیرے پوشیدہ ہے مے خانہ ترا
کُل فضائے دہر اک چھوٹا سا پیمانہ ترا

زندگی کا رازِ پنہاں انتشارِ غم میں ہے
اک پیامِ مستقل ہر نغمۂ برہم میں ہے

غم سے وابستہ ہے ہر عنوانِ بابِ زندگی
ہے یہی بسم اللہ اُمّ الکتابِ زندگی

سرورِ حقیقت (جگر مرادآبادی)

میرا نہیں غیر کوئی محرم — سب مجھ میں ہے کائناتِ عالم
غنچوں میں نہاں ہیں میرے اسرار — پھولوں میں عیاں ہیں میرے انوار
ذرّوں میں چمک ہے میرے دم سے — قطروں میں جھلک ہے میرے دم سے
ہر بام ہے کوہِ طور میرا — عالم پہ محیط نور میرا
میں جسم بھی اور جان بھی ہوں — میں دل بھی ہوں اور زبان بھی ہوں
ہے جسم میں سب کے جان مجھ سے — وابستہ ہے کُل جہان مجھ سے
کعبے کی مرے سبب سے بنیاد — بت خانہ میرے قدم سے آباد
ناقوس کہیں، کہیں اذاں ہوں — نغمہ ہوں کہیں، کہیں فغاں ہوں
ہر قلب میں ہے مقام میرا — فیضان ہے سب میں عام میرا
حسن ایک نگاہِ ناز میری — عشق، اک صفتِ نیاز میری
دریا مری چشمِ تر سے پیدا — صحرا مری خاکِ در سے پیدا
کیا اُن کا بیاں کریں زبانیں — محدود نہیں ہیں میری شانیں
ہوش و خرد و ہوس سے باہر — میں اُن کی دست رس سے باہر
اک بحر ہے میرے ظرف میں گم — کُن میرے ہر ایک حرف میں گم
خود موت ہوں خود حیات ہوں میں — خود ذات ہوں خود صفات ہوں میں
سب اصل و مجاز میرے انداز — کونین کا راز میرے انداز
کھلنے پہ جو آئیں میرے اسرار — اوراق ہوں دو جہاں کے بے کار

ایک بات میں سیکڑوں ترنّم — اک چپ میں ہزار ہا تکلّم
چہرے سے جو میں نقاب اٹھادوں — پروانوں کو شمع سے چھڑادوں
دامن کو اگر نچوڑ دوں میں — دریا کا غرور توڑ دوں میں
احساس کی آنکھ سے ہوں مستور — ادراک کی سرحدوں سے ہوں دور
کیوں کہ ہوں مرے شمار عالم — ہر سانس میں ہیں ہزار عالم
لیکن بخدا خدا نہیں ہوں — اس کفر میں مبتلا نہیں ہوں
یہ شانِ عبودیت ہے میری — خود ذات مری صفت ہے میری

پابندِ شریعتِ نبی ہوں
خاکِ درِ دولتِ غنی ہوں

ہمالیہ سے دو دو باتیں (جگر بریلوی)

بھلا مجال کہاں مجھ سے بے زبانوں کی — کہ منہ سے بات کہوں کچھ فلک نشانوں کی
ترے وجود سے عالم یہ ہو گیا روشن — کہ خاکِ ہند میں رفعت ہے آسمانوں کی
وہ پھول ہیں ترے دامن میں سامنے جن کے — بہار گرد ہے دنیا کی گلستانوں کی
گپھاؤں سے تیری نکلیں تو سارے عالم میں — صدائیں گونج اٹھیں توحید کے ترانوں کی
بلندیوں سے تیری وہ رواں ہوئے چشمے — حیات جن سے ہے دنیا کے باغبانوں کی
مئے مجاز میں جو نشۂ حقیقت ہے — وہ یادگار ہے تو عشق کے فسانوں کی
تیری بلندی عزّ و وقار کے آگے — چلی نہ ایک ہوائی جہاز رانوں کی
یہ خامشی، یہ بلندی، یہ جود و شانِ ثبات — تو ہی قدیم نشانی ہے بے زبانوں کی

وہ صور پھونک دے اپنے لبِ مبارک سے ۔۔۔ کہ یاد تازہ ہو بھولے ہوئے فسانوں کی
اٹل ہوں جن کے ارادے خیال جن کے بلند
اُٹھیں اب ایسے زمینِ وطن سے حوصلہ مند

ازل کے روز ستم کا یہ بندوبست ہوا ۔۔۔ کوئی بلند ہوا اور کوئی پست ہوا
اگر فقیر کی قسمت میں بوریا آیا ۔۔۔ تو شاہ کے لئے مسند کا بندوبست ہوا
کسی کا دل نہ بھرا تاج و گنج لے کر بھی ۔۔۔ کسی کے ہاتھ جو کملی لگی تو مست ہوا
کسی کی رفعتِ ہمّت سے تو بھی نیچا ہے ۔۔۔ کوئی وہ ہے کہ خود اپنی نظر میں پست ہوا
خودی پہ غالب و زردار و بامراد مٹے ۔۔۔ ضعیف و بیکس و مسکیں خدا پرست ہوا
اُمیدِ خلد پہ سنیاس کوئی لے بیٹھا ۔۔۔ شرابِ ناب لنڈھائی کسی نے مست ہوا
وفورِ غم سے کوئی زندگی سے عاجز ہے ۔۔۔ کسی کا عیش بڑھا یہ کہ خود پرست ہوا
رہِ نیاز میں کوئی ہے پائمالِ جہاں ۔۔۔ تفنگ و توپ کوئی لے کے چیرہ دست ہوا
غلامِ ساقیِ باطن مکیں پہ شیدا ہے ۔۔۔ خرابِ بادۂ ظاہر مکاں پرست ہو!
زمانہ میں کوئی اک حال پر رہا ہی نہیں
ہماری ذلّت و پستی کی انتہا ہی نہیں

نہ ہوتا آج حمایت پہ تو اگر اپنی ۔۔۔ نہ بھول بیٹھتے راحت میں ہم خبر اپنی
جہاں پہاڑ ہیں لاشیں وہاں نظر آتیں ۔۔۔ بناتے شوق سے سینوں کو ہم سپر اپنی
خیالِ زیست رہ اتحاد بن جاتا ۔۔۔ نفاقِ قوم سے بنتی نہ جان پر اپنی
رگوں میں خون سروں میں جنون بڑھ جاتا ۔۔۔ پناہ دیتی ہمیں قوّت جگر اپنی
بلندیاں تیری ہوتیں نہ سدِّ راہ اگر ۔۔۔ تو گھوم پھر کے نہ رہتی یہیں نظر اپنی

مثالِ موج ہوا ہم رواں دواں پھرتے.. بساط پھیلتی سارے جہاں پر اپنی
جہان بھر کی حمایت پہ ہم تلے ہوتے . جو ہوتی ہاتھ میں تلوار اور سپر اپنی
نکل کے گھر سے جنھوں نے کیا جہاں بیدار نہ دے سکے وہ سلف ہم کو کچھ خبر اپنی
تو ہی تو مانعِ الطافِ آسمانی ہے تیرے سبب سے ہے فریاد بے اثر اپنی

اگر بڑا ہے تو چھوٹوں کی بات بھی سُن لے
کسی کا قصّہ دردِ حیات بھی سُن لے

ہوا ہے تجھ کو اگر قربِ آسماں حاصل تو بیکسوں کی نہ فریادِ غم میں ہو حائل
کسی کے رنج سے پانی نہ ہو تو کیا ہے جگر کسی کے غم پہ نہ روئے لہو تو کیا ہے دل
کسی کے کام نہ آئے تو کیا بلندی ہے نہ جائے پستیِ ہندی تو تجھ سے کیا حاصل
نباہنا حقِ ہمسائیگی اگر ہے تجھے ہمارے ساتھ تڑپ تو بھی صورتِ بسمل
رگوں سے خون کے دریا بہا کے دکھلا دے ہٹا کے سنگِ جگر ناخنوں سے کر گھائل
یہی ہے فرض یہی اقتضا مروّت کا دکھا دے عرش پہ تو چیر کر ہمارا دل
رگوں کو کاٹ کے اک اک نشان دکھلا دے جہاں جہاں ہے وہ زخمی جہاں جہاں گھائل
بیانِ قصّۂ غم ہو رقیبِ صبر و قرار فغانِ درد سے ہل جائیں قدسیوں کے دل
تڑپ تڑپ کے نہ آہوں سے چین لینے دے کرم یہ اپنے نہ جب تک کہ عرش ہو مائل

جو یہ نہیں تو سرک جا نظر کے آگے سے
دعا کا وقت ہے ہٹ جا جگر کے آگے سے

ہمالیہ کا جواب

ہمالیہ نے سنا جب یہ دلخراش کلام . بھر آئے دیدۂ پرنم میں اشکِ لالہ فام

اک آہ سرد بھری اور یوں ہوا گویا
عبث گیا ہے مجھے تو نے مورد الزام

محبّ و محسن و ہمدرد و دستگیر و شفیق
زیادہ مجھ سے کوئی ہند کا ہے تو لے نام

ازل سے میں نے جو انجام خدمتیں دی ہیں
نہ پوچھ مجھ سے کہ واقف ہیں سب خواص و عوام

عذاب ہند سے آٹھوں پہر تڑپتا ہوں
تپ دروں سے یہ سینہ ہے محشر آلام

وہ غم ہے اُف کہ کلیجے میں پڑ گئے ناسور
رواں ہے دیدۂ پُر نم سے سیل اشک مدام

فلک کی سمت ہے رخ ایک پاؤں پہ ہوں کھڑا
یہی دعا ہے شب و روز اور صبح و شام

رحیم رحم کہ ہندی بھی تیرے بندے ہیں
زمانہ ہو گیا سہتے ہوئے انھیں آلام

پڑے ہوئے ہیں غریبوں کی جان کے لالے
مٹائے دیتی ہے اب انکو گردش ایّام

دکھا دے شان کرم جلد اے غفور رحیم
مٹا دے ان کے ستارے سے کلفت ایّام

وہاں سے آتی ہے رہ رہ کے آہ یہ آواز
بھلا دیا ہے تیرے ہند نے ہمارا پیام

اُٹھا کے رکھا ہے ویدوں کو طاق نسیاں پر
فسانہ کر دئے گیتائے پاک کے احکام

تمام قوم وہ آداب بھول بیٹھی ہے
کبھی تھا جن سے یہ خطّہ بھی قدسیوں کا مقام

نہ نام ہے کہیں اخلاق کا نہ ایماں کا
نہ حوصلے نہ کہیں حوصلوں میں استحکام

نہ دل میں بوئے وفا ہے نہ پاس غیرت ہے
نہ رنگ چہرے پہ اپنا ہے اور نہ اپنا نام

قدیم رنگ محبّت سے شرم آتی ہے
نئے بتوں کے ہیں بندے نئی ادا کے غلام

جگر میں درد نہ سینوں میں جوش ہے باقی
پیا ہے بادۂ تہذیب نو کا جب سے جام

کچھ اس طرح مئے پندار کے ہیں متوالے
کہ ایک بھائی کا چھونا ہے دوسرے کو حرام

بنے ہیں ایک سے یہ صد ہزار قوموں میں
تو ہی بتا دے کہ کیا ہے نفاق کا انجام

کہیں بھی ان میں رہی بوئے قومیت باقی
غلط ہے دے جو انھیں کوئی ہندیوں کا نام

مگر وہ غیرت و عصمت کی دیویاں جن سے — وفائے ہند کو حاصل ہوئی حیاتِ دوام
اُنھیں کی فرض شناسی انھیں بچائے ہے — وگرنہ مٹ گیا ہوتا جہاں سے ان کا نام
اگر ہے پاس تجھے اِن کی زندگانی کا — تو جاکے دے میری جانب سے تو انھیں یہ پیام

جہاں ہے دین وہیں عیشِ کامرانی ہے
وہیں بقا ہے وہیں فیضِ آسمانی ہے

بسنت (جگر بریلوی)

آگیا پھر موسموں کا تاجدار — دیدنی ہے کوہ و صحرا کی بہار
پھٹ پڑا ہے حسن باغ و راغ میں — کچھ نہیں ہے فرق بن اور باغ میں
صاف ستھری جانِ نظارہ فضا — آسمانِ نیلگوں نکھرا ہوا
ہر شجر پہنے ہے پیراہن نیا — سبز اور شاداب جنگل ہو گیا
فیضِ شبنم سے نکھر آئی ہے گھاس — دھل گیا ہے بوٹے بوٹے کا لباس
سبزہ و گل سے ٹپکتی ہے شراب — ہے نمو کا جوش یا جوشِ شباب
ہر کلی پیالی ہے گل پیمانہ ہے — گلستاں ہے یا کوئی مے خانہ ہے
جوش پر نشو و نمائے رنگ ہے — عرصۂ ارض و سما بھی تنگ ہے
آتشِ گل سے چمن دہکا ہوا — بو سے پھولوں کی ہے بن مہکا ہوا
ہر طرف ہے غنچہ و گل کا ہجوم — مچ رہی ہے طائروں کے غل سے دھوم
پھرتے ہیں ہر سمت اتراتے ہوئے — ڈالی ڈالی کی ہوا کھاتے ہوئے
اپنے دامن میں لئے موجِ شمیم — پھرتی ہے اٹھکھیلیاں کرتی نسیم

آتی ہے سبزہ کو لہکاتی ہوئی
جاتی ہے کلیوں کو چٹکاتی ہوئی

ہے ہوا میں کیفِ صہبائے کہن
پھر رہے ہیں مست طاؤس و ہرن

کوک وہ کوئل کی موروں کی جھنکار
جان لیوا وہ پپیہے کی پکار

آم کے اشجار میں بور آ گیا
آم کی یاد آئی جی للچا گیا

کھل گئے شفاف جھیلوں میں کنول
بھونرے بو پاتے ہی آئے ہیں نکل

پھرتے ہیں خوش مے پرستوں کی طرح
گرتے ہیں پھولوں پہ مستوں کی طرح

بن میں یہ ہر سمت ٹیسو کھل گیا
یا بھڑک اٹھا ہے شعلہ حسن کا

ڈھاک میں اتنا نمو کا جوش ہے
سر سے پا تک سرخ ہے گل پوش ہے

سرسوں پھولی ہے بسنتی ہے زمیں
منظرِ رنگیں ہے کتنا دل نشیں

سادگی بھی اس میں ہے خوبی بھی ہے
حسنِ تمکیں شانِ محبوبی بھی ہے

سبزہ و گل میں ہے جس سے جوشِ رنگ
ہے وہی انسان کے دل میں امنگ

ہے عجب یہ موسم حسن آفریں
خار بھی ہوتے ہیں اس رت میں حسیں

حسن کی بجلی کو چمکاتا ہے یہ
عشق کے شعلوں کو بھڑکاتا ہے یہ

بادِ صحرا میں ہے تاثیرِ شباب
بڑھ رہا ہے دل میں شوق و اضطراب

ولولوں میں جوش پیدا ہو چلا
بادیہ گردی کا سودا ہو چلا

وطن (چکبست لکھنوی)

یہ پیاری انجمن ہم کو مبارک
یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے　　یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

جو چڑیاں صبح کو گاتی ہیں اکثر　　اسی کا راگ ہے ان کی زباں پر
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ ساون کے مہینے کی گھٹائیں　　وہ کوئل اور پپیہے کی صدائیں
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ اک مستی کا عالم بادلوں میں　　وہ پھولوں کا مہکنا جنگلوں میں
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وہ چشمے اور وہ امرت سا پانی　　وہ گنگا اور جمنا کی روانی
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

درختوں پر وہ چڑیوں کا چہکنا　　وہ بیلے اور چمیلی کا مہکنا
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

نذرانۂ روح (چکبست)

تیرا بندہ رہے دل سے یہی پیماں رہا　　طائرِ فکر ترے اوج سے حیران رہا
قدر کرنا تری سیکھیں یہی ارماں رہا　　یہی مسلک یہی مذہب یہی ایمان رہا

آبرو کیا ہے تمنّائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا — حسرتِ آبادِ جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا
میں کہوں گا کہ بس اک رہبر کامل پایا — زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا
لے گیے دنیا سے یہی مہر و وفا آیا ہوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

قوم کی لڑکیوں سے خطاب (چکبست)

روشِ خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم — تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں — ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
خود جو کرتے ہیں زمانے کی روش کو بدنام — ساتھ دینا نہیں ایسوں کا زمانا ہرگز
پوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا — اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں — یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
اُن کی تعلیم کا مکتب ہے تمھارا زانو — پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو — دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے — راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز
گو رگوں میں تمھارے نہ ہو اس وقت کا رنگ — ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رلانا ہرگز
ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

دردِ دل (چکبست)

چمنِ عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب
خُم میں باقی نہ رہے گی یہ جوانی کی شراب
نشۂ علم میں ہر وقت رہو تم غرقاب
شانِ تعلیم یہی ہے یہی تہذیبِ شباب
لے اُڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پیے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

مست کر دیتی ہے ایسا یہ شراب سرجوش
نظر آتی ہے مے حسن سے دنیا مدہوش
سیرِ جنت میں رہا کرتے ہیں چشم ولب و گوش
مجھ سے کہتا تھا جوانی میں مرا بادہ فروش
ہر گھڑی عالمِ بالا پہ نظر رہتی ہے
کہیں انسان کو دنیا کی خبر رہتی ہے

خاکِ ہند (چکبست)

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن میں
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

سب سُورَبیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُن کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک اُن کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوسِ گوش اب تک کیفیّتِ اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گُل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا
اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

مُردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر
شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گُل مبارک گُل کو چمن مبارک ہم بے کسوں کو پیارا اپنا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے
ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا آنکھوں کی روشنی ہے جلوا اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کُہن کا تُلتا ہے برگِ گُل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

ترانہ (چکبست)

یہ ہندوستان ہے ہمارا وطن محبّت کی آنکھوں کا تارا وطن
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
وہ اس کے درختوں کی تیاریاں وہ پھل پھول پودے وہ پھلواریاں
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
وہ ساون میں کالی گھٹا کی بہار وہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوہار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

وہ باغوں کی کوئل وہ جنگل کے مور   وہ گنگا کی لہریں وہ جمنا کا زور
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
اسی سے ہے اس زندگی کی بہار   وطن کی محبت ہو یا ماں کا پیار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

تعلیم
(حالی)

وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے   اگر میری نہ مانو گے تو پچھتاؤ گے نادانو
مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو   خبر تم کو بھی ہے کچھ اے مری چالوں سے بیگانو
گئے وہ دن کہ نفریں کرتے تھے دیں دارِ دنیا پر   بقائے دین و ملت منحصر دنیا پہ اب جانو
گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے   بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ اے تن آسانو
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنر یاں عیش کرتے تھے   ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل مری مانو
مٹے ہو جس ہنر اور فن پہ تم وہ مٹنے والے ہیں   یہ سودا کب تک اے شمعِ سحر گاہی کے پروانو
بھرا سمجھے ہو جس گھر کو نہیں یارو وہاں کوئی   کہاں بیٹھے ہو تم اے خانۂ ویراں کے دربانو
نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری   جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ ان کو   کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صنعت میں   نہ چل سکتی ہے اب بے علم تجاری نہ معماری
جہاں علمِ تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر   تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری

نہ آئے گی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت — جنھیں پائیں گے آقا زیورِ تعلیم سے عاری
اگر چاہیں گے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی — تو دینا ہوگا اُن کو امتحانِ علمِ بیطاری
نہ مستغنی رہے گا وِل علم سے ہے اب نہ باورچی — ہوا ہے مدرسوں سے مطبخوں تک فلسفہ جاری
یقیں جانو کہ آئندہ ملے گی درس گاہوں میں — گر آٹا پیسنے کو چاہئے گی اک پسنہاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز — نہ فصّادی نہ جرّاحی نہ کحّالی نہ عطّاری

جہاں تک دیکھئے تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

تعصّب و انصاف (حالی)

یاد ہے ہم کو وہ عالم اپنا — جبکہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا
اپنی جو بات تھی خوش آتی تھی — اپنی ایک ایک ادا بھاتی تھی
اپنا ہر آن پہ ہم مرتے تھے — اپنی رعنائی کا دم بھرتے تھے
اپنے انداز کے سودائی تھے — اپنے جلوے کے تماشائی تھے
کان کو اپنی ہی بھاتی تھی الاپ — سر دھنا کرتے تھے ہم آپ ہی آپ
آپ خوبی پہ تھے اپنی مفتوں — خود ہی لیلیٰ تھے ہم اور خود مجنوں
جس جزیرے میں ہوئے تھے پیدا — اپنی لے دے کے وہی تھی دنیا
روم کی تھی نہ خبر شام کی تھی — آگہی طوس نہ بسطام کی تھی
تھے تماشائیِ دشتِ پُرخار — کبھی گلشن کی نہ دیکھی تھی بہار
پیکے شور آب ہی ہوتے تھے بحال — کہ نہ چکّھا تھا کبھی آبِ زلال

نالۂ زاغ و زغن پر تھے فدا — نہ سنی تھی کبھی بلبل کی صدا
سیر وانگور کی بو پر تھے نثار — گہ نہ سونگھا تھا کبھی مشکِ تتار
پرنیاں جانتے تھے کمبل کو — گہ نہ برتا تھا کبھی مخمل کو
اوپری تھی نہ سنی بات کبھی — بدلے دیکھے تھے نہ دن رات کبھی
ہم بسر کرتے تھے جس عالم میں — واں سماں ایک تھا ہر موسم میں
رخ ہوا کا نہ بدلتا تھا کبھی — موسم آ کر نہ نکلتا تھا کبھی
ایک ہی فصل پہ تھا دار و مدار — واں خزاں جا کے نہ آتی تھی بہار
ایک سے رہتے تھے دن رات سدا — آسماں کو تھی نہ گردش اصلا
تھی سمجھ پیر و جواں کی یکساں — عقل تھی خورد و کلاں کی یکساں
رکھتے تھے ایک سبق از بر یاد — مبتدی منتہی شاگرد استاد
واں نہ تھی حدِ بلوغِ صبیاں — پیر بالغ تھے نہ بالغ تھے جواں
نئی بولی کا وہاں حرف نہ تھا — تیس حرفوں کے سوا حرف نہ تھا
تھے خدا کے وہی ننانوے نام — اور لینا تھا وہاں نام حرام
اہلِ دولت کی نہ تھی عام عطا — ایک ہی سمت برستی تھی گھٹا
تھا نہ دینداروں کو غیروں سے لگاؤ — ایک ہی سمت تھا رحمت کا جھکاؤ
وعدے غیروں کے تھے سب بے صرفہ — فیصلے ہوتے تھے سب یک طرفہ
راستی کا تھا نہ غیروں پہ گماں — حق نہ دائر تھا فریقین میں واں
تھے عناصر نہ وہاں آگ نہ باد — خلق سے اک موئی مٹی تھی مراد
حس و حرکت کے کوئی پاس نہ تھا — واں کا حیوان بھی حساس نہ تھا

تھی درختوں کو نہ واں نشو و نما
چلنے پاتی تھی نہ گلشن میں ہوا

گل شگفتہ تھے نہ پودے شاداب
وہاں زمانہ پہ نہ آتا تھا شباب

وہی مرغوب تھی واں پوشش تن
جس سے آدم نے چھپایا تھا بدن

تھے پسندیدہ اسی شان کے گھر
کی تھی حوّا نے جہاں عمر بسر

اسی انداز کے چلتے تھے جہاز
کشتی نوح کا تھا جو انداز

تھی اسی نسخے پہ موقوف شفا
جو تھا بقراط نے ترتیب دیا

ٹوٹ سکتی نہ تھی واں رائے قدیم
تھا امٹ لکھ گئے جو اگلے حکیم

واں کسی طرح نہ ممکن تھا خلل
واں نہ پانی تھا مرکّب نہ ہوا

گھوڑے دوڑائے تھے اگلوں نے جہاں
وہی جولان گہہ مردم تھی وہاں

کی تھی جس جا قدما نے منزل
بڑھنے پاتے تھے نہ واں سے محمل

علم و فن تھے نئے سارے مردود
غیب کے واں تھے خزانے محدود

نئی لذّت سے تھی ہر طبع نفور
نعمتیں حق کی وہاں تھیں محصور

سب کی گُدّی پہ لگی تھیں آنکھیں
کچھ نہ آگے نظر آتا تھا انہیں

پیچھے گر دیکھتے تھے ریگستاں
سوجھتا تھا انہیں وہ آب رواں

آگے ہوتا تھا اگر چشمۂ آب
وہ سراسر نظر آتا تھا سراب

روشنی رکھتی تھی ان سے ان بن
جیسے خفّاش سے سورج کی کرن

تھا لکیر اپنی پہ ایک ایک فقیر
دل پہ ہر نقش تھا پتھر کی لکیر

رسم و عادت نہ بدلتی تھی وہاں
برف جم کر نہ پگھلتی تھی وہاں

آگ واں بجھ کے سلگتی کم تھی
اور سلگتی تھی تو لگتی کم تھی

شان میں واں نہ سنا تھا حق کی — کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شان کبھی
وضع میں تھا نہ تغیّر خو میں — جائے دل سنگ تھا ہر پہلو میں
سمجھا جاتا تھا وہ دل بے فرماں — مہر جس دل پہ نہ ہوتی تھی وہاں
بات مشکل تھی دلوں سے جاتی — نقش تھے دل کے خطِ پیشانی
غیر کی بات خطا اپنی صواب — سب سوالوں کا تھا واں ایک جواب
چڑھ گئے گر بحث کو جاتے تھے کہیں — فتح کا پہلے سے ہوتا تھا یقیں
تھی وہاں حق کی یہی ڈفینیشن — موںھ سے جو اپنے نکل جائے سخن

اسی عالم میں پلے تھے ہم بھی
اُسی ساون کے تھے اندھے ہم بھی

جانتے تھے کہ جہاں میں ہم پر — ختم ہیں سارے کمالاتِ بشر
حق نے جو ہم پہ کئے ہیں احساں — اُن سے محروم ہے نوعِ انساں
سب سے ہر بات میں ہم ہیں افضل — اب نہیں کوئی ترقّی کا محل
اپنے حصّے میں ہے ساری تہذیب — خانہ پرور ہے ہماری تہذیب
جو قدیم اپنا چلن ہے اور چال — خُردہ گیری کی نہیں اُس میں مجال
ہے بری عیب سے خوراک اپنی — پاک دھبّے سے ہے پوشاک اپنی
رسم اپنی نہیں بے جا کوئی — طور اپنا نہیں بھونڈا کوئی
آدمیّت کے ہمیں ہیں مصداق — ہم سے سیکھے کوئی حسنِ اخلاق
سب سے عالی ہیں خیالات اپنے — سب مسلّم ہیں کمالات اپنے
ہم چلے جاتے ہیں جس رستے پر — واں نہ کھٹکا ہے کہیں کا نہ خطر

تھے سمائے ہوئے جو دل میں خیال
تھا تصور بھی خلاف اِن کے محال

جس کو اک بار تھا جان لیا
عمر بھر پھر اُسے اچھا نہ کہا

ٹوٹتی تھی نہ کبھی اپنی دلیل
وہی دعوئ تھا وہی اپنی دلیل

وہم و شک کی کوئی صورت ہی نہ تھی
ہم کو تحقیق کی حاجت ہی نہ تھی

جو بدلتی تھی نہ بدلی تھی کبھی
رائے ایسی تھی پسند ایسی تھی

ہم سمجھتے تھے نہ سمجھانے سے
اور الجھ جاتے تھے سلجھانے سے

سچ وہی تھا جسے سچ جان لیا
جھوٹ تھا جھوٹ جسے جان لیا

حق و باطل کی یہی تھی میزاں
جھوٹ اور سچ کی یہی تھی پہچان

ذاتِ باری کو نہیں جیسے زوال
رائے اپنی بھی بدلنی تھی محال

کوہ ہٹ جائے تو یہ تھا ممکن
ہم نہ ہٹتے تھے جگہ سے لیکن

حسنِ ظن تھا یہ سمجھ پر اپنی
غلطی کا تھا گماں تک نہ کبھی

تھے لڑکپن سے خیالات تمام
دل میں اُترے ہوئے مثلِ الہام

دیکھتے سنتے تھے جو اس کے خلاف
نظر آتا تھا وہ سب لاف و گزاف

تھی نئی بات سے یاں تک نفرت
ہوتی تھی سننے سے پہلے وحشت

بو نئی شے کی جو پا لیتے تھے
ناک بن دیکھے چڑھا لیتے تھے

عقل کی تھیں نہ صلاحیں مقبول
تھی وہ سرکار میں اپنی معزول

فکر پر زور نہ ڈالا تھا کبھی
ہوش ہم نے نہ سنبھالا تھا کبھی

جو کہ تھا اپنی کتابوں میں لکھا
کوئی حرف اس میں بجز الہام نہ تھا

جو کہانی تھی بزرگوں نے کہی
تھا وہی فلسفہ اور علم وہی

تھا لباسوں میں لباس اپنا لباس
اور سب سوختنی بے وسواس

تھی زباں اپنی زبانِ پاکاں
ماسوا اہلِ جہنم کی زباں

جلوۂ دہر کا باقی تھا نہ ہوش
تھے نشے میں یہ خودی کے مدہوش

کان میں پڑتی تھی جب بات نئی
غیر ہو جاتی تھی حالت دل کی

خرقِ عادت بھی اگر دیکھتے تھے
آنکھ اٹھا کر نہ اُدھر دیکھتے تھے

نئی آواز سے چونک اٹھتے تھے
اور پری شکل پہ پھونک اٹھتے تھے

ساری دنیا سے نرالا تھا مذاق
ہم کو تھا زہر بھی اپنا تریاق

اپنی حجت کو قوی جانتے تھے
بات ہر پھر کے وہی مانتے تھے

تھا نہ قصدِ حق و باطل مطلق
جو پڑھا تھا وہی ازبر تھا سبق

خصم سے بحث اگر کرتے تھے
حق سے ہم قطعِ نظر کرتے تھے

کاٹ دی خصم نے جو بات کہی
بحث و تکرار کی غایت تھی یہی

حق کا خطرہ جو کبھی آتا تھا
نفس آپ اپنے کو جھٹلاتا تھا

دشمنی کے یہی معنی تھے کہ جو
ہم کہیں بات وہ تسلیم نہ ہو

ہم اندھیرے کو اگر کہتے تھے نور
دوستوں کو یہی کہنا تھا ضرور

گر خلاف اپنے کوئی بول اُٹھا
اُس سے بڑھ کر کوئی بدخواہ نہ تھا

ذکر غیروں کا نہ تھا بے نفرین
کوئی مردود تھا اور کوئی لعین

غیر کے واسطے تھی نارِ سعیر
باغِ فردوس تھی اپنی جاگیر

اور تھے حرص و ہوا کے بندے
ہم تھے مخصوص خدا کے بندے

بخششیں ختم تھیں ساری ہم پہ
وقف تھی رحمتِ باری ہم پر

نیک اعمال تھے غیروں کے تباہ
اور مغفور تھے سب اپنے گناہ

عینِ تحقیق تھی اپنی تقلید
شرک اپنا تھا سراسر توحید

تھا بدی کا نہ گنہ کا کچھ ڈر
پاس ایسی کوئی رکھتے تھے سپر

سب دعا گو تھے ہمارے ملکوت
تھے ہمیں آدم و حوّا کے سپوت

حوضِ کوثر پہ تھا قبضہ اپنا
سلسبیل اپنی تھی طوبیٰ اپنا

اپنی ظلمت تھی سراسر تنویر
اپنے اندھوں کو بھی کہتے تھے بصیر

رکھتے جنّت میں نہ تھے ہم ساجھی
غیر ناری تھے سب اور ہم ناجی

تھے قضا اور قدر کے مالک
ہم تھے اللہ کے گھر کے مالک

عصبیت میں رہے جب تک چور
کھینچتے یوں ہی رہے آپ کو دور

نظر آتا تھا نہ کچھ پست و بلند
تھے ہم ایک کلبۂ تاریک میں بند

دی جب انصاف نے دستک آکر
حجرۂ تنگ سے نکلے باہر

جلوۂ علم و یقیں کو دیکھا
آسماں اور زمیں کو دیکھا

رخ حقیقت نے دکھایا ہر سو
چاندنا سا نظر آیا ہر سو

کی تعصّب سے جو ہیں قطع نظر
ہوا ایک اور ہی عالم میں گزر

علم پر تھا نہ جہاں کوئی حجاب
دھوکا پانی کا نہ دیتا تھا سراب

جھوٹ سے سچ نظر آتا تھا الگ
دودھ پانی نظر آتا تھا الگ

نکتہ چیں یار تھے واں یاروں کے
قدرداں غیر تھے اغیاروں کے

دور بیگانہ نہ تھا خویش سے واں
خویش اوّل تھا نہ درویش وہاں

عیب سب کہتے تھے اپنے خوش خوش
دوغ واں اپنی بھی ہوتی تھی ترش

تھی تجسس کوئی نہ انساں کی زباں
گاڈ بھی کہتے تھے اللہ کو واں

حق کی پہچان جز اخلاص نہ تھی
حق کی پوشش کوئی واں خاص نہ تھی

ساتھ اغیار کے کھاتے تھے اگر
کبھی ایماں کا نہ ہوتا تھا ضرر

صلحا لیمپ جلاتے تھے وہاں
اتقیا میز پہ کھاتے تھے وہاں

نہ سمجھتا تھا وہاں کوئی بشر
آپ کو نوعِ بشر سے بہتر

بھائی انساں تھے سب انسانوں کے
میت ہندو تھے مسلمانوں کے

ایک معدن کے تھے سب لعل و گہر
ایک ڈالی کے تھے سب برگ و ثمر

اشعری۔ معتزلی۔ لامذہب
ایک ماں باپ کی اولاد تھے سب

اپنی ہر رائے پہ کرنا اصرار
کفر واں بس یہی پایا تھا قرار

ہٹ سے باز آتے نہ تھے جو زنہار
تھے وہ بوجہل کی اُمّت میں شمار

پاؤں واں جن کے پھسل جاتے تھے
خود پھسل کر وہ سنبھل جاتے تھے

ٹیڑھ وہاں دل کی نکل سکتی تھی
رائے اپنی بھی بدل سکتی تھی

دیکھ حجت کو قوی پیرو جواں
بند ہو جاتے تھے بحثوں سے وہاں

حق کی آواز جہاں آتی تھی
مت کروروں کی بدل جاتی تھی

تھی وہاں عقل معطّل نہ حواس
سب قویٰ کام میں تھے بے وسواس

آنکھ رہ سکتی نہ تھی بن دیکھے
کان سننے سے نہ باز آتے تھے

عرشِ تحقیق تھا استھان اُن کا
مصر بیرت تھا نہ یوناں اُن کا

دیکھا جب عالمِ انصاف کا رنگ
ہم کو خود آنے لگا آپ سے ننگ

خوبیاں اپنی تھیں جو ذہن نشیں | اُن پہ ہم کرنے لگے خود نفریں
عیب سب اپنے نظر آنے لگے | آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے
ہوئی وہ بزمِ خیالی برہم | تھا طلسمات کا گویا عالم
جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا | اک وہ ناچیز سا قطرہ نکلا
تھا گیا جس کو یقیں چشمۂ آب | وہ نمائش تھی حقیقت میں سراب
قصر و الواں کا گماں تھا جس پر | نکلے آخر وہ گڑھے اور کھنڈر
جب ہر اک قوم کا ساماں دیکھا | ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا
نکلے سب ہیچ خیالات اپنے | ٹھہرے سب پوچ کمالات اپنے
آپ کو اونٹ سمجھتا تھا بڑا | نکلا جب تک کسی گھاٹی سے نہ تھا
چوٹیاں آئیں جو پربت کی نظر | پھر اُٹھایا نہ کبھی اونٹ نے سر
جھنگا جب تک رہا گولر میں نہاں | تھا وہی اس کے تصور میں جہاں
پر وہ گولر سے جو باہر آیا | اپنی ہستی سے بہت شرمایا
پردہ جب تک رہا آنکھوں پہ پڑا | حسن پہ اپنے گماں تھے کیا کیا
منہ جب آئینے میں دیکھا جا کر | ہم کو اک شکلِ مہیب آئی نظر
ہوا حیرت سے دگرگوں احوال | ڈر گئے دیکھ کے اپنے خط و خال
دیکھا جب آپ کو بالکل معیوب | چھپ گئے غیروں کے آنکھوں سے عیوب
یک قلم ہو گئی نخوت کافور | بن گیا رشک ہمارا وہ غرور
ناخنِ فکر نے کی دل میں خراش | عیب جوؤں کی لگے کرنے تلاش
جن کے طعنوں کی تھی ہم پر بھرمار | اُن کے ہم دل سے ہوئے شکرگزار

ہم نے جانا کہ یہی ہیں دل سوز
چل رہے تیر ہیں جن کے دل دوز

انھیں بندوں کے ہیں ایمان سچے
یہی کافر ہیں مسلمان سچے

بے خبر کب سے پڑے سوتے تھے
اُن کی آواز سے ہم چونک اُٹھے

ان کے طعنوں نے جگایا ہم کو
زہر نے ان کے جلایا ہم کو

حق کے جلوے نظر آئے ہر جا
اہلِ باطل میں بھی اک پائی ادا

ملا ہر راہ میں باطل کا سراغ
اہلِ حق کو بھی نہ پایا بے داغ

اہلِ تقویٰ کی ریائیں دیکھیں
اہلِ حکمت کی خطائیں دیکھیں

زشتیاں دیکھیں نکوکاروں میں
خوبیاں پائیں گنہ گاروں میں

ہنر اغیار میں پائے اکثر
عیب اپنے نظر آئے اکثر

مجلسیں غیبت و بہتان سے پُر
صحبتیں جھوٹ کے طوفان سے پُر

منقطع بھائی کی بھائی سے اُمید
اپنا بیگانہ ہو سب کے سفید

فقرا مکر و ریا کے پتلے
اغنیا حرص و ہوا کے پتلے

شیخ عیّار تو زاہد پُرفن
مولوی عقل کے سارے دشمن

حالت القصہ جو دیکھی اپنی
کوئی کل پائی نہ سیدھی اپنی

سارے آوے کو ٹٹولا جا کر
کوئی برتن نہ سڈول آیا نظر

پایا اک دین کا محکم قانون
وہ بھی یاروں کی بدولت مطعون

دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالتِ زار
جی بھر آیا نہ رہا صبر و قرار

گو نہ تھا تلخ نوائی کا محل
آہیں دو چار گئیں دل سے نکل

تلخ گزرے جو کسی کو یہ صدا
حق میں تلخی کے سوا اور ہے کیا

حبِّ وطن (حالی)

اے سپہرِ بریں کے سیّارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا — اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری — اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو — دہرِ ناپائیدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رُمنا — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم مری دل لگی کے ساماں تھے — تم مرے دردِ دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی — تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن ایک اک تمھاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی
کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری — دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے — ہو کے خوش حال گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب — دھو کے اُٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں — سب مری دلگی کی شکلیں تھیں
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بہ خود بے زار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے — نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال — شبِ مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا — جس طرف جائیں جی نہیں لگتا

کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں
تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور
یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور

گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا
پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے مورد آلام
تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا
تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا
اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ہو گیا یہاں تو دو ہی دن میں یہ حال
تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے
یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار
یا کہ دنیا ہے تیری عاشقِ زار

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں
اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کو نمو تجھ سے
روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشوونما
سب کو بھاتی ہے تیری آب وہوا

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

قدر اے دل وطن میں رہنے کی　　　پوچھے پردیسیوں کے جی سے کوئی
جب ملا رام چندر کو بن باس　　　اور نکلا وطن سے ہو کے اُداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر　　　پر چلا ساتھ لے کے داغِ جگر
پاؤں اُٹھتا تھا اسکا بن کی طرف　　　اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گزرے غربت میں اس قدر مہ و سال　　　پر نہ بھولا اجودھیا کا خیال
دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا　　　دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا　　　آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا
کٹنے چودہ برس ہوئے تھے محال　　　گویا ایک ایک جُگ تھا ایک ایک سال

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی　　　سیدِ ابطحی کے ہمراہی
رشتے الفت کے سارے توڑ چلے　　　اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا　　　پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل لگی کے بہت ملے سامان　　　پر نہ بھولے وطن کے ریگستان
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے　　　سنگریزے زمینِ بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کی چھوٹا تھا　　　دل سے رشتہ نہ ان کا ٹوٹا تھا

ہم بھی حُبِّ وطن میں گو ہیں غرق　　　ہم میں اور ان میں ہے مگر یہ فرق
ہم ہیں نامِ وطن کے دیوانے　　　وہ تھے اہلِ وطن کے پروانے
جس نے یوسف کی داستاں ہے سنی　　　جانتا ہوگا روئداد اُس کی
مصر میں قحط جب پڑا آ کر　　　اور ہوئی قوم بھوک سے مضطر
کردیا اُن پہ وقف بیت المال　　　لب تک آنے دیا نہ حرفِ سوال

کھتّیاں اور کوٹھے کھول دیئے
مفت سارے ذخیرے تول دیئے

قافلے خالی ہاتھ آتے تھے
اور بھر بوریاں سے جاتے تھے

یوں گئے قحط کے وہ سال گزر
جیسے بچّوں کی بھوک وقتِ سحر

اے دل اے بندۂ وطن ہشیار
خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار

او شرابِ خودی کے متوالے
گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے

نام ہے کیا اِسی کا حُبّ وطن
جس کی تجکو لگی ہوئی ہے لگن

کبھی بچّوں کا دھیان آتا ہے
کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے

یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی
تو کبھی اہل شہر کی ہے لگی

نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار
پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار

کیا وطن کی یہی محبّت ہے
یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے

اس میں انسان سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

جا کے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آ کے کابل سے یاں بہی و انار
ہو نہیں سکتے بار ور زنہار

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے

آگ سے جب ہوا سمندر دور
اُس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
جان کے لالے اُن کے پڑتے ہیں

گائے یا بھینس اونٹ یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہئے حبِّ وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کم تر

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوعِ انسان کا جس کو سمجھیں فرد

جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح
جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

سمجھے اُن کی خوشی کو راحتِ جاں
واں جو نوروز ہو تو عید یہاں

رنج کو اُن کے سمجھے مایۂ غم
وہاں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم

بھول جائے سب اپنی قدرِ جلیل
دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل

جب پڑے اُن پہ گردشِ افلاک
اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ
دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ

پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک
کرو دامن سے تا گریباں چاک

کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ
ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ

کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار
زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا
اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو
وہاں میسّر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی
جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ
کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر

سب کو ہے ایک اصل سے پیوند — کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند
مقبلو مدبروں کو یاد کرو — خوش دلو غم زدوں کو یاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر — لو جو لی جائے کو رو کر کی خبر
تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو — لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو
تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ — رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی — جین مت ہووے یا ہو بیشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتّفاق سے آزاد — شہر ہیں اتّفاق سے آباد
ہند میں اتّفاق ہوتا اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتّفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی
پاؤں اقبال کے اُکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا — کبھی درّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتلِ عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی

قوم سے جو تمھارے ہیں برتاؤ
سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ

اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا
کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا

شہر میں قحط کی دہائی ہے
جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے

بھوک سے ہے کوئی نڈھال پڑا
موت کی مانگتا ہے کوئی دعا

بچے اک گھر میں بلبلاتے ہیں
رو کے ماں باپ کو رُلاتے ہیں

کوئی پھرتا ہے مانگتا در در
ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر

پر جو ہیں اُن میں صاحبِ مقدور
اُن میں گنتی کے ہوں گے ایسے غیور

کہ جنھیں بھائیوں کا غم ہوگا
اپنی راحت کا دھیان کم ہوگا

جتنے دیکھو گے پاؤ گے بے درد
دل کے نامرد اور نام کے مرد

عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات
عید ہے دن تو شبرات ہے رات

قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے
کام اُنھیں اپنے حلوے مانڈے سے

ان کو اب تک خبر نہیں اصلا
شہر میں بھاؤ کیا ہے غلّے کا

غلہ ارزاں ہے ان دنوں کہ گراں
کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں

کال کیا شے ہے کسکو کہتے ہیں بھوک
بھوک میں کیونکہ مرتے ہیں مخلوک

سیر بھوکے کی قدر کیا سمجھے
ان کے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے

قوم پر کرتے ہو اگر احساں
تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش نہاں

کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو
پیٹ میں جو ہے سب اگل ڈالو

علم کو کر دو کو بہ کو ارزاں
ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

سنتے ہو سامعینِ باتمکین
سنتے ہو حاضرینِ صدر نشین

عزّت قوم چاہتے ہو اگر
جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور
اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
اب نہ سیّد کا افتخار صحیح
نہ برہمن کو شدر پر ترجیح
قوم کی عزّت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا
بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات
یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

مشورۂ اعتماد (حسرت موہانی)

جان کو محو غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہِ مراد کر
اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمّتِ سر بلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیِ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گزر
اُس کو نہ پیشوا سمجھ اُس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہلِ جور کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

یادِ وطن (حامد حسن قادری)

پردیس میں ہیں کیا کیا سامانِ عیش و عشرت　　لیکن مسافروں کی لگتی نہیں طبیعت
دو دن کی زندگی بھی ہے کاٹنا مصیبت　　یادِ وطن سے دل کو ہوتی ہے سخت وحشت

آرام اپنے دل کو دنیا میں بس وہیں ہے
پیارے وطن سے پیاری کوئی زمیں نہیں ہے

کانٹا بھی اُس چمن کا اک پھول ہے نظر میں　　سودا بھرا ہوا ہے حبِّ وطن کا سر میں
ایسی کشش ہے اُس کے دیوار اور در میں　　دل گھر ہی میں ہے رکھا ہم لاکھ ہوں سفر میں

آرام اپنے دل کو دنیا میں بس وہیں ہے
پیارے وطن سے پیاری کوئی زمیں نہیں ہے

دیکھے قفس سے بلبل جیسے چمن کی جانب　　دوڑے چکور ماہِ چرخِ کہن کی جانب
پروانہ اُڑ کے آئے شمعِ لگن کی جانب　　کھنچتا ہے دل ہمارا یونہیں وطن کی جانب

آرام اپنے دل کو دنیا میں بس وہیں ہے
پیارے وطن سے پیاری کوئی زمیں نہیں ہے

مل جائے ہم کو یا رب وہ جھونپڑا پُرانا　　یعنی وہ گھر ہمارا چھپّر پڑا پُرانا
وہ کرم خوردہ کمبل وہ بسترا پُرانا　　سامانِ عیش و راحت جو ہو نیا پُرانا

آرام اپنے دل کو دنیا میں بس وہیں ہے
پیارے وطن سے پیاری کوئی زمیں نہیں ہے

مسکن بھی بس وہیں ہو مولد جہاں ہے میرا　　اُجڑا ہوا مرا گھر اک گلستاں ہے میرا

وہ خانہ باغ ویراں باغِ جناں ہے میرا — فردوس سے بھی بڑھ کر ٹوٹا مکاں ہے میرا

آرام اپنے دل کو دنیا میں بس وہیں ہے
پیارے وطن سے پیاری کوئی زمیں نہیں ہے

شہیدوں کی عید (حفیظ جالندھری)

فرض پورا کر چکے، فرصت ملی ہر کام سے — مقبروں میں سو رہے ہیں آج کس آرام سے
صبح کی صورت اُٹھے تھے رات کے آغوش سے — حال کے انوار چمکے تھے نقابِ دوش سے
اُن کا اُٹھنا تھا کہ تقدیرِ اخوت جاگ اُٹھی — خوابِ غفلت میں پڑی تھی آدمیت جاگ اُٹھی
ہو گئیں آباد اُن کے نام سے آبادیاں — رشکِ جنت بن گئیں ان کے لہو سے وادیاں
بام و در، کہسار، میداں، خشک و تر، پست و بلند — ہو گئے اللہ والوں کی صدا سے بہرہ مند
زندگی میں بس گئے آباد کاروں کی طرح — صبر کی مدت گزاری روزہ داروں کی طرح
پیکرِ ہستی میں وہ روحِ محبت بھر چکے — آئے تھے جس کام کو وہ کام پورا کر چکے
آخر ان کی عمر کا دن ڈھل گیا شام آ گئی — یعنی صبحِ عید کا شب لے کے پیغام آ گئی

رات اُن کی ہے کہ روزِ عیش کی تمہید ہے
ان شہیدوں کے لئے صبحِ قیامت عید ہے

جوہرِ ذاتی (حفیظ جالندھری)

مدتوں سے اشک کے سیلاب میں بہتا ہے دل — سختیاں ہر موجِ طوفاں خیز کی سہتا ہے دل
دل میں سب کچھ ہے مگر منہ سے نہیں کہتا ہے دل — التجا ایسی دعا سے محترز رہتا ہے دل

حاجتیں لاکھوں ہیں لیکن مانگنے سے عار ہے
شکر کرتا ہوں کہ میرا دل بہت خوددار ہے

اپنے دامن میں لیا ہے بارگاہوں نے مجھے
اپنے پہلو میں بٹھایا بادشاہوں نے مجھے

بار بار تاکا ہے بخشش کی نگاہوں نے مجھے
اور بنا ہیں پیش کیں عالم پناہوں نے مجھے

رعب دولت کا مگر دل پہ مرے چھایا نہیں
کچھ طلب کرنے کو میں نے ہاتھ پھیلایا نہیں

خمیازہ (حفیظ جالندھری)

کیا ہو گئیں وہ عہد فراغت کی مستیاں
وہ دوستوں کی بزم وہ بادہ پرستیاں

آخر شکست کھا کے گرا پہلوانِ شوق
افکار کی چلیں وہ زبردست دستیاں

پیاروں کی موت نے مری دنیا اجاڑ دی
یاروں نے دور جا کے بسائی ہیں بستیاں

جن سے خیال میں بھی جدائی نہ تھی پسند
وہ خواب ہو گئی ہیں خیالوں کی ہستیاں

ٹوٹے پڑے ہیں آج قرابے شراب کے
کیا جلد اتر گئیں مرے نشوں کی مستیاں

کب تک اٹھیں گے بہرِ دعا دستِ التجا
آخر بلند ہو کے رہیں گی یہ پستیاں

بچوں کی موت (حفیظ جالندھری)

توڑتا ہے کس لئے غنچوں کو گل چینِ اجل
کس سے پوچھیں آہ کیا ہے طرزِ آئینِ اجل

ہائے معصوموں کی جانوں پر عذاب جانکنی
پھول سے اجسام نذرِ التہاب جانکنی

آہ ہنستے کھیلتے خاموش ہو جاتے ہیں کیوں — جس سے پھر اُٹھتے نہیں وہ نیند سو جاتے ہیں کیوں
اپنے بیگانوں کا دل رہتا ہے جس سے باغ باغ — دیکھیے اُن کے جگر جن کو یہ دے جاتے ہیں داغ
تا دمِ آخر جدائی کے ستم سہتے ہیں وہ — مر نہیں جاتے مگر زندوں میں کب رہتے ہیں وہ
اُن کے اُجڑے باغ میں فصلِ بہار آتی نہیں — بام و در سے اُن کے اُٹھتی ہے یہ فریادِ حزیں

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

تیری جلوہ آرائی (رمانند بالی)

کوہ و صحرا میں تجھے آبِ رواں میں دیکھا — جس طرف آنکھ اُٹھی تجھ کو جہاں میں دیکھا
کوئی شے ایسی نہیں جس میں نہ ہو تیری جھلک — تو ہے اُس میں بھی نہ جو وہم و گماں میں دیکھا
ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے تو جلوہ کناں — تجھ کو ہر نقطے میں ہر نام و نشاں میں دیکھا
تو ہی تو آیا نظر دَیر و حرم میں ہر سُو — بانگِ ناقوس میں دیکھا ہے اذاں میں دیکھا
بزمِ گیتی میں بنا حُسنِ بنی آدم کا — حور و غلماں نے تجھے باغِ جناں میں دیکھا
رنگ و بوئے گلِ رعنا ہے کبھی بستاں میں — اور کبھی بلبلِ نالاں کی فغاں میں دیکھا
تو ہی تو ہے کہ جو ہے جانِ نسیمِ جاں بخش — اور ہے تو ہی جسے بادِ خزاں میں دیکھا
کبھی قرطاس پہ ہے مصرعِ موزوں بن کر — کبھی شاعر کی تجھے طبعِ رواں میں دیکھا
کبھی آنکھوں میں نظر آ گیا آنسو بن کر — صورتِ درد کبھی دل کے مکاں میں دیکھا
کیوں نہ ہو تیرا پتا باغ کا پتّا پتّا — ہر گل و خار میں ہر بوئے نہاں میں دیکھا

برف میں اولے میں باران و کہر سے ہے عیاں ابر میں، رعد میں، اور برقِ تپاں میں دیکھا

جس طرف آنکھ اٹھی وہ نظر آیا باکی
جلوہ گر چار طرف اُس کو جہاں میں دیکھا

پاداشِ عمل (حفیظ جالندھری)

سیاہی بن کے چھایا شہر پر شیطان کا فتنہ
گناہوں سے لپٹ کر سو گیا انسان کا فتنہ

پناہیں حسن نے پائیں سیہ کاری کے دامن میں
وفاداری ہوئی روپوش ناداری کے دامن میں

مُیسّر ہیں زری کے شامیانے خوش نصیبی کو
اُڑھا دی سایۂ دیوار نے چادر غریبی کو

مشقّت کو سکھا کر خوبیاں خدمت گزاری کی
ہوئیں بے خوف بے ایمانیاں سرمایہ داروں کی

لیا آغوش میں پھولوں کی سیجوں نے امیری کو
مہیا خاک ہی نے کر دیے آسن فقیری کو

تڑپتا چھوڑ کر چپ ہو چکے جی ہارنے والے
مزے کی نیند سوئے تازیانے مارنے والے

وہ روحانی و جسمانی عقوبت کم ہوئی آخر
غلامی بیڑیوں کے بوجھ سے بے دم ہوئی آخر

ہوئے فریادیوں پر بند ایوانوں کے دروازے
کہ خود محتاجِ درباں ہیں جہاں بانوں کے دروازے

بڑے انداز سے جا سوئی غفلت بادشاہوں کی
سرورِ کیف بن کر چھا گئیں نیندیں گناہوں کی

تھما جب زندگی کا جوش پرخاشِ عمل جاگی
عمل کو دیکھ کر مدہوش پاداشِ عمل جاگی

اُٹھایا موت نے پتھر جہنّم کے دہانے سے
جہاں آتش کا دریا کھولتا تھا اک زمانے سے

بلندی سے تباہی کے سمندر نے کیا دھاوا
چٹانوں کے جگر سے پھوٹ نکلا آتشیں لاوا

دکھا دی آگ ایوانوں کو مظلومی کی آہوں نے
اُٹھائے شعلہ ہائے آتشیں سنگیں گناہوں نے

نہ حسن و عشق نے پائی اماں قہرِ الٰہی سے
دبی پاداش امیری سے فقیری سے نہ تباہی سے

اُٹھیں مختار بن کر بے کسی کے خون کی موجیں
حصارِ موت نے محصور کر لیں جنگ جو فوجیں
ستاروں کی نگاہوں نے دھواں اُٹھتا ہوا دیکھا
مگر خورشید نے کچھ بھی نہ مٹی کے سوا دیکھا

ساقی نامہ (حفیظ جالندھری)

فضاؤں پر مسلّط لشکرِ جنّات ہے ساقی
قیامت خیز طوفاں ہے اندھیری رات ہے ساقی
اُٹھی ہے لعنتی تہذیبِ نو سیلاب کی صورت
ہے جس کے حلقۂ ہر موج میں گرداب کی صورت
تلاطم خیز موجیں ہیں گناہوں کے تھپیڑے ہیں
الٰہی خیر ہو ایمان کے کمزور بیڑے ہیں
ہوائے شیطنت کمزور بیڑوں کو ڈبوتی ہے
مگر اولادِ آدم تختۂ غفلت پہ سوتی ہے
میں انسانوں کو اس طوفانِ ذلّت سے بچاؤں گا
میں اُن سوئے ہوئے شیروں کی غیرت کو جگاؤں گا
وہی ضیغم جو تیرہ سو برس پہلے دہاڑے تھے
وہی پنجے جو حق نے سینۂ باطل میں گاڑے تھے
مجھے اُن کو اُٹھانا ہے مجھے اُن کو جگانا ہے
پرانی گونج سے غوغائے باطل کو مٹانا ہے
پلا ساقی، پلا وہ شعلۂ صہبائے ایمانی
کہ اُڑ جائیں دھواں بن کر وساوسہائے شیطانی
دہانِ خامہ میں ٹپکا دے بادہ اپنے ساغر سے
کہ جس کا قطرہ قطرہ تازیانوں کی طرح برسے
شرابِ معرفت کا از سرِ نو جام بھر ساقی
رگوں میں پھر تڑپتا آتشیں اسلام بھر ساقی
پلا مجھ کو پلا ساغر اُسی صہبائے وحدت کا
کہ جس کی موج سے منہ پھیر دوں ہر فوجِ کثرت سے
مئے توحیدِ کہنہ کا اُٹھا سربستہ خُم ساقی
سنا مُردہ دلوں کو پھر وہی آوازِ قُم ساقی
مری فطرت کو ساقی بے نیازِ دو جہاں کر دے
پیالہ سامنے دھر دے قلم میں زندگی بھر دے

زمانے میں نہیں مقصود میرا جز خدا کچھ بھی
مرے منہ سے نہ نکلے گا صداقت کے سوا کچھ بھی

پنجاب (حفیظ جالندھری)

وہ بلندی جس پہ ہیں نورانیوں کی بستیاں — برف کی آبادیاں، برفانیوں کی بستیاں
نغمے سوتے ہیں جہاں خاموشیوں کے ساز میں — محو تھا میں بھی وہیں اک روز خوابِ ناز میں
دفعتاً ٹوٹا مرے مجبور خوابوں کا طلسم — بن گئی ہستی مری یکسر ربابوں کا طلسم
گرمیِ رفتار نے چھیڑا مجھے مضراب سے — گونج اُٹھے کہسار میرے نغمۂ بیتاب سے
میں اُتر آیا فرازِ کوہ سے گاتا ہوا — اپنی مستانہ روش میں ٹھوکریں کھاتا ہوا
پاسبانوں نے بہت گھیرا مجھے، روکا مجھے — یعنی ہیبت ناک دیووں نے عبث ٹوکا مجھے
کچھ نہ بن آیا مری سعیِ عمل کے سامنے — میری رو میں بہہ گئے جو آئے مجکو تھامنے
ابر نے آنسو بہا کر مجکو رخصت کر دیا — اور اپنے موتیوں سے میرا دامن بھر دیا
دولتِ کہسار لے کر دامنِ سیلاب میں — آخرِ کار آ بسا میں خطۂ پنجاب میں
مدتیں گزری ہیں اس فردوس میں رہتا ہوں میں — یہ پری زادوں کی وادی ہے یہاں بہتا ہوں میں
اس زمیں پر چاہنے والے مرے آباد ہیں — شاد ہیں دونوں کنارے ہر طرح سے شاد ہیں
اُن کے دل روشن ہیں سچی دوستی کی آگ سے — اُن کے گیتوں کی صدا ملتی ہے میرے راگ سے
میرا افسانہ بندھا ہے اُن کے افسانوں کے ساتھ — جس طرح سے شمع وابستہ ہے پروانوں کے ساتھ

مختصر یہ ہے کہ الفت ہے مجھے پنجاب سے
خوش ہوں میں پنجابیوں کی سوزشِ بیتاب سے

شاعر کا عزم (حفیظ جالندھری)

تہیہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں / اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں
مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو / سکوتِ مرگ نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سو
عزیمت ہے نہ جرأت ہے نہ ہے تاب و تواں باقی / فقط حسرت سے تکنے کے لئے ہے آسماں باقی
نظر آتے ہیں اب وہ صف شکن بازو نہ شمشیریں / مقابر کی طرح سونی پڑی ہیں آج تکبیریں
گئی دنیا سے آقائی محمدؐ کے غلاموں کی / بھلا بیٹھے جو یاد اپنے سلف کے کارناموں کی
ارادہ ہے کہ پھر ان کا لہو اک بار گرماؤں / دلِ سنگیں سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں
سناؤں اُن کو ایسے ولولہ انگیز افسانے / کرے تائید جن کی عقل بھی تاریخ بھی مانے
کیا فردوسیِ مرحوم نے ایران کو زندہ / خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ
عجم کا شاہنامہ بس وہ فردوسی کا حصّہ تھا / تخیّل ہی کا ہنگامہ تھا یعنی ایک قصّہ تھا
مگر اُس کی زباں اُس کا بیاں اعجاز ہے گویا / کہاں کی رستمی وہ خود ہی تیر انداز ہے گویا
تقابل کا کروں دعوےٰ یہ طاقت ہے کہاں میری / تخیّل میرا ناقص نامکمل ہے زباں میری
زبانِ پہلوی کی ہم زبانی ہو نہیں سکتی / ابھی اُردو میں پیدا وہ روانی ہو نہیں سکتی
نحیف و ناتواں بے علم بے مقدور ہستی ہوں / غم و اندوہ جس میں بس رہے ہیں ایسی وہ بستی ہوں
کہاں ہے اب وہ دورِ غزنوی کی فارغ البالی / غلامی نے دبا رکھی ہے میری ہمّتِ عالی
مگر سینے میں دل رکھتا ہوں جس میں جوشِ غیرت ہے / سراسر راکھ ہے لیکن ابھی تک پُرحرارت ہے
کیا ہے روح کو زندہ مدینے کی ہواؤں نے / جگایا خواب سے احساس کی غیبی نداؤں نے
نویدِ صبح بخشی ہے سکوتِ شام نے مجکو / مخاطب کر لیا ہے قوّتِ الہام نے مجکو

بظاہر میں جو تصویر سخن میں رنگ بھرتا ہوں
کسی آواز کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں

محبت کی عیدی (حفیظ جالندھری)

محبت جب ہلالِ عید بن کر مسکراتی ہے
نگاہِ حسن جھکتی ہے دعا کو ہاتھ اٹھاتی ہے
ہلالِ عید کیا ہے اک تصوّر تیغِ ابرو کا
محبّت اپنی محبوبہ کو آئینہ دکھاتی ہے
دعائے حسن کیا ہے ایک بستی آرزوؤں کی
محبّت ہی یہ بستی حسن کے دل میں بساتی ہے

بسادے اے خدا! اُس شہر میں حسن و محبّت کو
جہاں ہر شام دامن میں پیامِ عید لاتی ہے

عرضِ حال (دل شاہجہاں پوری)

شکیب و ضبط بھی اے پیکِ یار لیتا جا
پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا
لکھا ہے خون کے قطروں سے حالِ دردِ فراق
مرقعِ خلشش و اضطرار لیتا جا
بجائے مُہر ہوئی ثبت چشمِ پُر حسرت
یہ نقش ہے ہمہ تن انتظار لیتا جا
پڑھے ہیں لختِ جگر تارِ اشک رنگیں میں
یہ دل پسند یہ خوش رنگ ہار لیتا جا
کسی کے زیرِ قدم آج ہی بچھا دینا
سکونِ جانِ محبّت شعار لیتا جا
تجھے ہے عذرِ ادا داستانِ عشق طویل
مری زبان بھی اے غم گسار لیتا جا
وفورِ شوق جو سرمایۂ محبّت ہے
یہ صد نیاز پئے نذرِ یار لیتا جا
یہ چیز وہ ہے جو فائق ہے لاکھ چیزوں پر
خلوصِ عشق کا تو اعتبار لیتا جا

رہا سہا ہے جو تسکینِ دل کا سرمایہ / مرے رفیق مرے راز دار لیتا جا
انیسؔ حضرتِ دلؔ آہ جو تمنا تھی / ملی ہے خاک میں اُس کا غبار لیتا جا

داستانِ زندگی (دلؔ شاہجہانپوری)

ہو چکا ناکامیٔ دل تک بیانِ زندگی / عشق نے اب کی مکمل داستانِ زندگی
گوشِ عبرت ہو تو سن تو داستانِ زندگی / اب تو میرا ہر نفس ہے نوحہ خوانِ زندگی
اے حواس و ہوش رخصت آ گیا وہ وقت آ / خود فراموشی کہے گی داستانِ زندگی
بحرِ ہستی میں یہ دیکھا سعیٔ حاصل کا مآل / مٹ گیا موجِ حوادث سے نشانِ زندگی
شکوہ سنجِ ہستیٔ بے کیف ہے میرا وجود / اک نظر مجھ پر بھی اے آلودگانِ زندگی
آج یوں رخصت ہوئی دنیا سے روحِ منتظر / آخری دو ہچکیاں تھیں نوحہ خوانِ زندگی
ایک آہِ سرد میں مضمر ہیں لاکھوں واقعات / مختصر یوں کہہ رہا ہوں داستانِ زندگی
کیا حقیقت ہے ہماری یہ رہی برسوں تلاش / گم ہوا اس آرزو میں کاروانِ زندگی
عشق کی فطرت بدل دی اس دلِ بے صبر نے / اب تو ہر نالہ ہے جزوِ داستانِ زندگی
خاک ہو کر بھی دلِ پامال ہے حیرت نگاہ / دیکھیے کب ختم ہو گا امتحانِ زندگی
در حقیقت عاشقوں کی موت ہے تسکینِ دل / کہہ گیا اک چارہ فرما رازدانِ زندگی
مٹنے والوں کی ہے خاکِ قبر رودادِ خموش / کہہ رہے ہیں یہ ابھی تک داستانِ زندگی
ہو چکی برباد گو اے شمع پروانوں کی خاک / ذرہ ذرہ میں ہے پنہاں اک جہانِ زندگی
حشر بھی شامل ہے اے دلؔ واقعاتِ عشق میں / آپ کہیے گا کہاں تک داستانِ زندگی

فسانۂ رنج و ملال (دل شاہجہانپوری)

جراحتِ دلِ مضطر کا حال کس سے کہوں — کہوں تو شدتِ رنج و ملال کس سے کہوں
نہ غمگسار ہے کوئی نہ چارہ جو کوئی — فسانۂ دلِ حسرت مآل کس سے کہوں
اُمیدوارِ کرم ہیں پہ نگاہِ قہر و غضب — کسے سناؤں یہ اے خوش جمال کس سے کہوں
وہ ابتدائے محبت وہ انتہائے جفا — وہ ماجرائے دلِ پائمال کس سے کہوں
ستم جو تیری نگاہوں نے بار بار کئے — میں غم نصیب، ہیں آشفتہ حال کس سے کہوں

درونِ سینۂ من زخمِ بے نشاں زدۂ
بحیرتم کہ عجب تیرِ بے کماں زدۂ

نگاہ ملتے ہی میں اشکبار ہو کے چلا — مثالِ درد اُٹھا بے قرار ہو کے چلا
بحالِ زار بصد یاس اے جفا پرور — اک آہ بھر کے چلا داغدار ہو کے چلا
نسیمِ لطف کی اُمید کھینچ لائی تھی — چمن سے خستۂ جوشِ بہار ہو کے چلا
ستم تو یہ ہے کہ اُمیدوارِ چشمِ کرم — خدنگِ قہر و غضب کا شکار ہو کے چلا
کبھی تو چشمِ محبت سے دیکھ لینا تھا — یہ داغ لے کے چلا دلفگار ہو کے چلا

درونِ سینۂ من زخمِ بے نشاں زدۂ
بحیرتم کہ عجب تیرِ بے کماں زدۂ

شاعر (خواجہ دل محمد دل)

جہاں کی بزم میں شاعر سرور و نور ہے تو — زمیں کے وادیٔ ظلمت میں شمعِ طور ہے تو

خدا نے جاں کو تری وقفِ سوز و ساز کیا ۔۔۔ دلِ تپاں کو ترے آشنائے راز کیا
تری نگاہ میں شام و سحر کے جلوے ہیں ۔۔۔ شباب و اختر و شمس و قمر کے جلوے ہیں
کہیں تو گم ہے ہجومِ نجومِ تاباں میں ۔۔۔ کہیں غریقِ شعاعوں کے بحرِ رخشاں میں
کہیں ہلال کی کشتی پہ سیر کرتا ہے ۔۔۔ ہلورے لے کے یمِ نور سے گزرتا ہے
چمن میں سبزے کے ہمراہ لہلہاتا ہے ۔۔۔ زبانِ طیور کی بن بن کے چہچہاتا ہے
گلوں سے ہنستا ہے شبنم کے ساتھ روتا ہے ۔۔۔ شریکِ رنج و طرب ہر کسی کا ہوتا ہے
قدم قدم پہ تجلائے نور ہے تجھکو ۔۔۔ تلاشِ جلوہ میں ہر ذرہ طور ہے تجھکو
مکاں سے تا بحدِ لامکاں وطن تیرا ۔۔۔ لباسِ ہستی صد رنگ پیرہن تیرا
چمن سے پھول، گُہر لے کے کان سے آیا ۔۔۔ اُڑا کے رنگِ شفق آسمان سے لایا
چمن سے پھول تو گوہر صدف سے آتے ہیں ۔۔۔ لڑی لڑی ترے اشعار کی سجاتے ہیں
ہے ایک سی تجھے الفت گدا و شاہ کے ساتھ ۔۔۔ کہ تیری واہ رہی ہم ردیف آہ کے ساتھ
زمینِ قلب میں آنسو کا بیج بوتا ہے ۔۔۔ اثر کا نخل برومند جس سے ہوتا ہے

اگرچہ رہتا ہے تو مبتلائے دردِ جگر
یہ تیرا دردِ جگر ہے دوائے دردِ جگر

پسِ مردن (ذوق دہلوی)

کل ایک تارکِ دنیا سے میں نے پوچھا ذوق ۔۔۔ کہ تو اُکھڑ کے ادھر سے اُدھر ہوا پیوست
گذر رہی ہوگی بہ آرامِ زندگی تیری ۔۔۔ کہ تجکو اب نہ غمِ نیست ہے نہ شادیِ ہست
کہا یہ اُس نے کہ قیدِ حیات میں انساں ۔۔۔ کبھی نہ ہوگا دلِ آسودہ گو ہو مستِ الست

اُٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں — کہ با فراغ کرے گنجِ عافیت میں نشست
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی — تو سلسلے میں فقیری کے پھر ہوا پابست
رہا وہ خدمتِ مرشد کی قید میں برسوں — کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقامِ اعلیٰ پر — کہا یہ شوق نے ہو ہمتِ بلند نہ پست
جو دستگاہ تصرف میں بھی ہوئی اُس کو — تو یہ ارادہ ہوا اور بھی ہوں بالادست
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلحِ کُل کے یہی — کہ نفس دشمنِ سرکش ہے اس کو دیجے شکست
جو ہوشیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند — پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست
نہیں ہے دامِ علائق سے مطلق آزادی — مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کرکے جست
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ — گیا زباں سے نکل اُس کے جیسے تیر از شست

کہ کرد قطعِ تعلق کدام شد آزاد
بریدۂ ز ہمہ با خدا گرفتار است

حالِ شبِ ہجر (ذوق دہلوی)

کہوں اے ذوق کیا حالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سو اس ظلمت کے پردے میں کیے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے

عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قرین تھے — قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — پھٹے جاتے ہیں ہم سایوں کے سینے
اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جاں کنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منھ روشنی نے
گیا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منھ میں آنسو — پڑھی یاسیں سرہانے بے کسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی یارے کسی نے
بشارت مجکو صبحِ وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے

موذن مرحبا برقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

گوہرِ منظوم (غلام مصطفےٰ ذہین)

دلوں میں راہ تو کر رشتۂ گہر کی طرح — ملے گی دیدۂ مردم میں جا نظر کی طرح
رہے گا باغِ جہاں میں نہ گل نہ رنگ نہ بو — رہے گی شے نہ کوئی نخلِ بارور کی طرح

کبھی نہ تیغِ حوادث سے ڈر، بھلائی کر
کہ آڑے آئے گی نیکی تری سپر کی طرح

نہوں گے مندمل ایسے وہ ہوں گے کاری زخم
چبھے گی نوکِ زباں کی جو نیشتر کی طرح

تو مایہ دار اگر ہے تو سرنگوں ہو جا
شعار اپنا بنا نخلِ بارور کی طرح

بشر نہ شر کے لئے ہے نہ شر بشر کے لئے
نہ ہو جہاں میں بدنام لفظِ شر کی طرح

پہنچ سکے گا تری ذات سے جہاں کو فیض
ہو تجھ میں نورِ صداقت اگر سحر کی طرح

ضرر ہو اس سے تو ہو نفع اس سے صد افسوس
بشر ہو اور نہ ہو نخلِ بارور کی طرح

کرو گے قدر سنو گے جو قصۂ یعقوب
نہیں شفیق پسر پر کوئی پدر کی طرح

بنو سحابِ کرم، بحرِ جود، کانِ عطا
ہر اک کو فائدہ پہنچاؤ بحر و بر کی طرح

عزیز بنکے رہو چار دانگِ عالم میں
زمرّد و گہر و لعل و سیم و زر کی طرح

ذہینؔ ہے درِ حق سب کا کعبۂ مقصود
پڑے رہو تم اسی در پہ سنگِ در کی طرح

نیکی (غلام مصطفےٰ ذہینؔ)

کرتے رہو جہاں میں لیل و نہار نیکی
کوشش کرو تم اس میں ہمت نہ ہارنے کی

دیکھو دکھاتی ہے پھر کیا کیا بہار نیکی
کوشش جو اس طرف ہو دل کو ابھارنے کی

ہے کون جز نکوئی مونس بُری گھڑی میں
آتی ہے نوبت آخر رب کو پکارنے کی

آدم کو بنایا اشرف پھر دولتِ خرد کی
کیسی بڑی عنایت پروردگار نے کی

گر عقل ہے عزیزو، باغِ جہاں میں سمجھو
فصلِ خزاں ابدی ہے فصلِ بہار نیکی

نیکی اگر کرو گے ہر دل عزیز ہو گے
سوچو کہ ہے پسندِ پروردگار نیکی

نیکی کی خوبیوں کو نیکوں سے جا کے پوچھو ۔۔۔ تم بھی بنا کے دیکھو اپنا شعار نیکی
حاجات دین و دنیا وابستہ ہیں اسی سے ۔۔۔ بے شک ہے دو جہاں کی حاجت برار نیکی
نیکی بشر کے حق میں ہے زیور شرافت ۔۔۔ کوشش کرو عزیزو خود کو سنوارنے کی
مرغوب اُسے ہے نیکی توفیق جس کو رب دے ۔۔۔ نااہل ہی کو ہوتی ہے ناگوار نیکی
غیروں کے نیک و بد سے مطلب نہ رکھ جہاں میں ۔۔۔ لے بار بار لذت کر بار بار نیکی
بدنام ہو کے جینا ہے موت سے بھی بڑھ کر ۔۔۔ کرتے رہو ہر اک سے تم بار بار نیکی
کیا ہے بدی نہ پوچھو ہے خار زار وحشت ۔۔۔ جی بھر کے سیر دیکھو ہے لالہ زار نیکی

کیا غم ذہینؔ ہم کو دنیا کی آفتوں کا
جب وقتِ بد میں اپنی ہو غمگسار نیکی

عذاب (خواجہ مسعود علی ذوقی)

روندی پڑی ہیں خاک پہ نیکی کی قوتیں ۔۔۔ اور حکمراں ہے فتنۂ باطل کی سرکشی
بکری کی کھال اوڑھ کے خوں خوار بھیڑیئے ۔۔۔ انسان کے لہو سے بجھاتے ہیں تشنگی
پنہاں ہیں دوستی کے تبسم میں نیشتر ۔۔۔ خنجر ہے آستیں میں دمِ صلح و آشتی
اُگتے ہیں خار لالۂ رنگیں کے بھیس میں ۔۔۔ شیرینیوں کی تہہ میں ہے تلخی چھپی ہوئی
پیشانیوں پہ غازۂ معصومیت کی ضو ۔۔۔ سینوں میں ہولناک عداوت کی تیرگی
چڑھتی ہے بھینٹ آتشِ سرمایہ دار پہ ۔۔۔ مزدورِ فاقہ مست کے چہرے کی روشنی
جھلسی ہوئی ہے آتشِ دولت کی آنچ سے ۔۔۔ افلاس کے لبوں کی درخشاں شگفتگی
ناداریوں کے قحط سے فاقوں کے ظلم سے ۔۔۔ پھیکی ہے گل رخوں کے تبسم کی چاندنی

غالب نشاطِ زیست پہ ہے رنجِ مفلسی
ہر لذتِ حیات میں شامل ہے زہرِ غم
شام و سحر حریمِ امارت کے سائے ہیں
ہوتی ہے سیم و زر کے خداؤں کی بندگی

ہوشیار۔ خبردار! (سید ذوالفقار علی بخاری)

ہنستے تھے مجھ کو جان سے بیزار دیکھ کر
روتے ہو آج موت کے آثار دیکھ کر

یہ چودھویں صدی ہے گیا دورِ موسوی
حیرت میں کیوں ہو تم مجھے ہشیار دیکھ کر

پھر کاٹنا پڑے گا مجھے کوہِ زندگی
تھرا رہا ہوں زیست کے آثار دیکھ کر

اس دوستی کے بھیس میں بہروپیے بھی ہیں
اے دوست ہوشیار خبردار دیکھ کر

ناحق پرست اٹھے ہیں کہ تائیدِ حق کریں
دل بیٹھ جائے گا رسن و دار دیکھ کر

یہ خاص لطف کیوں ہے یہ خو کیوں بدل گئی
غم اور بڑھ گیا تجھے غم خوار دیکھ کر

آنکھیں کھلیں تو عیش کی دنیا اجڑ گئی
تقدیر سو گئی مجھے بیدار دیکھ کر

ہو کا عالم (سید ذوالفقار علی بخاری)

یہ اس سے جا کر پوچھو جس کا مذہب دنیا داری ہے
یہ دنیا کتنی اچھی ہے یہ دنیا کتنی پیاری ہے
ہاں بیت گئے وہ دن جب تھا ہنگامۂ ہاؤ ہو برپا
اب دل کی بستی سونی ہے اک ہو کا عالم طاری ہے

اس رونے پر اس ہنسنے پر حیران نہ ہو اتنا تو سمجھ
وہ جینے کی تیاری تھی یہ مرنے کی تیاری ہے
اک اور بھی دنیا بستی ہے اس دُکھ کی دنیا سے باہر
اُس دنیا میں سکھ ملتا ہے یہ دنیا سب دکھیاری ہے
اے مایا والو اپنی مایا اس کُٹیا سے لے جاؤ
یہ سادھو پریم پجاری ہے یہ جوگی پریت بھکاری ہے

قلم (ریاض خیرآبادی)

شاخِ قلم آج رنگ لائے
سوکھی سی شاخ گُل کھلائے
میدانِ قلم بنے چمن زار
اس باغ کا گل فشاں ہے ہر خار
گل کیسے لٹائے وہ زرِ گل
شرمائے جو گل فشان ہو بلبل
ہے نعت رسول حمد کے ساتھ
میدان رہا یہ خامے کے ہاتھ
کیوں سحر بیاں اسے نہ مانیں
چلتی ہوئی پائیں دو زبانیں
حصّہ اس کا ہے سحر اثر بات
کانٹے کی تلی ہوئی ہر اک بات
منقارِ عنادل اس کے قربان
ہو جان فدا دل اس کے قربان
کہتا ہی نہیں یہ بے اثر بات
مقبول نہ کیوں ہو اس کی ہر بات
جو کچھ کہتا ہے سجدہ کر کے
چپ بھی رہتا ہے سجدہ کر کے
ڈرتا ہے کہیں نہ حرف آئے
سر جائے مگر نہ بات جائے
دیوانہ ہو جو سوِ چمن جائے
دامانِ بہار فرش بن جائے

گلگیر ہوا انجمن میں بلبل بس — منقار میں لے وہ شمع کا گل

آئیں نہ بے رنگ روئے گل پر
گلگونہ ہو دودِ شمع اُٹھ کر

آزادگیِ علائق (راسخ عظیم آبادی)

علائق سے آزادگی تھی میسّر — جنوں جن دنوں اپنا زنجیر پا تھا
نہ تھی فکرِ پوشش کی دیوانگی میں — اس اندیشہ کو میں نے تہ کر رکھا تھا
نہ بالیں کی خواہش نہ بستر کی حسرت — نہ پروا گلہ کی نہ شوقِ قبا تھا
فقط گرد کی تہ تھی پیراہنِ تن — نہ کچھ اور پاس اس کے اپنے سوا تھا

کیا ہائے کیا تو نے اے ہوشیاری
لباس اپنے تن پہ وہی خوش نما تھا

بسترِ بیمار (جگت موہن رواں)

یوں تو ہو جاتا ہے مایوسی میں ہر دل بےقرار — ہے مریضِ غم کا لیکن سخت ابتر حالِ زار
ضعف سے بےکار سب اعضا سراسر ہو گئے — لاغری سے ہے تنِ محزوں کی رگ رگ آشکار
جسم میں اب فرطِ غم سے خون اتنا بھی نہیں — جس کو کردے قلبِ مضطر نذرِ چشمِ اشکبار
منظرِ عالم سے ساری خوبیاں جاتی رہیں — اب کہاں لطفِ ہوائے باغ و سیرِ کوہسار
بار ہے آنکھوں کو پلکوں کا اُٹھانا اف رے ضعف — ایک دفتر ہے نگاہِ لاغرِ بیمارِ زار
اب کہاں ہیں آرزوئے دل کی وہ بےباکیاں — اب کہاں ہے شوق کا وہ جذبۂ بےاختیار

جسمِ لاغر اور تنِ محزوں کا جب یہ حال ہو
کیا بیاں ہو کیا رقم ہو اُس کے دل کا اضطرار

ایک محشر ہے بپا اُس کے تخیل میں مگر
کش مکش میں ہے مریضِ مضطرب کی جانِ زار

اک طرف مستغنیِ عالم ہے جانِ دردمند
اک طرف دامن کشاں بچوں کا خلاص اور پیار

اک طرف مایوسیِ دل مقتضائے ترکِ حرص
اک طرف ہے خوفِ بربادی میں جملہ کاروبار

اک طرف ہے بندِ غم سے رستگاری کی اُمید
اک طرف دل میں خیالِ مہ جبینِ غمگسار

جانِ بیمارِ حزیں کو چین آئے کس طرح
مبتلا ہے سخت حیرانی میں عقلِ سادہ کار

رفتہ رفتہ پھر تخیل اس سے جاتا ہے گزر
دل پہ چھا جاتا ہے یادِ عمرِ رفتہ کا غبار

پھرتا ہے نظروں میں اُس کی پھر لڑکپن کا سماں
پھرتی ہے آنکھوں میں اس کے پھر جوانی کی بہار

دیکھتا ہے ہر طرف حسرت بھرے انداز سے
یاد آتے ہیں اُسے سب ہم نشین و غمگسار

یاد آتے ہیں اُسے پھر اپنے اعمالِ قبیح
دل ہی دل میں اپنے ہوتا ہے نہایت شرمسار

غور کرتا ہے کرے اُن کی تلافی کچھ مگر
یہ خیال آتا ہے آخر ہے حیاتِ مستعار

دل ہی دل میں ہوتا ہے اپنے پشیماں وہ مریض
بازگشتِ عمر کی کرتا ہے خواہش بار بار

پھر اسی حالت میں ہو جاتا ہے غالب ضعفِ قلب
اور ہو جاتا ہے آنکھوں میں جہاں تاریک و تار

گلِ پژمردہ کی خودداری (رواں)

سیرِ گلشن کو گیا کل جو میں ہنگامِ سحر
پھول کمھلائے ہوئے خاک پہ کچھ آئے نظر

زیرِ لب میں نے تاسف سے کہا اے پھولو
اپنی مٹی تو نہ یوں خاک پہ برباد کرو

تم اگر دامنِ گلچیں کے بھی مہماں ہوتے
زینتِ دست و گریبانِ حسیناں ہوتے

میں نے حسرت کی نگاہوں سے جوان کو دیکھا　　انھیں پھولوں میں سے اک پھول نے مجھ سے کہا

ہم کو یوں خاک میں مل جانے سے کچھ عار نہیں
ہاں قلق یہ ہے کہ ہم طرۂ دستار نہیں

خدا خیر کرے (رواں)

ملک والوں سے گے یہ اطوار خدا خیر کرے　　اور یہ قوم برادبار خدا خیر کرے
ہوتے دو چار ہی قیدی تو تسلّی ہوتی　　قوم کی قوم گرفتار خدا خیر کرے
زخم پر زخم لگیں دل پہ وفاداروں کے　　اور ہو فریاد بھی دشوار خدا خیر کرے
حشر میں حشر اگر پرسشِ اعمال ہوئی　　اُسپہ مجھ جیسا گنہگار خدا خیر کرے
پھر غنیمت تھا وہ ہذیانِ مریضانِ فراق　　سلب ہے طاقتِ گفتار خدا خیر کرے

ہو چکا خیر جواب تک وہ غنیمت تھا رواں
اب ہے آسان بھی دشوار خدا خیر کرے

ہندِ مظلوم (رواں)

حالتیں کہتی ہیں یہ قوم کے ارمانوں کی　　قسمتیں جاگ اُٹھیں سوختہ سامانوں کی
پتلیاں بدلی نظر آتی ہیں دیوانوں کی　　توڑ ڈالیں گے یہ دیواروں کو زندانوں کی
ہندِ مظلوم زن و مرد دکھے اُجڑے ہوئے گھر　　سرخیاں ہیں یہ مری قوم کے افسانوں کی
لٹ گیا ملک گرفتار ہوئی قوم مگر　　طاقتیں یوں بھی کہیں مٹتی ہیں ایمانوں کی
ہندوؤں کی ابھی مالا ہے بدستور وہی　　ابھی تسبیح بھی باقی ہے مسلمانوں کی

چھینٹیں کچھ خون کی دیواروں پہ کچھ کاسۂ سر یادگاریں ابھی محفوظ ہیں دیوانوں کی
ہند مظلوم ہے فریاد کناں اے مالک جلد لے جلد خبر اپنے پریشانوں کی

یہ عجب جنگ ہے اس دورِ زمانہ میں رواں
اُس طرف توپ اِدھر ڈھال ہے ایمانوں کی

شاہدِ معصوم سے (روشن صدیقی)

محفل آرائے وفا تو۔ اور میں ننگِ وفا
دل مرا تاریک ہے تو چشمۂ نور و ضیا
پست ہے منزل مری اور تو ہے گردوں آشنا
نور تیری ابتدا ہے خاک میری انتہا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

میرے آنسو تیرے رنگیں ہار کے قابل نہیں
میرے داغِ دل ترے گلزار کے قابل نہیں
میری الفت۔آہ۔ تیرے پیار کے قابل نہیں
یعنی میں تیری محبّت کے لئے ہوں ناسزا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

میری الفت میں نہ اپنی راحتیں برباد کر
میرے غم میں یوں نہ اپنی زندگی ناشاد کر
میں تو اک خوابِ پریشاں ہوں نہ مجکو یاد کر

چھوڑ دے میرے لئے یہ رات بھر کا جاگنا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

تو نگارِ عفّت و عصمت ہے آوارہ ہوں میں
تو مقیمِ جلوہ گاہِ راز اور رسوا ہوں میں
آہ کب تیری محبت کے لئے زیبا ہوں میں
کچھ تو شانِ حسن کی معصومیوں پہ رحم کھا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

فطرتِ رنگیں کو تو اے دل ربا محبوب ہو
قدسیوں کو تیرا اندازِ حیا محبوب ہو
آہ ہر محبوب کو تیری ادا محبوب ہو
اور تیرے دل کو ہو محبوب اک غم آشنا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

ایک ساعت کے لئے حاصل مجھے راحت نہیں
میرے سازِ زندگی میں نغمۂ عشرت نہیں
آہ میں ناشاد ہرگز قابلِ الفت نہیں
ایک ننگِ زندگی کا غم کرے تیری بلا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

حاملانِ عرش کے دل میں ترا ارمان رہے
عظمتِ کونین تیرے نام پہ قربان رہے

اور تو اک بے وفا کی یاد میں نالاں رہے
کچھ نہیں کھلتا کہ تجھ پر کس نے جادو کر دیا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

ڈر رہا ہوں تیرا رازِ عشق افشا ہو نہ جائے
محرمِ اسرارِ خاموشی یہ دنیا ہو نہ جائے
یعنی تو میرے لئے بدنام و رسوا ہو نہ جائے
آہ کیا ہوگا اگر یہ راز سب پر کھل گیا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

گر کسی سے تیرا رازِ عشق سن پاؤں گا میں
منھ چھپا کر بزمِ ہستی سے گزر جاؤں گا میں
آہ پھر تجکو نہ دنیا میں نظر آؤں گا میں
گر تجھے مجھ سے محبت ہے تو دے مجکو بھلا
بھول جا اے شاہدِ معصوم مجکو بھول جا

آزادی نسواں اور اسلام (ز۔خ۔ش صاحبہ)

دل گوارا ہے کہ زنِ ہند کا کچھ حال لکھوں ۔۔۔ طبع حیراں کہ میں الفاظ کہاں سے لاؤں
میں پریشاں کہ پریشاں نہ کرے بخت زبوں ۔۔۔ ہاں کہی بات پرائی ہے کہوں یا نہ کہوں
آگیا لب پہ مگر ذوقِ تکلم سے سخن
منھ پہ آئی بھی کہیں رکتی ہے اے مشفقِ من

ہم کو کیا علم کہ کیا شئے ہے مزا دنیا کا
نہ یہ معلوم خوشی نام ہے کس چڑیا کا
آہ بے جرم ہمیں صنفِ قوی نے تاکا
تختۂ مشق بنایا ستمِ بے جا کا

آج انساں کے فضائل سے ہیں دونوں محروم
ایک تفسیرِ جہول ایک ہے تفسیرِ ظلوم

پائے بندی ہے ہر اک شخص کو سرمایۂ ننگ
اک زنِ شرق ہے بیدادکشِ قیدِ فرنگ
رہتے ہیں وسعتِ دنیا میں سدا جان سے تنگ
ہم میں اور عیش میں ہے فاصلۂ صد فرسنگ

زندگی ہے کہ مصیبت کا اک افسانہ ہے
دلِ محزوں ہے کہ حسرت کا سیہ خانہ ہے

بار ہیں دہر پہ ناخواستہ مہماں کی طرح
مہرِ گرما کی طرح برفِ زمستاں کی طرح
وحشی و جاہل و بے علم ہیں حیواں کی طرح
دائم الحبس ہیں ہم قاتلِ انساں کی طرح

بے حس و بے حرکت بے بس و سرافگندہ
بچّہ در دستِ جواں مردہ بدستِ زندہ

اس سے تشبیہ نہ دو بے بسیِ نسواں کو
رخصتِ سیرِ چراگاہ ہے جب حیواں کو
ہے قفس میں بھی یہ سکھ بلبلِ خوش الحاں کو
یاد کر سکتی ہے رو رو کے گلِ خنداں کو

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیّاد کی ہے

آتشِ ظلم سے دنیا ہوئی دوزخ ہم پر
پھونک ڈالا تپِ دق بن کے غموں نے اکثر
بے اجل مرتے ہیں تہ خانے کے اندر گھٹ کر
ہیں جو تنگی میں منافق کی لحد سے بدتر

ڈاکٹر کہتے ہیں در کھولو ہوا آنے دو
سنگ دل کہتے ہیں ہرگز نہیں مر جانے دو

حرفِ عزّت سے نہیں کان ہمارے آگاہ   سرنوشتِ رخِ نسواں میں ہے ذلّت کی نگاہ
کہتے ہیں اپنے تفوّق کا ہے قرآن گواہ   مصحفِ رب پہ یہ بہتان عیاذاً باللہ

کون یہ کہہ کے بنے کشتنی و قابلِ دار
ترجمہ کیجئے نہ قوّام کا آقا، سرکار

اور اگر چوں و چرا کا کوئی کہہ بیٹھے گناہ   ترشا ترشایا جواب اس کو یہ موجود ہے آہ
فتنہ پرواز، ریاکار، فریبی، گمراہ   آپ بھی طالبِ عزّت ہوئیں سبحان اللہ

کوتوالوں سے لڑیں چور ستم ہے کہ نہیں
یہ تماشا سببِ غصّہ و غم ہے کہ نہیں

اور یوں کہتے ہیں ہم سے ہو سوا جین میں تم   کہ بڑی اینٹھتی ہو پہنے حریر و قاقم
فکرِ اسبابِ معیشت میں یہاں ہوش ہیں گم   وقفِ گردش ہیں سدا صورتِ پیمانہ و خم

زن پہ شوہر ہے شررِ بارِ ستم ہائے ستم
اس صفائی سے پھر انکارِ ستم ہائے ستم

جسمِ اسلام کو افگار کیا ظلم کیا   نصفِ محمود کو بیکار کیا ظلم کیا
بے زباں صورتِ دیوار کیا ظلم کیا   متہم پھر سرِ بازار کیا ظلم کیا

کرکے بدنام دیا رنج و تاسّف ہم کو
پابہ زنجیر کیا صورتِ یوسف ہم کو

ان کو رہ رہ کے ستاتا ہے یہ بے اصل خیال   گھر میں پڑھ لکھ کے خواتین کا رکنا ہے محال

کہیں اُٹھے نہ مساوات کا غم خیز سوال کہیں ہو جائے نہ مردوں کی حکومت کا زوال
ہائے ان خود غرضوں کو نہیں اتنی بھی خبر
زوجۂ جاہلہ ہے آفتِ جانِ شوہر

آیئے جاہلہ کا آپ کو دکھلاؤں گھر بھر گیا بوئے غلاظت سے قدم رکھتے ہی سر
ظلمتِ دود ہے قوّتِ کُشِ چشم و نظر گردِ جاروب سے سینہ میں نہیں دم کا گزر
کیا نہیں دشمنِ جاں نالی کا گندہ پانی
ایں سخن را چہ جواب است تو ہم می دانی

مرغیاں جا کے منڈیروں پہ لڑیں چوں چوں چوں آ رہا چار کا سٹ نیچے اڑا اڑا دھوں دھوں
ظرفِ ناشستہ مثالِ سرِ عاصی ہیں نگوں زاغ و سگ کے لئے پس خوردہ ہے طعم موزوں
مل گئے دونوں نے عجب شورِ مچا رکھا ہے
سرِ بیگم سے مکاں سر پہ اُٹھا رکھا ہے

گیتھے چونے سے ہے اس طرح منقّش دیوار نقش دیوار ہو گر دیکھ لے مانی اک بار
جھاڑ فانوس کی تزئین سے ہو دل میں غبار اک نظر دیکھ لو گر مکڑی کے جالوں کی بہار
نہیں محدود بشر تک کرمِ شاہ نشیں
بھڑ کا چھتّا ہے کہیں گھونسلا چڑیا کا کہیں

چارپائی پہ اسی کمرے کی دائیں جانب پاندان گھٹنوں سے لئے بیٹھی ہیں بیگم صاحب
پاس ہی فرش پہ ماما ہے نظر کی طالب جس کے ملبوس کی بدبو ہے خرد کی سالب
بڑبڑاتی ہے کبھی یہ کبھی وہ جھنجتی ہیں
دیکھنا حاکم و محکوم کی تو تو میں میں

سامنے کمرہ ہے اک مختصر و تیرہ و تار — تازہ و صاف ہوا جس میں نہیں پاتی بار
آنکھ ہو جاتی ہے جب خستۂ سعیِ بسیار — تب کہیں جا کے نظر آتی ہے شکلِ بیمار
ایک دوشیزۂ کم سن ہے مسہری پہ دراز
واہ رے حسن مرض میں بھی تو ہے دیدہ نواز

تن پہ پوشاک نہیں میل بھری صافی ہے — جس کی رنگت سے خجل عقل کی کشّافی ہے
پھر غضب یہ کہ حفاظت کو بھی ناکافی ہے — کہتی ہوں اوپرے دل سے کہ خدا شافی ہے
حاذق الملک بہادر تو ہیں پرسانِ مزاج
عملاً حضرتِ شمس العلما کا ہے علاج

آہ اے بے خبرِ لذّتِ جانِ شیریں — تیری دشمن ہے تیری مادرِ زار و غم گیں
پائزن کہتے ہیں کس کو اسے معلوم نہیں — کان کی ہے جو دوا تجھ کو پلا دے نہ کہیں
اُف دواؤں کی یہ آلودگی گرد و غبار
ڈر ہے کر دے نہ تجھے اور زیادہ بیمار

محنتِ شافہ سے تھک کے میاں آیا گھر — نالۂ طفل سے پایا ہے بپا اک محشر
دھپ جماتے ہوئے ماں پوچھتی ہے چلّا کر — نامراد اب تو نہ جائے گا کبھی کوٹھے پہ
جھٹ پٹا وقت ہے ظالم کھلے میداں میں نہ جا
ہو گیا یوں ہی تو پریوں کا بہن پر سایا

رو کے بولا پسر اماں کوئی دیوانہ ہوں — اب اگر جاؤں تو اتنا ہی ڈرام جاؤں
ماں کے پنجہ سے رہا ہو کے دیا کوسا یوں — بڑی آپا کی طرح تو بھی لگے تھوکنے خوں

دیکھنا جنگ کا نظّارہ، اُدھر ہیں مادر
لختِ دل سلمہ اللہ تعالےٰ ہیں اِدھر

یہ وہی راحت و آرام ہے اے اہلِ شعور — جس کی دھن میں زنِ جاہل ہوئی تجکو منظور
گھر کی بی بی کا ہو جب دیدۂ باطن بے نور — اس کو کیا علم کہ تیرے لئے راحت ہے ضرور
کیسے ممکن ہے سمجھ میں نہیں آتا واللہ

زوجۂ جاہلہ و شوہرِ عالِم کا نباہ

ماتم ترکی و ایراں سے وہاں جامہ دری — یاں پھٹے چیتھڑے اور مشغلۂ بخیہ گری
شیر اسے معرکہ آرا ہے وہاں مردِ جری — دیکھ کر غوک کو یاں ہائے مری ہائے مری
شوقِ طیّارے میں اُڑنے کا شب و روز وہاں
ریل کے نام سے اُٹھتا ہے یہاں دل میں دھول

تیری اہلیہ جو بے علم ہے مردِ معقول — پسرِ خادمِ ملّت کی توقع ہے فضول
ماں کی آغوش ہے بچّہ کا وہ پہلا اسکول — جس کے اسباق کی تا مرگ نہیں ممکن بھول
دور ہوتا اثرِ جہل گر اس مکتب سے
ہم نہ رہتے صفِ اقوام میں پیچھے سب سے

زندگانی ہے جن اقوام پہ سو جاں سے نثار — جن کی ہے حرّیت اک بندۂ فرماں بردار
مڑ گئی جن کی طرف توسنِ عزّت کی مہار — پھر گئی جن کی طرف چشمِ رضائے غفّار
پیچھے قابض ہوئیں زینت کدۂ دنیا پہ
پہلے پہنایا خواتین کو علمی زیور

کرۂ ارض کا وہ خطّہ محکوم و غلام — دونوں ہاتھوں سے ترقّی نے کیا جس کو سلام

جس کو کہتے تھے کبھی "منزلِ وحی والہام" — گونجتا تھا کبھی توحید کا جس میں پیغام

جس پہ اب قہر خداوند ہے رحمت کی جگہ
جس کو اب لوگ کہا کرتے ہیں عبرت کی جگہ

صنفِ نازک کے ستانے سے ہوئی اُس کی یہ گت — کہ نہ عزت ہے نہ دولت ہے نہ علم و حکمت
عملِ زشت کا گردن میں ہے طوقِ لعنت — پاؤں ہیں بستۂ تارِ رسنِ عہدِ پست

یوں تو مشرق کی ہر اک قوم ہے ادبار میں فرد
حالِ مسلم ہے مگر سب سے زیادہ پُر درد

اب وہ محکوم ہے تھا خیر امم جس کا لقب — امر بالعرف نہ ہو نہی عن المنکر اب
مجھ سے پوچھے جو کوئی اس کی غلامی کا سبب — سلبِ آزادیِ عورات کہوں گی بہ ادب

چین تجھکو نہ ملا میرے ستانے والے
تو بھی ٹھنڈا نہ رہا جی کے جلانے والے

گورِ غریباں کی سیر (سودا)

اک روز سیر گورِ غریباں کو میں گیا — یعنی وہاں بزرگوں کا اکثر مزار ہے
دیکھا تو ایک گور پہ نرگس ہے سرنگوں — پوچھا میں اُس سے یہ کہ تو کیوں شرمسار ہے
اُس نے کہا عزیز تو نرگس مجھے نہ جان — آنکھیں ہیں اُس کی ہول کہ یہ جس کا مزار ہے
جب میں کہا کہ میری طرح سرنگوں ہے کیوں — اور اس قدر یہ کس کا تجھے انتظار ہے
تب تو یہ اُس نے مجھ سے کہا سن کے بے خبر — یہ بات تو ہر اک کے اوپر آشکار ہے
عاشق تھا ایک کافرِ بے پیر کا یہ شخص — اب تک اُسی کا اس کے تئیں انتظار ہے

سودا مجھے یقین ہوا اب ستی کہ آہ
عاشق کو بعد مرگ کے بھی انتظار ہے

شاعر اور روزِ ہجر (سودا)

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کی ان دنوں — تو بھی ٹک اس کو جا کے ستمگار دیکھنا
نے حرف و نے شکایت و نے شعر و نے سخن — نے سیرِ باغ و نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب — تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
یا جا کے اس گلی میں جہاں تھا ترا گزار — لے صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا
تسکینِ دل نہ اس میں جو پائے تو بہرِ شغل — پڑھنا یہ شعر گر کبھی اشعار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو
پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

نیا سال اور نئی امیدیں (سرور جہاں آبادی)

صبحِ بہار لے کر پھولوں کا ہار آئی — دوشِ صبا پہ نکہت ہو کر سوار آئی
پہلو میں پھر مسرّت بن کر نگار آئی — مردہ دلوں کے قالب میں جانِ زار آئی
پھر سالِ نو نویدِ عیشِ دوام لایا
نوروز پھر خوشی کا ہم کو پیام لایا
دورِ افق پہ سورج نوروز کا پھر آیا — پھیلا کے اپنی کرنیں ذرّوں کو جگمگا
پھر صبحِ آرزو نے جلوہ ہمیں دکھایا — خوابیدگانِ شب کو پھر نیند سے جگا

پھر جوشِ حبّ قومی اُٹھا اُمنگ ہو کر
آئی وطن کی الفت دل میں ترنگ ہو کر

کونپل نئی نکالی ہر نخلِ بوستاں نے — بدلا بہار کا پھر جوڑا نیا خزاں نے
دورِ کہن کو پلٹا پھر گردشِ جہاں نے — چھیڑا نیا ترانہ یارانِ نکتہ داں نے

پھر سالِ نو کے مقدم کا غل ہے انجمن میں
نوروز کا ہے طوطی پھر بولتا چمن میں

کروٹ بدل رہا ہے سبزہ کنارِ جو پھر — پھولوں میں بھینی بھینی ہے عطر کی سی بو پھر
نوروز کے ہے لب پر بلبل کی گفتگو پھر — شاخوں پہ ہیں چہکتے مرغانِ خوش گلو پھر

آئی بہارِ تازہ پھر باغِ آرزو میں
نزہت بھری ہوئی ہے پھولوں کی رنگ و بو میں

دورِ نشاطِ گردوں پھر دورِ جامِ جم ہے — پھر خارزارِ ہستی گلدستۂ ارم ہے
خاموش انجمن میں بانگِ خروشِ غم ہے — اُٹھو کہ سونے والو فرصت کا وقت کم ہے

دل کو نئی اُمنگیں پھر گدگدا رہی ہیں
پھر سالِ نو کی خوشیاں ہمت بڑھا رہی ہیں

خوابِ گراں سے چونکو ہندوستان والو — پستی میں کیوں پڑے ہو اوجِ نشان والو
کب تک یہ آہ ذلت اے عز و شان والو — کب تک یہ خوابِ غفلت سونے کی کان والو

خلدِ بریں کے جھونکے تم کو جگا رہے ہیں
رحمت کے آسماں سے پیغام آ رہے ہیں

اُٹھ کر ذرا تو دیکھو دنیا کا رنگ کیا ہے — رفتار کیا جہاں کی قوموں کا ڈھنگ کیا ہے

ہے حفظِ وطن کیا شئے ناموس و ننگ کیا ہے — ایثارِ نفس کیا ہے قومی امنگ کیا ہے
قومی ترقیوں کا کچھ راز تو ہے آخر
حبِّ وطن میں کر دو دل کو گداز آخر

موسمِ بہار کا آخری گلاب (سرور جہاں آبادی)

یہ آخری گلاب کا ہے یادگار پھول — بے کس غریب فرقتِ احباب میں ملول
اور شاخ پر کھلا ہوا تنہا چمن میں ہے — دھندلا سا اک چراغِ سحر انجمن میں ہے
ہے کوئی غم گسار نہ ہمدم کوئی قریں — رخصت ہوئے چمن سے رفیقانِ ہم نشیں
بچپن کے آشنا ہیں نہ وہ خانداں کے پھول — بکھرے پڑے ہیں خاک پہ اب گلستاں کے پھول
ننھی سی کوئی آہ کلی بھی نہیں قریب — کچھ دردِ دل کا حال کہے جس سے غم نصیب
ڈالے جو عکس پھول سے رخ کا غریب پر — جو اس کی آہِ سرد کو سن کر ہو نوحہ گر
مرجھانے دوں گا تجھکو میں تنہا نہ شاخ پر — احباب سو رہے ہیں جہاں تیرے بے خبر
ڈر ہے نہ کنج میں تری مٹی خراب ہو — جا بھی اور ان کے ساتھ ہم آغوشِ خواب ہو
کب تک زباں پہ فرقتِ احباب کا گلہ — ہیں محوِ خوابِ مرگ جہاں تیرے آشنا
اب تیری پتیاں میں بچھاتا ہوں خاک پر — تجھکو بھی ان کے ساتھ سلاتا ہوں خاک پر
رخصت سفر اٹھاؤں گا میں بھی جہاں سے جلد — چھوٹوں گا مر کے ہجر کے دردِ نہاں سے جلد
احباب مجھ سے جب مرے ہو جائیں گے جدا — تنہا کوئی جہاں میں جیا بھی تو کیا جیا
کیا لے کے کوئی آہ کرے عمرِ جاوداں — یارانِ رفتہ کا ہے زیارت کدہ جہاں
سلکِ وفا میں جب نہ رہے دُرِّ آب دار — میری بھی بے کسی کا بنے گا وہیں مزار

درسِ عمل (عبد المجید صاحب سالک)

کامرانی کا سرآغاز ہے انجامِ عمل
صبحِ عشرت جسے کہتے ہیں وہ ہے شامِ عمل

موت کیا چیز ہے بیکاریِ اعضاء و حواس
زندگی کیا ہے یہی کاوشِ انجامِ عمل

سعیِ پیہم سے خدا کا بھی ہے ملنا آسان
ذروۂ عرشِ معلیٰ ہے لبِ بامِ عمل

کامراں منزلِ عقبیٰ پہ وہی پہنچیں گے
جو رہے وادیِ دنیا میں سبک گامِ عمل

کوئی گوشِ شنوا ہو تو سنے یہ آواز
ہر نواسازِ حوادث کی ہے پیغامِ عمل

وہی طائر ہیں چمن زارِ جہاں میں آزاد
زندگی جن کی گزرتی ہے تہِ دامِ عمل

یوں تو تاریخ ہے لبریز حکایات مگر
حاصلِ زندگیِ قوم ہیں ایامِ عمل

فطرۃ اللہ مخالف ہے تن آسانی کی
دینِ اسلام ہے مجموعۂ احکامِ عمل

جب کیا ترکِ عمل حاملِ قرآں ہو کر
ساری دنیا میں ہوئے خوار مسلماں ہو کر

کیا کبھی غور کیا مسلمِ دانا تو نے
کارنامے گئے آفاق میں کیا کیا تو نے

تھی تپاں جس کی تجلی کے لئے ہستیِ عشق
ہائے وہ حسن کیا وقفِ تماشا تو نے

تیرے دیوانوں سے آباد ہوا دشتِ جنوں
گوشہ گیروں کو کیا بادیہ پیما تو نے

روزہ رکھ کر جو پڑھیں تیغ کے سائے میں نماز
ایسے زہاد کئے دہر میں پیدا تو نے

دن کو تھے تخت پہ اور رات کو سجادے پر
اہلِ دنیا کو کیا طالبِ عقبیٰ تو نے

آہ وہ دن نہ رہے اور وہ زمانے بھی گئے
ہائے وہ رات بھی گزری وہ فسانے بھی گئے

اب جو چاہے وہی عظمت تو جگہ پیدا کر — زورِ بازو میں، دعاؤں میں اثر پیدا کر
اسی پانی سے ہری کشتِ تمنا ہوگی — ابرِ نیساں کی طرح دیدۂ تر پیدا کر
تابکے طوقِ غلامی میں رہے گی گردن — جس میں سودائے حکومت ہو وہ سر پیدا کر
روئے گا بے پر و بالی پہ قفس میں کب تک — ہے اگر خواہشِ پرواز تو پر پیدا کر
اُٹھ کے جو خرمنِ دشمن پہ گریں برق صفت — خاک میں اپنی وہ جاں سوز شرر پیدا کر
آبرو دار ہیں آپس میں جو رکھتے ہیں ملاپ — سب سے رشتہ صفتِ سلکِ گہر پیدا کر
لے کے خورشیدِ جہاں تاب سے مقراضِ شعاع — دامنِ شب میں گریبانِ سحر پیدا کر

رونقِ محفلِ ایّام دو بالا کر دے
اس سیہ خانۂ عالم میں اُجالا کر دے

بابا آنکھیں دیتا جا (سیماب اکبر آبادی)

گر خدا خود راستے میں آ گئے ہو جلوہ نما — اور ہو مخلوق کو عین الیقیں اس بات کا
پھر مخاطب کر کے ہر رہرو کو وہ یہ حکم دے — تو اگر میرا ہے آنکھیں اپنی دیتا جا مجھے
ہے یقیں بندے جو اگر آنکھ جائیں گے نکل — دیدہ و دانستہ اس پہ کون کرتا ہے عمل
سینما والے مگر ہر شہر میں لیل و نہار — دعوتِ اہلِ نظر کا دے رہے ہیں اشتہار
آؤ حسن و عشق کے پُر درد افسانے سنو — رقص دیکھو پردۂ سیمیں پہ اور گانے سنو
لوگ اُٹھتے ہیں اس آوازِ دل سے رشتے جوڑنے — روز راتوں کو کھلے جاتے ہیں آنکھیں چھوڑنے
ایک ہی مرکز پہ ہیں مزدور اور سرمایہ دار — جیب پر دونوں ہی پڑتا ہے بقدرِ ظرف بار
اس غلام آباد کا یہ کرّ و فر تو دیکھئے — مال و زر کے ساتھ ایثارِ نظر تو دیکھئے

اس پہ شکوہ کم نگاہی کا ہے ہندوستاں کو
دے خدا چشمِ بصیرت کاش اس ناداں کو

سینما، ٹاکی، تھیٹر، غارت ہوش و نظر
شب میں یہ لہو و لعب اے بے بصیرت الحذر

پردۂ سیمیں تو اصلاً اک سنہری ہے فریب
چلتی پھرتی چند تصویریں حسین و دیدہ زیب

ہاتھ چھو سکتا نہیں، آغوش بھر سکتی نہیں
روح اپنے ذوق کی تسکین کر سکتی نہیں

جذبۂ جرم و ہوس کاری بڑھانے کے لئے
سینما ہیں ایک لعنت اس زمانے کے لئے

اک زمانہ ہے نظر سوزی کی علت میں اسیر
نوجوانوں کو ہوئی ہے آج عینک ناگزیر

ہو نہیں سکتا بصارت میں اضافہ نور کا
ان کو ناکافی ہے سرمہ سارے کوہِ طور کا

اختیاری جس قدر تخریب کے اسباب ہیں
ترک کر دیں ان کو ایسے نوجوان کمیاب ہیں

دیدہ و دانستہ جب انساں ہو خود ہی تباہ
کون کہہ سکتا ہے اس جذبے کو فطرت کا گناہ

ہے تماشا رات کو دن کو طبیعت منتشر
خود بہ خود زر دادن و از خود خریدن دردِ سر

قدر کر آنکھوں کی اپنے مال و زر کی قدر کر
یہ نظر نعمت ہے دنیا میں نظر کی قدر کر

جو نظر نذرِ خدا کرنے سے گھبراتا ہے تو
مفت یوں اُس کے لٹانے کو کہاں جاتا ہے تو؟

دعائیں (سیماب اکبرآبادی)

خُدا سے سب کے لیے التجائیں کرتا ہوں
فقیر گوشہ نشیں ہوں دعائیں کرتا ہوں

جب اپنے آئینہ خانے میں دیکھتا ہوں میں
اک انقلاب زمانے میں دیکھتا ہوں میں

ہوا و حرص سے دنیا کا ہے سیاہ ضمیر
وبائے خود غرضی ہے جہاں میں عالم گیر

خطا روی پہ زمانے کی اشک بار ہوں میں
زوال عالم ہستی کا سوگوار ہوں میں

مری نگاہ میں مشرق کی زیردستی ہے
مری نگاہ میں مغرب کی خود پرستی ہے

مری نظر میں ہے ماضیٔ ملتِ مرحوم
مری نظر میں ہے تحلیل امتِ معصوم

مری نگاہ میں فطرت کا کارخانہ ہے
مرے خیال میں مستقبلِ زمانہ ہے

خدا کے سامنے خم ہے سر نیاز مرا
نیاز شوخیوں پر ہے بہ قدرِ ناز مرا

تصورات کی خلوت میں سر خمیدہ ہوں
تپیدہ ہوں غمِ عالم سے آب دیدہ ہوں

حرم رسول کا ہے مرکزِ نظر میرا
اس آسرے سے سرِ عرش ہے گزر میرا

مری دعائیں ہیں کونین کے لئے تسکین
کہو فرشتوں سے ہر لفظ پر کہیں آمین

جہانِ امن و سلامت کی جستجو ہے مجھے
سکونِ ارضِ الٰہی کی آرزو ہے مجھے

وہ انقلاب جو عیشِ جہاں فزوں کر دے
وہ انقلاب جو دنیا کو پُرسکوں کر دے

قبولیت کی ضمانت قوی و روشن ہے
رسول کا مرے دستِ دعا میں دامن ہے

مآلِ غفلتِ اہلِ جہاں سے ڈرتا ہوں
فقیرِ گوشہ نشیں ہوں دعائیں کرتا ہوں

میرا ہم خرامِ شب (سیماب اکبرآبادی)

رات کو جب اضطرابِ دل سے گھبراتا ہوں میں
اپنی خلوت چھوڑ کر تنہا نکل جاتا ہوں میں

ہو کا اک عالم نظر آتا ہے ہر جانب مجھے
خوف سے لبریز سناٹے میں تھراتا ہوں میں

چاہتا ہوں کوئی تنہائی میں میرا ساتھ دے
ہر طرف اپنا خیال اس وقت دوڑاتا ہوں میں

پھول خوابیدہ نظر آتے ہیں بلبل پر سکوت
جگنوؤں کو نیند کی آغوش میں پاتا ہوں میں

بزمِ حسنِ ناز سے ہوتے ہیں گوناگوں حجاب — خوابگاہِ دوست تک جاتا ہوں لوٹ آتا ہوں میں
رحم کوئی میرے حالِ زار پر کھاتا نہیں — اور تاریکی میں لاکھوں ٹھوکریں کھاتا ہوں میں
کون اندھیری رات میں میرا شریکِ راہ ہو — بے محل آوارگی سے اپنی شرماتا ہوں میں
میں کبھی اک آہ بھر لیتا ہوں سینہ تھام کر — زیرِ لب نغمہ محبّت کا کبھی گاتا ہوں میں
جب زمیں خالی سکوں سے مجھکو آتی ہے نظر — جانبِ گردوں نگہ کی گود پھیلاتا ہوں میں

زرد رنگ اک دیدۂ بے خواب آتا ہے نظر
رات کی آغوش میں مہتاب آتا ہے نظر

منزلوں اُس کی رفاقت میں گزر جاتا ہوں میں — یہ بھی میرے ساتھ جاتا ہے جدھر جاتا ہوں میں
تیرتا ہے یہ بھی میرے ساتھ موجِ آب پر — جب لگی دل کی بجھانے نہر پر جاتا ہوں میں
روشنی اس کی بڑھا دیتی ہے محویّت مری — جھولتا کرنوں میں تاحدِّ نظر جاتا ہوں میں
نغمۂ خاموش یہ اپنا سناتا ہے مجھے — جب سر افگندہ میانِ رہ گزر جاتا ہوں میں
دیکھتا ہوں اس کو اپنے سامنے ٹھیرا ہوا — شدّتِ واماندگی سے جب ٹھہر جاتا ہوں میں
دور تک آئینہ بن جاتی ہے صحرا کی فضا — صورتِ دیوانۂ حیرت نگر جاتا ہوں میں
یہ نہ ہو ہمراہ تو اک گام چلنا ہو محال — دل بر آتش جاں بہ لب سودا بسر جاتا ہوں میں
میرے اور اس کے سوا رہرو نہیں ہوتا کوئی — چلتے چلتے اپنے سائے سے بھی ڈر جاتا ہوں میں
یہ مجھے پہنچانے آتا ہے درِ کاشانہ تک — خلوتِ تاریک میں جب لوٹ کر جاتا ہوں میں

اس کا مجنوں ہے جنونِ ناتمامِ شب مرا
ہے رفیقِ بے کسی یہ ہم خرامِ شب مرا

نقصِ ہستی

(سیماب اکبرآبادی)

مری ہستی نہیں کچھ بھی مگر اے خالقِ ہستی — حقیقت کیوں نہ تجھ پر کھول دوں دنیائے فانی کی
حریص اس درجہ فطرت کیوں ہوئی تخلیقِ انساں پہ — نہ تھی جب خود ہوس اس کو نشاطِ زندگانی کی
یہ بحرِ آفرینش کا ستم ہے یا عنایت ہے — کہ طوفانوں میں آکر گھر گئی اک بوند پانی کی
مری مجبوریاں دیکھ اور جبر و اختیار اپنا — بہت صبر آزما ہے آزمائش بے زبانی کی
تجھے یہ فکر پھر محفل میں تیری لوٹ آؤں میں — مجھے باایں ہمہ حسرت حیاتِ جاودانی کی

چو لذت آشنائے جرعۂ آبِ بقا کردی
ز یک جامِ بقا لب تشنۂ صد میکدہ کردی

نظامِ ناقصِ تخلیق کی تکمیل ہو جاتی — اگر انسان دنیا میں نہ مجبورِ فنا ہوتا
مجسّم ہو کے ملتی باریابی تیری محفل میں — ملا تھا روح کو پیکر تو کیوں اس سے جدا ہوتا
چلا آتا کسی ترکیب سے دنیا کو سمجھا کر — نہ یہ شورِ فغاں ہوتا نہ یہ ماتم بپا ہوتا
ہم اک لمحے میں مثلِ روح تیرے پاس آجاتے — زمیں سے عرش تک اک نور کا جھولا پڑا ہوتا
زمیں کیوں بارِ اجسام سے ہوتی پراگندہ — فلک کیوں دیکھ کر یہ سانحے نوحہ سرا ہوتا

غلط راہست راہِ گور پیشِ کاروانِ تو
فنا با جانِ او ہرگز نمی ارزد بجانِ تو

نہ ہو گر تو خفا، تو آج میں یہ بات بھی کہہ دوں — زوالِ ہستیِ انسان کمالِ نقصِ ہستی ہے
نہ ہوں کیوں موت پر قادر جو قادر زندگی پر ہو — طرازِ خلق پر ذہنیتِ مخلوق ہنستی ہے
ہو کوئی پیرہن، مقصود تیرے پاس آنا ہے — نظر بزمِ ازل کی سیر کو سب کی ترستی ہے

وہ اِک قانون جس سے موت کا سا خوف طاری ہو　　خلافِ دل نوازی جذبۂ قوّت پرستی ہے
زمیں پر عرش سے آنا، زمیں سے قبر تک جانا　　یقیناً موت بعدِ موت، پستی بعدِ پستی ہے

شکایت نقص ہستی می کنند، عزم تلافی کن
قوانینِ فنا را جذبِ الطافِ اضافی کن

اپنی حقیقت (وحید الدین سلیم)

ہے مرے جذبات کا ہنگامہ برپا دہر میں　　ظالم و جاہل ہوں لیکن رونقِ محفل ہوں میں
رہ روی اور گمرہی دونوں ہیں میری ذات میں　　ہادیِ منزل ہوں میں سرگشتۂ منزل ہوں میں
دشت میں کرتا ہے خود ابرِ کرم میری تلاش　　ناز ہے مجھکو کہ ایسا تشنہ لب ساحل ہوں میں
میری ہستی کے ہے پردے میں چھپا سورج مگر　　اس دھندھلکے کی حقیقت سے ابھی غافل ہوں میں
فلسفے نے میری ہستی پر نظر ڈالی مگر　　حل نہ ہوگی جو کسی صورت سے وہ مشکل ہوں میں
مجھ پہ کیوں ہوتا ہے طاری جذبۂ ناز و غرور　　صانعِ کامل کی شاید صنعتِ کامل ہوں میں

ڈال مجھ پر اک نظر اے نخل بندِ کائنات
تیرے کشتِ آرزو کا آخری حاصل ہوں میں

بادِ صبا (وحید الدین سلیم)

کہتی ہے بادِ صبا صحرا میں جب آتی ہوں میں　　سبز مخمل کا بچھونا سا بچھا جاتی ہوں میں
صحنِ گلشن میں اگر رکھتی ہوں میں آکر قدم　　کھیلتی پھولوں سے ہوں غنچوں کو بہلاتی ہوں میں
سیر کرنے کو نکلتی ہوں میں اکثر صبحدم　　نوجوانانِ گلستاں کو جگا آتی ہوں میں

چھوڑ کر خشکی کو آتی ہوں تری کی سمت جب
موج کے شانے سے زلفِ بحر سلجھاتی ہوں میں

عطر بھر دیتی ہوں میں کلیوں میں چٹکا کر انھیں
اپنی ان تر دستیوں پر آپ اتراتی ہوں میں

جنگلوں میں تند ہو کر کرتی ہوں ہل چل بپا
گلشنوں میں ناز سے چلتی ہوں اٹھلاتی ہوں میں

فصلِ گل میں کرتی ہوں جب میں جوانوں پر گزر
عیش کے جذبات کو سینوں میں اُکساتی ہوں میں

سبزہ زاروں میں لٹا آتی ہوں شبنم کا گہر
لالہ زاروں میں پہنچ کر پھول برساتی ہوں میں

عاشقوں کے کنجِ عزلت میں پہنچتی ہوں اگر
آتشِ غم کو دلوں میں اُن کے بھڑکاتی ہوں میں

کر کے روشن شمع پروانے کو دیتی ہوں خبر
گوشِ گل تک نالۂ بلبل کو پہنچاتی ہوں میں

کرتے لاسلکی اشارے ہیں جو یہ اہلِ فرنگ
ساتھ بجلی کے پہنچ کر اِن کو پھیلاتی ہوں میں

نیم شب میں سرد جھوکے جب گزرتے ہیں مرے
آنکھ اکثر پہرہ داروں کی بھی جھپکاتی ہوں میں

میں درختوں کی رگوں میں دوڑتی ہوں بن کے خون
نو عروسانِ چمن کا رنگ چمکاتی ہوں میں

گدگداتی ہوں حسینوں کو میں اکثر صبح دم
چپکے چپکے پاؤں معشوقوں کے سہلاتی ہوں میں

آبشاروں کو سکھاتی ہوں ترنم کوہ پر
ساتھ دے کر اُن کو خود بھی ناچتی گاتی ہوں میں

مل کے فواروں کی دھاروں میں اُڑاتی ہوں انھیں
چل کے چشموں کے کنارے ان کو چھلکاتی ہوں میں

کر کے طے زینے پہاڑوں کے پہنچتی ہوں اگر
چوٹیوں کے برف کے تودوں کو پھسلاتی ہوں میں

کرتی ہوں شاداب میں پژمردہ پودوں کو کبھی
تشنہ لب پھولوں پہ شبنم آ کے ٹپکاتی ہوں میں

آتی ہوں جب فصلِ گل میں لے کے پیغامِ بہار
دشتِ عریاں کو لباسِ سبز پہناتی ہوں میں

جب نمازِ صبح کی ہوتی ہیں آوازیں بلند
غافلانِ صبح دم کو آ کے ٹھکراتی ہوں میں

بادِ طوفاں بن کے جاتی ہوں جہازوں پر اگر
ایک عبرت کا تماشا سب کو دکھلاتی ہوں میں

رہگزاروں میں دکھاتی ہوں تماشائے سراب
نیستاں میں آگ کے شعلوں کو دوڑاتی ہوں میں

عاشق و معشوق کا آتا ہے جب وقتِ وداع
اشک کے قطروں کو رخساروں پہ ڈھلکاتی ہوں میں

شاخ جو کملا گئی ہو اس کو کرتی ہوں نہال
آگ جو کجلا گئی ہو اس کو سلگاتی ہوں میں

پھول جو خود رو اگا کرتے ہیں دشت و کوہ میں
ان کی خوشبوؤں سے اک عالم کو مہکاتی ہوں میں

سینچتی ہوں آبِ باراں سے ہزاروں کھیتیاں
جھومتے بادل سمندر سے اُڑا لاتی ہوں میں

گدگدانے سے مرے ہوتے ہیں طائر نغمہ زن
چھیڑ دیتی ہوں انھیں خاموش اگر پاتی ہوں میں

سانس کے رستے اُتر کر جسمِ حیوانات میں
زندگی کی آگ کو ہر وقت دہکاتی ہوں میں

پیغامِ عمل (وحید الدین سلیم)

مثلِ پروانہ تم اک پل میں نہ جلنا سیکھو
تا سحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو

دل کو کرنا ہے اگر سوزِ محبت میں کباب
کروٹیں آگ کے بستر پہ بدلنا سیکھو

زندگی نام ہے حرکت کا تم افسردہ نہ ہو
نبض کے خون کی مانند اُچھلنا سیکھو

عزم جو دل میں ہو پورا اُسے تم کر کے رہو
طفلِ سرکش بنو اور ضد سے مچلنا سیکھو

چشمۂ آب ہو تم سوتے ہو کیوں زیرِ زمیں
سنگِ خارا کے شگافوں سے اُبلنا سیکھو

نہ ڈرو صدمۂ طوفان سے مانند نہنگ
ورطۂ بحر کے آغوش میں پلنا سیکھو

آنچ سے رنج و مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو
موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنا سیکھو

ہے کٹھن منزلِ تسلیم تو پروا کیا ہے
سر کے بل دھار پہ تلوار کی چلنا سیکھو

کلفتِ دہر سے کیوں ناک چڑھاتے ہو ابھی
اس مئے تلخ کے دو گھونٹ نگلنا سیکھو

ہو کے پامالِ حوادث نہ ترقی سے رکو
دوب کی طرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو

خوفِ خدا (شہیدی)

خلوت میں پا کے اُس سے کہا میں نے ایک رات
کچھ صبر آج دل میں ذرا دیکھتا نہیں

دربند ہم نشیں کو نشے کی ہے بے خودی
یاں کوئی میرے تیرے سوا دیکھتا نہیں

آنکھوں میں آپ شمع کی چربی ہے چھا رہی
گل خود ہے زر خرید ترا دیکھتا نہیں

اس پر بھی گر ہو وہم تجھے شمع گل کر دوں
اے جان پھر تو کوئی بھلا دیکھتا نہیں

بولا کہ اتنے روزوں سے صحبت ملی تجھے
پر حیف تو مزاج مرا دیکھتا نہیں

تیرے اگر لحاظ و ادب پر پڑا نقاب
کم بخت میری شرم و حیا دیکھتا نہیں

گل چشم نیم باز سے ہے تک نہیں رہا
پروانہ پائے شمع پڑا دیکھتا نہیں

اے بے خبر اندھیری اجالے کے کام کو
دیکھے نہ دیکھے کوئی خدا دیکھتا نہیں

عشق کی باتیں (شیفتہ)

کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز
تلوّن سے ہے تم کو مزا کیا

کبھی مجھ پر عتاب بے سبب کیوں
کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا

کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں
کبھی یہ غمزہ ہائے جانفزا کیا

کبھی تمکینِ صولت آفریں کیوں
کبھی یہ غمزہ ہائے جانفزا کیا

کبھی شعروں سے میری نغمہ سازی
کبھی کہنا یہ تم نے ہے کہا کیا

کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا
کہ کیا طاقت جو پوچھوں میں خطا کیا

کبھی اس دشمنی پر بہر تسکیں | پئے ہم جلوہ ہائے دل ربا گیا
یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلف | جواب اک مختصر مجکو دیا گیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

جنزرومد (شبلی نعمانی)

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید | سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں
رہنماؤں کی یہ تحقیر یہ اندازِ کلام | اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر | اس میں کچھ قابلِ تسلیم و سند ہے کہ نہیں
نکتہ چینی کا یہ انداز یہ آئینِ سخن | بزمِ تہذیب میں مستوجبِ رد ہے کہ نہیں
جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ | کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں
شاعروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط | اس میں ان پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں
پہلے گر شانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری | اس دورا ہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں

فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تو لوں
جنزر جیسا تھا اسی زور کا مد ہے کہ نہیں

شغلِ تکفیر (شبلی نعمانی)

اک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ | کچھ حالتِ یورپ سے خبردار نہیں ہیں
آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں | ہر چند ابھی مائل اظہار نہیں ہیں

تقلید کے پھندوں سے ہوئے جاتے ہیں آزاد
وہ لوگ بھی جو داخلِ احرار نہیں ہیں

جو نام سے اسلام کے ہو جاتے ہیں برہم
ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں

افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا
یا ہیں تو بقول آپ کے دیں دار نہیں ہیں

کیا آپ کے زمرے میں کسی کو نہیں یہ درد
کیا آپ بھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں

جھلا کے کہا یہ کہ یہ کیا سوءِ ادب ہے
کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں

نوحہ (شبلی نعمانی)

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھّے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کی گر فلک نے کر دئیے پرزے
فضائے آسمانی میں اُڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہیدِ نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے اُستادو!
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزئ طوفانِ بیداد و بلا تا کے
یہ لطف اندوزئ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خونچکاں کب تک

یہ مانا گرمیِ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خوں سے سینچیں گے تمھاری کھیتیاں کب تک

عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا نشاں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں، زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

قلم (شاد عظیم آبادی)

اے قلم طرۂ دستارِ فصاحت تو ہے
شانۂ کاکلِ سلمائے بلاغت تو ہے

شمعِ ظلمت کدۂ فہم و فراست تو ہے
کاشفِ پردۂ اسرارِ شہادت تو ہے

چُن کے دریائے حقیقت کا گُہر لائے گا
جب ذرا غرق ہوا تھہ کی خبر لائے گا

باکمالوں کا شفیق، اہلِ ریاضت کا رفیق
رازدارِ حکما، خازنِ اہلِ تحقیق
ہے تری نوکِ زباں شرحِ مضامینِ تحقیق
تیری رفتار متیں، چال تری نستعلیق

جس سے مطلب ہو اُسی بات کو چُن لیتا ہے
لب تک آتی نہیں آواز کہ سُن لیتا ہے

نوحۂ پیری (شاد عظیم آبادی)

پیری ہے بلائے ناگہانی
ڈر کر کہیں چھپ رہی جوانی

سعدی وہم ہے لطفِ زندگانی
بس طولِ حیات! مہربانی

سوتا سفسار جاگتا رب
سچّی تھی اسی قدر کہانی

اب ایک کا بھی پتا نہیں ہے
چھوڑی تو بہت سی تھی نشانی

بے بال و پری ہوئی نہ افسوس
مرنے پہ بھی جنّت آشیانی

تصویر تری ہے اب بھی دل میں
اے مجمعِ دوستانِ جانی

آنا ہو تو آ کہاں تلک صبر
اے وجہِ بقائے زندگانی

منوا دیا سب کو ہاں یہ مانا
تو نے مگر ایک بھی نہ مانی

باقی ہے بلائے خاکِ گلشن
بالائے بلائے آسمانی

بے لطف گزر گئی تو افسوس
اے لطفِ فضائے زندگانی

کیا تھا مرے مرنے والے دل میں
اک آن فقط تھی وہ بھی آنی

موقوف ہے شاید اُس جہاں پر ۔ اے روح بقائے یار جانی

جب سے ہوئے شعر فہم رخصت
موقوف ہے شاد شعر خوانی

اندیشۂ طوفاں (شاد عظیم آبادی)

بیاں اپنی کشتی کا ہم کیا سنائیں ۔ غضب کے تھے طوفاں غضب کی ہوائیں
وہ غل رعد کا اور گھپ وہ اندھیرا ۔ نہ اُس کا علاج اور نہ اُس کی دوائیں
نہ آنکھوں میں نور اور نہ طاقت دلوں میں ۔ خطرناک چاروں طرف کی صدائیں
بہت سے پہاڑ آب دریا میں مخفی ۔ یہ تختے ہیں بوسیدہ ٹھوکر نہ کھائیں
نہنگ اپنے منھ کو بہ صد شوق کھولے ۔ کہ پائیں کسی کو تو لقمہ بنائیں
کہیں تم سے کیا حال اس بیکسی کا ۔ تھکیں ڈھونڈھ کر ناخدا کو نہ پائیں
چلے جائیں بے تھاہ دریا کے اندر ۔ ذرا بھی تلاطم میں گر ڈگمگائیں
یہ وحشت کہ ڈوبے نہ چکرا کے کشتی ۔ اگر کچھ بھی ہاتھوں کو اپنے ہلائیں
بجز اس کے کیا ہے کہ سب مل کے گائیں ۔ بھروسا ہے جس کا اُسی سے دعائیں

کنارے لگی آکے اے شاد کشتی
اُترے اُترے کٹیں سب بلائیں

تعریف قلم (شاد عظیم آبادی)

صورت گر لیلائے سخن ہے قلم اپنا ۔ ہے قوت بازو یہی معنی رقم اپنا

یہ سخت مراحل ہیں رہا ہم قدم اپنا　　اک عمر سے ہمدم ہے یہ والا ہمم اپنا
اس دوست نے چھوڑا نہ کبھی ساتھ ہمارا
لغزش میں پکڑتا ہے یہی ہاتھ ہمارا

اِک عمر سے ہے حاملِ الفاظ و معانی　　باقی ہے یہی اگلے زمانوں کی نشانی
پیری میں لہو ہوتا ہے جوں جوں مرا پانی　　بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور اس کی جوانی
ہمّت کے علاوہ مجھے طاقت بھی سوا دی
بجھنے لگی جب شمع تو لو اور بڑھا دی

شان اس کی سوا سب سے، ہیں انداز نرالے　　اکثر یہی لکھ دیتا ہے جنّت کے قبالے
ہم راز ہے جس وقت تلک اپنا بنا لے　　کیا منہ جو زباں سے کوئی اک حرف نکالے
طینت کو جو پوچھو تو عجب نیک ہے اس کی
دُہری تو زبانیں ہیں یہ بات ایک ہے اس کی

سرمایۂ عزّت اسی ساتھی کی معیّت　　سرمایۂ دولت اسی منعم کی بدولت
قائم کئے رکھتا ہے یہی شانِ شرافت　　بے اس کی مدد کے نہیں آتی ہے نجابت
بے بس ہے وہی اس سے جو منہ موڑ کے بیٹھا
روئے گا لکھے کو جو اسے چھوڑ کے بیٹھا

مدارجِ دوستی (شاد عظیم آبادی)

دوستی بھی عجب اک نعمتِ ربّانی ہے　　ہیں جہاں تک صفتیں سب میں یہ لاثانی ہے
کامل انساں وہ ہے اس وصف کا جو بانی ہے　　یہی پائندہ ہے اور کل یہ جہاں فانی ہے

پست تر رفعتِ افلاک ہے اس کے آگے
یہ وہ دولت ہے کہ سب خاک ہے اس کے آگے

دوست وہ ہے نہ کبھی دوست سے جو منہ موڑے
سختیوں میں نہ کسی دوست کو دم بھر چھوڑے
دوست کے ساتھ اگر رشتۂ الفت جوڑے
زندگی بھر نہ کبھی بھول کے اُس کو توڑے

رنج پہنچے بھی تو اقدامِ شکایت نہ کرے
لغزشیں دوست سے ہو جائیں تو نفرت نہ کرے

اس طرح دوست سے ہو دوست کو الفت جانی
جیسے مل جاتا ہے ہر رنگ میں جا کر پانی
آدمی ہے وہی اس وصف کا جو ہو بانی
یہ صفت بھی ہے بشر میں صفتِ وجدانی

دوستی طبع میں ہو مہر و ولا خصلت میں
غیر اپنے ہوں وہ انداز رہے خلقت میں

ہر قدم دوست کا ہر دوست کو واجب ہے خیال
رہے یہ دھن کہ کسی دوست کو پہنچے نہ ملال
میل دیکھے جو ذرا کرے صفائی فی الحال
دل ہے آئینۂ صافی کہیں پڑ جائے نہ بال

دستِ رس دل پہ ہو جتنا اُسے جانے ہی نہ دے
بات مکروہ کوئی بیچ میں آنے ہی نہ دے

دوستی چیز ہے کیا لذتِ نفسانی ہے
جسم سے گر متعلق ہو تو جسمانی ہے
روح پر محض اثر ہو تو وہ روحانی ہے
ہو جو مذہب سے تعلق تو وہ ایمانی ہے

سب کے اسباب جدا گانہ ہیں سامان جدا
طرز و انداز جدا بات جدا شان جدا

تلقینِ صبر (شاد عظیم آبادی)

محنت سرائے عشق میں اے دوست کیا نہیں ۔ ایذا نہیں کہ سر پہ ہجومِ بلا نہیں
کہہ دو یہ قیس سے کہ شکایت روا نہیں ۔ لیلیٰ کا فصل لائقِ چون و چرا نہیں
رو رو کے خود کو موردِ خواری بنائے گا
کملی بھگو کے اور بھی بھاری بنائے گا

مادرِ ہند کے دو فرزند (شاد عظیم آبادی)

اس محتشمہ کے دو پسر تھے ۔ دونوں سے قوی دل و جگر تھے
دانا و ذکی و خوش بیاں تھے ۔ ہر طرح سے فخرِ خانداں تھے
اک لختِ جگر کا رام تھا نام ۔ خوش خو تھا بہت وہ نیک انجام
دل بندِ دوم جو نام ور تھا ۔ نام اُس کا رحیم مشتہر تھا
ہر طرح سے دونوں من چلے تھے ۔ گہوارۂ ناز میں پلے تھے
ہر شخص فریفتہ تھا اُن کا ۔ جو دل تھا وہ شیفتہ تھا اُن کا
کہتا تھا یہ دیکھ کر زمانہ ۔ دونوں سے ہے گھر نگار خانہ
دونوں ہی نیکیوں میں مشہور ۔ ہونہار ہیں دونوں چشمِ بد دور
اقبال کے ہیں سب اُن میں آثار ۔ کیوں کر نہ ہوں ماں کے گھر کے مختار
خورشیدِ سپہر سروری ہیں ۔ اورنگ نشینِ برتری ہیں
کیا کیا نہ دلوں میں ولولے ہیں ۔ کیوں کر نہ ہوں ماں کے لاڈلے ہیں

وہ مادرِ خیر جو نسکو نام
دونوں ہی سے لیتی گھر کے سب کام

کام اُن کا تھا معدلت شعاری
اک فیض تھا چار سمت جاری

پاتا تھا یہاں مراد ہر شخص
تھا فرطِ طرب سے شاد ہر شخص

تھا دفترِ ملک رام کے ہاتھ
سب کام تھا انتظام کے ساتھ

دونوں ہی کے بخت جاگتے تھے
دونوں ہی ریا سے بھاگتے تھے

تھا رام و رحیم میں زبس حُب
معدوم تھا مذہبی تعصّب

یہ اُس پہ تو اُس پہ وہ فدا تھا
ایک ایک پہ دل سے مبتلا تھا

برتاؤ تھا یہ برادرانہ
ہر کام تھا اُن کا مخلصانہ

از بسکہ دلوں میں تھی صفائی
دستار بدل تھے دونوں بھائی

رام اُس کو پکارتا یہ کہہ کر
بھائی نواب "ظلّ گستر"

تھا بس کہ رحیم دل سے شیدا
راجہ بھائی لقب دیا تھا

گر دل میں ذرا غبار آتا
بو اُس کی اگر غنیم پاتا

چڑھ آتا تھا لے کے اپنا لشکر
تا چھین لیں اُن سے مال اور زر

کر لیتے تھے جلد تر صفائی
ہو جاتے تھے ایک دونوں بھائی

یہ سن کے غنیم بھاگ جاتا
بھولے سے بھی اس طرف نہ آتا

اِس طرح سے ماں کی کی نیابت
بڑھتا رہا ملک و مال و دولت

لیکن افسوس کچھ دنوں بعد
بگڑا دونوں کا طالعِ سعد

عیش آکے ہوا شریکِ صحبت
رہتی تھی سدا جلیسِ غفلت

جاتے رہے دل سے عدل و انصاف
جس چیز کو دیکھو اس میں اسراف

پیدا ہوئی دل میں اس قدر کد ذاتوں کے بچاؤ کی نہ تھی حد
آزادی و مطلق العنانی
اس دور میں ہو گئی کہانی

اپنے ہم فنون سے ایک عرض (شاد عظیم آبادی)

اک عرض مری ہے شاعروں سے
والا نظروں سے ماہروں سے
جو نبض شناسِ علم و فن ہیں
جو واقفِ کوچۂ سخن ہیں
اے خد متیانِ بزمِ اشعار
اے جوہریانِ سر دبازار
اے رتبہ شناسِ ذی کمالاں
مرہم نہِ ریشِ خستہ حالاں
یہ فنِ شریف شاعری نام
ہوتا ہے بخیر جس کا انجام
جاتا رہا رکھ رکھاؤ اس کا
دنیا سے ہے چل چلاؤ اس کا
چھائی ہوئی حسرتیں ہیں ہر سو
نے کش ہیں تمام سر بہ زانو
دل سب کے وفورِ غم سے نالاں
بزم اُس کی ہے بزمِ خستہ حالاں
معدوم اب اس کے ہیں خریدار
اُردو کا اُجڑ رہا ہے بازار
بے سود صدا لگا رہے ہیں
بے وقت کا راگ گا رہے ہیں
سنتا نہیں کوئی اپنی فریاد
برسوں کی ریاضتیں ہیں برباد
دھن میں تری اے کمال ہم نے
کاٹے ہیں ساٹھ سال ہم نے
گو پیر ہوا یہ منھ نہ موڑا
تجکو تو جواں بنا کے چھوڑا
اس شہر میں رہ کے کی ریاضت
معدوم جہاں تھے اہلِ ہمت

میں نخلِ کمال تھا وطن میں — سرسبز ہوا نہ اس چمن میں
خیر اب یہ شکایتیں کہاں تک — پُر درد حکایتیں کہاں تک

دنیا کا بس اب نہ دم بھرو شاد
پیری ہے خدا خدا کرو شاد

برکھا رُت (شوق قدوائی)

ہو چلے تالاب لبریز اور نہریں بھر چلیں — ندّیاں اپنی حدوں سے بڑھ کے قبضہ کر چلیں
پیچ و خم کے ساتھ بہنے سے کھلا مستی کا حال — ندّیاں چلتی ہیں میدانوں میں متوالوں کی چال
کس لیے غصّے کی حالت ان پہ طاری ہو گئی — کف لبوں پر آگیا آواز بھاری ہو گئی
کیوں بھنور جگر میں ہیں موجوں کو کیوں ہے پیچ و تاب — کیوں غضب کے جوش میں آنکھیں دکھاتے ہیں حباب
مفت پا کر، کی زمیں نے ابر کی دولت تلف — کس قدر پگھلی ہوئی چاندی ہے پھیلی ہر طرف

ندّیوں کو لے گئے یوں دریا سمندر سے ملے
لے گئے ارمانوں کو عاشق جیسے دلبر سے ملے

بہار (شوق قدوائی)

پپیہے کو کہیں کوئل سے ہے بحثِ ہم آوازی — کہیں ہے کوکلا کس حُسن سے محوِ نوا سازی
کہیں ہے نغمہ زا بلبل کہیں شاما کہیں ڈھیّر — کہیں چنڈول اُڑتا اور گاتا ہے بلندی پر
کسی جا طوطیِ خوش لہجہ کی شیریں زبانی ہے — کہیں چھوٹا پرندا لال رنگیں بیانی سے
کہیں بھنگراج دل کو کھینچتا ہے خوش نوائی سے — کہیں مینائیں غل کرتی ہیں آپس کی لڑائی سے

ہزاروں رنگ کی چڑیاں ہیں شکلیں خوشنما جن کی — ادائیں دل ربا جن کی صدائیں نغمہ زا جن کی

بہار آنے سے خوش ہیں ہر طرف اتراتی پھرتی ہیں
ہوا تو ناچتی پھرتی ہے چڑیاں گاتی پھرتی ہیں

اکلِ حلال (شوق قدوائی)

نکلے ابراہیم ادہمؒ طالبِ اکلِ حلال — چھان ڈالا سب عراق آیا نہ ہاتھ ان کو کہیں
پھرتے پھرتے ہو گئے وہ جب وہاں سے ناامید — تب گئے طرطوس کو دل کش تھی جس کی سرزمیں
دس درم طے پا گئی تنخواہ ان کی ماہوار — باغبانوں میں وہ نوکر ہو گئے آخر وہیں
باغ کے مالک نے مانگا ایک دن شیریں انار — توڑ لائے وہ ترش تو جھڑکیاں خوب ان کو دیں
پھر انھیں بھیجا کہ لاؤ اب کے شیریں ڈھونڈ کر — لائے پھر بھی ترش ہی پا کر ہوا وہ خشمگیں
ان سے بولا کیا تمہیں ہے فہمِ شیرین و ترش — کتنے ناواقف ہو گو مدت سے رہتے ہو یہیں

تب دیا ان کو یہ ابراہیم ادھمؒ نے جواب
میں تو میووں کو رکھا تا ہوں فقط کھاتا نہیں

ظرفِ انسانی (شوق قدوائی)

عیسےٰ سے کیا ایک سوال آ کے کسی نے — حضرت نے دیا ہنس کے جواب اس کے سخن کا
تھا ان کا جواب اس کی تمناؤں کے برعکس — جاہل تھا وہ کمبخت اسے آ گیا غصّا
کیا کیا وہ خدا جانے لگا منہ سے اُگلنے — سب کچھ کہا جو کچھ تھا جہالت کا تقاضا
عیسیٰ کے تحمل کی کوئی حد ہی نہیں تھی — سن سن کے سب اس کان سے اُس کان اڑایا

سمجھاتے رہے اُس کو بہت نرم زباں سے
سمجھا نہ وہ دیوانہ کہ غصّہ تھا جنوں زا

یہ جوش تھا غصّے کا کہ کف آیا لبوں پر
برسات میں جس طرح سے ہو جوش پہ دریا

لوگوں نے کہا، آپ اسے منہ نہ لگائیں
بدخو ہے یہ حلم اس قدر اس سے نہیں زیبا

حلیے نے کہا اُن سے کہ جیسا ہے یہ بدخو
ایسا ہی بنوں میں یہ نہیں مجکو گوارا

کیا اُس میں ہے کیا مجھ میں ہے یہ جان گئے تم
ٹپکے گا وہی ظرف سے جو ظرف میں ہو گا

صبح کا بھولا (شوق قدوائی)

ہم کو سامانِ تشفّی مل گیا تقدیر سے
خود ہوں کاہل اور کوسیں بختِ نافرجام کو

حق پرستی چھوڑ دی رسمِ اخوّت چھوڑ دی
طاقِ نسیاں پر دھرے بیٹھے ہیں پیام اسلام کو

ہو گئے ہیں کتنے بے پروا زمانے سے کہ ہم
سمجھے ہیں لڑکوں کی پھرکی گردشِ ایّام کو

یوں ہمیں کھینچے لئے جاتی ہے ذلّت جس طرح
مچھلیوں کو پھانس کر صیّاد کھینچے دام کو

کر دیا ہے مردہ دل اتنا ہجومِ یاس نے
کچھ نہیں احساس ہی ناکامیِ دلِ ناکام کو

ہو نہیں سکتا جہاں میں اوج بے اسبابِ اوج
اتنا زینہ چاہیئے ہو جتنی رفعت بام کو

اب بھی سیدھی راہ مل جائے جو آؤ ہوش میں
ہے غنیمت صبح کا بھولا جو آئے شام کو

خُلق (شوق قدوائی)

تھے علیؒ ابنِ موسیٰؒ ایک دن حمّام میں
رنگ قطری اُن کے رُخ کا تھا بہت ہی سانولا

کچھ ضرورت خادمِ حمّام کو پیش آ گئی / چھوڑ کر حمّام میں اُن کو وہ گھر اپنے گیا
ایک وحشی آ گیا اور گھس گیا حمّام میں / وہ تھا صحرائی نہ تھا حضرت کا صورت آشنا
اُس نے نادانی سے یہ جانا کہ حمّامی ہیں آپ / یہ اُٹھا وُہ دھر و سب خدمتیں لینے لگا
آپ سب احکام کی تعمیل فرماتے رہے / جو کہا اُس نے نہ کی اُس میں ذرا چون و چرا
ہو گیا اتنے میں حمّامی پلٹ کر کام سے / سن پڑی حمّام کے اندر سے وحشی کی صدا
وہ گیا گھبرا کے اندر اور کہا نادان سے / کیا سلوک اچھے امامِ وقت سے تو نے کیا
ہنس کے حضرت نے یہ فرمایا کہ خیر اب چپ رہو / کیا خطا اس کی یہ سب ہے میری رنگت کی خطا

فائدہ دونوں کو پہنچا کوئی گھاٹے میں نہیں
اُس کو میں نے خوش کیا مجھ کو ثواب اُس نے دیا

حجّت (شوق قدوائی)

باہمی حجّت سے حجّت کے سوا کیا فائدہ / نفس پر غالب ہو ضد تو کام اُس سے کیا بنے
علم حاصل کر کے آخر جاہلانہ بحث کیوں / جس کو آنکھیں دیں خدا نے کیوں وہ نابینا بنے
خواہشِ شہرت اگر کج بحثیوں سے ہو تو ہو / کیا یہ مطلب ہے کہ بگڑے دین اور دنیا بنے
عالموں کی حجّتوں سے پڑ گئی جھگڑے میں خلق / اُن کی منطق صرف ضد ہے قوم بگڑے یا بنے
جنگ پر آمادہ گویا خلق سے بہرہ نہیں / اتنے ہی جاہل بنے جتنے قلم فرسا بنے
منہ سے املی کو کہو آم اور اس پر ہٹ کرو / یوں کہاں بازارِ دین و علم کا سودا بنے
دو ہی رخ جھگڑے کے ہیں اور دونوں اخلاقاً مضر / یا کسی پر جا بنے یا خود تمھیں پر آ بنے
حجّتی پر ٹھیک ہے ابن ابی لیلیٰ کا قول / یا تو جھٹلائے کسی کو یا تو خود جھوٹا بنے

افشائے راز (شوق قدوائی)

کبھی کسی سے سکندر نے اپنے راز کی بات
مگر وہ بات نہیں تھی زباں پہ لانے کی
کہی تھی جس سے وہ سن کر نہ رکھ سکا مخفی
چلا وہ چال سکندر کے دل دُکھانے کی
کہا حکیم بلیناس سے سکندر نے
زباں کتنی ہے بے باک اس زمانے کی
ہے مشق بات اُڑانے کی یوں ہی لوگوں کو
ہوا کو مشق ہے جس طرح خاک اُڑانے کی
بتاؤ یہ کہ میں اُس جرم کی سزا کیا دوں
کہ درگزر تو ہے صورت بدی سکھانے کی
کہا حکیم نے پہلے تمھیں کرو تجویز
کہ کیا سزا ہے غلط راز داں بنانے کی
تمھیں ضرورتِ اخفا تھی، تم چھپا نہ سکے
اُسے تو کوئی ضرورت نہ تھی چھپانے کی

آرائشِ باغ (شوق قدوائی)

نظر آیا دونوں کو اک خانہ باغ
کہ بلبل کا دل جس کی فرقت میں داغ
مصفّا وہ نہر اُس میں اک بے عدیل
کہے تو کہ ہے موج زن سلسبیل
ہزاروں سے یوں اُس کے پانی رواں
کہ برسائے مینہ جس طرح آسماں
شجر اس کے تھے سب کے سب باثمر
قرینوں سے سب کچھ اِدھر کچھ اُدھر
روش صاف صاف آئینے کی مثال
شجر وہ کہ گل چیں ہو جس سے نہال
ہوا کے وہ جھونکے عجب سرد سرد
کہ کشمیر کا تختہ جس سے ہو زرد
وہ انگور کی اک طرح دار بیل
جوانوں کو مستی ہو لڑکوں کو کھیل

وہ بلبل کے نالوں کی ہر سمت دھوم وہ ہر سرو پر قمریوں کا ہجوم
وہ نہروں کا پانی چمکتا ہوا پھرے مست جیسے بہکتا ہوا
درختوں پہ بیٹھے ہوئے وہ طیور دلوں کو ہو جن کی صدا سے سرور
پپیہے کی آواز لیتی تھی جاں وہ کہتا تھا چلّا کے جب پی کہاں
تھی حالت عجب جانِ مایوس کی صدا جب کہ آتی تھی طاؤس کی
عجب دل میں ہوتا تھا وحشت کا زور
منڈیروں پہ جب رقص کرتے تھے مور

جنگل کی رات (شوق قدوائی)

جنگل کی اندھیری رات سنسان بادل بھی گھرا ہوا پریشان
جھونکوں میں غضب کی سنسناہٹ شاخوں میں رگڑ بلا کی آہٹ
پیڑوں میں وہ ہولناک انداز شیروں کی وہ خوفناک آواز
شعلوں کا وہ خود بہ خود بھڑکنا پتوں کا وہ جا بہ جا کھڑکنا
وہ بوم کی ہو وہ ہو کا عالم وہ وہم کی صورتِ مجسم
او حسن! وہاں بھی جلوہ گر تو
جگنو بن کر اِدھر اُدھر تو

سرفروشی (شوکت بلگرامی)

منزلِ عشق ہم کو ہے درپیش ہمیں کہاں خضرِ مصلحت اندیش

لذّتِ درد کا مزا ہے جنھیں　　نوش ان کے لئے ہے غم کا نیش
حالِ دل کا کبھی بتا نہ سکا　　جامِ جم مثل کاسۂ درویش
دلِ مرحوم یاد آتا ہے　　تھا عجب مونسِ عقیدت کیش
عشق اگر خبط ہے تو اے ناصح　　خبط اس کا سبھی کو ہے کم و بیش
مادرِ ہند روٹھ جائے گی　　قافیہ میں اگر نہ آئے گنیش
شرم آتی نہیں تمھیں شوکتؔ　ق　کہتے ہو خود کو مصلحت اندیش
طلبِ زر میں اس قدر تگ و دو
سر فروشی میں اس قدر پس و پیش

فضائے برشگال (شاکر میرٹھی)

بنا کے حسن کی دیوی عروسِ فطرت کو　　سجا دیا ہے گلوں نے فضا کی وسعت کو
نکیلی کلیوں کا رس چوس چوس کر بھونرے　　لبوں سے گھولتے ہیں شہد کی حلاوت کو
ہر اک شجر میں نئی کونپلیں نکل آئیں　　سجا رہا ہے ہر اک پھول اپنے خلعت کو
زمیں پہ گرتے ہیں یوں جھوم جھوم کر طاؤس　　فلک پہ دیکھ کے جوشِ سحابِ رحمت کو
کہ جس طرح کوئی آوارۂ صراطِ مجاز　　ہو پا کے خوش کسی پیرِ رہِ حقیقت کو
فروغِ ابرِ سیہ کا ہے اس طرح جیسے　　بقا نہ ہو کسی کم ظرف کی محبّت کو
زمیں پہ جھک کے برستا ہے ابر یوں جیسے　　سخی جھکے کوئی وقتِ کرم سخاوت کو
جگر پہ مینہ کی بوندوں کی چوٹ کھا کھا کر　　پہاڑ کرتے ہیں برداشت یوں صعوبت کو
کہ جیسے بات کو جاہل کی حق پرست کوئی　　سنے مگر نہ کرے وا لبِ شکایت کو

نکل گئے ہیں کناروں سے چھوٹے چشمے یوں
اچھالتے ہوئے دامن میں چشمِ رحمت کو

رہے نہ آپے میں جیسے کوئی فرومایہ
سمجھ کے مایۂ عزّ و غرورِ دولت کو

زمیں پہ گرتے ہی ابرِ لطیف کا پانی
اُتار رکھا ہے یوں جامۂ محبّت کو

کہ جیسے قیدِ علائق میں مبتلا ہو کر
قبول روح کرے دنیوی کثافت کو

گیاہِ سبز میں راہیں نہاں ہیں یوں جیسے
چھپائے ابرِ گنہ آفتابِ عصمت کو

زمیں پہ گرد سے یوں صاف جس طرح دل میں
جگہ نہ دے کوئی اہلِ صفا کدورت کو

رواں ہیں دامنِ صحرا میں اس طرح نالے
کہ طے کرے کوئی سالکِ رہِ حقیقت کو

زمیں کو سبزۂ صحرا سے یوں ہے آرائش
کسی سخی کی ہو جیسے فروغ دولت کو

گھٹا میں شب کو چمکتے ہیں اس طرح جگنو
سجائیں جیسے چراغاں سے بزمِ عشرت کو

نزار رہے ہیں ہرے کھیت اس طرح دہقاں
زمیں کرید کے پھیلا کے دستِ ہمّت کو

کہ پھینک دے کوئی مرتاض جس طرح دل سے
اُکھاڑ کر خس و خاشاکِ حرص و شہوت کو

زمینِ شور میں روئیدگی ہو ابر سے کیا
نمو نہ ہو دلِ جاہل میں فیضِ صحبت کو

دکھائی دیتے نہیں اب ستم زدہ سرخاب
کسی ندی کے کناروں پہ شامِ فرقت کو

زمیں کی گود سے نکلے ہیں اس طرح کیڑے
نئی امنگوں سے لے کر ہجومِ خلقت کو

کہ جیسے دورۂ انصاف میں کسی شہ کے
نصیب کثرتِ موفور ہو رعیّت کو

وہ چلتے چلتے مسافر ٹھہر گئے تھک کر
پہنچ سکے نہیں جو منزلِ اقامت کو

حواسِ خمسہ ٹھہر جائیں جیسے شل ہو کر
رہِ طلب میں نہ سمجھیں جو رمزِ وحدت کو

نکل کے دشت سے یوں بادِ تند کے جھونکے
اڑاتے پھرتے ہیں گردوں پہ ابرِ رحمت کو

کہ خاندان میں جس طرح ناخلف اولاد
لٹائے اپنے بزرگوں کے مال و دولت کو

غنچہ و گل (شاگرد میرٹھی)

رنگیں ادا اگرچہ گل اس بوستاں کے ہیں
اور آہ دل فریب مناظر جہاں کے ہیں
دل کش عجیب غنچہ ہے تیرا مگر سکوت
حیرت فزا ہے آہ ترا کس قدر سکوت
عقدے میں آہ ہے ترے سربستہ راز حسن
یعنی خموش ہے ترے پردے میں ساز حسن
ہیں سبز پتیاں ترے منھ پر حجابِ رُخ
آنچل کسی حسینہ کا ہے یا نقابِ رُخ
محوِ سکوت یا ہے چمن میں حسین کوئی
پردے میں یا خموش ہے پردہ نشیں کوئی
کھٹکا لگا ہوا ہے جو گل چیں کا باغ میں
ننھا سا دل دھڑکتا ہے کنجِ فراغ میں
دل کش اگرچہ لالہ و گل کی فضائیں ہیں
پر تیری چپ میں اک غضب کی ادائیں ہیں
بوئے عروس آہ ترے پیرہن میں ہے
دلہن نئی نویلی مگر تو چمن میں ہے
طالب جو عاشقانِ حقیقی خدا کے ہیں
جلوے وہ تجھ میں دیکھتے ربّ العلا کے ہیں
یعنی ہے تیرے حسن میں رعنائیِ ازل
خلوت نشیں ہے انجمن آرائے لم یزل
البیلے نوجوانوں کو تیرے سکوت پر
ہوتا ہے اشتباہ تجھے آہ دیکھ کر

آنچل سے منھ چھپائے ہے رنگیں ادا کوئی
روٹھی ہوئی ہے وصل کی شب میں مہ لقا کوئی

جاتے ہیں آہ جب تری طفلی کے دن گزر
رہ جاتی ہے صبحِ حسن آپ یا ہے جو ترا پہر
لٹکا کے تجھکو بادِ صبا جھوم جھوم کر
تیری بلائیں لیتی ہے منھ چوم چوم کر
چمکا کے باغ میں ترے حسنِ شباب کو
رخ سے ہٹا کے پتیوں کے اٹھتی نقاب کو
خلوت میں ہے اگرچہ سمٹتی حیا تری
سمٹتی نہیں پر ایک بھی بادِ صبا تری

تجھکو ہنسا ہنسا کے عجب گُل کھلاتی ہے ۔۔۔ غنچے سے گد گدا کے تجھے گُل بناتی ہے
کرتا لباس گُل کا ہے جب اختیار تو ۔۔۔ ہوتا سخن بروں کے گلے کا ہے ہار تو
ہنس ہنس کے زیبِ فرق ہیں کرتے حسیں تجھے ۔۔۔ اور چوٹیوں میں گوندھتے ہیں نازنیں تجھے
چھاتی پہ چڑھ کے کرتا ہے تو گُل رخوں کو پیار ۔۔۔ اور لوٹتا شباب کے پھولوں کی ہے بہار
گلدستۂ شمع رویوں کی تو انجمن میں ہے ۔۔۔ اور شاخِ گُل پہ شاہدِ رعنا چمن میں ہے
داغِ جگر ہے عاشقِ تفتہ جگر کا تو ۔۔۔ چہرہ ہے پھول سا کسی رشکِ قمر کا تو
رونق ہے بیکسوں کے جو طاقِ مزار کی ۔۔۔ زینت چمن میں تو ہے عروسِ بہار کی
تجھ پر ہزار جاں سے ہے بلبل فریفتہ ۔۔۔ تیری ادا پہ ایسی ہے اے گُل فریفتہ
کنجِ قفس میں بھی ترے لب پہ ہے گفتگو ۔۔۔ زنداں میں بھی غریب کو ہے تیری آرزو

ہونٹوں پہ آہ! دم ہے ترے اشتیاق میں
آنکھوں میں جانِ زار ہے تیرے فراق میں

ندرت فزا اگرچہ مناظر جہاں کے ہیں ۔۔۔ نیرنگ کچھ عجیب مگر آسماں کے ہیں

بلبل کو ہے قیام نہ گُل کو یہاں ثبات
ہے اس چمن میں آہ کسے جاوداں ثبات

کلیسا (منظور حسین شور)

آرہی دور سے گرجے کے گھنٹوں کی صدا ۔۔۔ ٹھہر جا اے ہم نفس اس رہ گزر پر ٹھہر جا
آہ یہ قاتل ترنم آہ یہ کافر سرود ۔۔۔ ہر نفس محوِ عبادت ہر نفس حرفِ سجود
ہر کنزِ تثلیث پہ حسن و جوانی جلوہ تاب ۔۔۔ ایک ہی سیلاب میں بہتا ہوا ہر شیخ و شاب

سیکڑوں دل اک ہجومِ شوق میں کھوئے ہوئے
سیکڑوں طوفاں کنارِ بحر میں سوئے ہوئے

سیکڑوں معصوم بچے سیکڑوں پیر و جواں
صف بہ صف پہلو بہ پہلو کارواں در کارواں

ایک ہی جا سیکڑوں دوشیزگانِ نازنیں
ایک مرکز پر ہزاروں نسیم تن زہرہ جبیں

ایک جا سمٹا ہوا سا اک جہانِ رنگ و بو
اک جگہ ٹھہرا ہوا سا کاروانِ رنگ و بو

نازنینوں کی دعائیں مہ جبینوں کے نیاز
اک آہنگِ مقدس ہیں بلا کا سوز و ساز

ہاتھ میں انجیل سینوں میں مسلسل اضطراب
بہکی بہکی سی نگاہیں کھویا کھویا سا شباب

اک کلیسا میں ہزاروں آتشیں رخ بے نقاب
ایک آغوشِ تجلی میں ہزاروں آفتاب

صفحۂ انجیل پر کھوئی ہوئی سی ہر نگاہ
دامنِ تثلیث میں سوئی ہوئی سی ہر نگاہ

سیکڑوں دوشیزہ سینوں پر صلیبوں کے نشاں
اک فضائے قدس میں لاکھوں فرشتے پرفشاں

انتہائے قدس میں ڈوبی ہوئی سی ہر نظر
دامنِ مریم کا سایہ ہر سرِ معصوم پر

اک حریمِ قدس میں ہر بت مریم سرنگوں
لب پہ آیاتِ مقدس آنکھ میں رنگِ فسوں

آہ یہ معصوم منظر اُف یہ لاہوتی فضا
یہ تکلم یہ ترنم یہ تقدس یہ دعا

اے کلیسا پاکئی دامانِ مریم کی قسم
لڑکھڑاتے ہیں ترے جادے پہ طاعت کے قدم

عبرتِ دنیا کے نظاروں میں شامل تو بھی ہے
آہ میری رہ گزر کی ایک منزل تو بھی ہے

سوز بھی تیری فضائے قدس میں ہے ساز بھی
کاش اس طوفان میں سن لے مری آواز بھی

دفعتہً تیری طرف کھنچتا چلا آتا ہے دل
ایک طوفانِ ترنم میں بہا جاتا ہے دل

زمزمے خوابیدہ ہیں تیرے ترنم زار میں
حسن کی کلیاں چٹکتی ہیں ترے گلزار میں

روح تھراتی ہے تیرے ہر مقدس راگ سے
دل بھڑک اٹھتا ہے ان نغموں کی دھیمی آگ سے

جی میں آتا ہے کہ تیرا ہمنوا ہو جاؤں میں
دل یہ کہتا ہے نہیں صرفِ دعا ہو جاؤں میں

آنسوؤں کے تار سے عرضِ گراں جانی کروں
نالہ ہائے شوق کو صرفِ پریشانی کروں

شوق کہتا ہے کہ تیرا ساز تجھ سے چھین لوں
درد کہتا ہے تری آواز تجھ سے چھین لوں

بسترِ رہبانیت سے راہبوں کو اب جگا
سن پسِ دیوارِ ہستی درد و بیم کی صدا

درس دے انسانیت کا آدمِ بے درد کو
یوں وقارِ زندگی رسمِ عبادت میں نہ کھو

جادۂ عشرت سے ہٹ کر حالتِ انساں بھی دیکھ
آہ اے ساحل نشیں خمیازۂ طوفاں بھی دیکھ

اہرمن آباد ہیں تیرے ملائک زار میں
معصیت بکتی ہے تیرے زہد کے بازار میں

اس خراباتِ کہن کے جام و مینا توڑ دے
چھوڑ دے للّٰہ یہ بے حسِ عبادت چھوڑ دے

داغ دارِ سجدہ ہے صدیوں سے آدم کی جبیں
زاہدانِ دہر کے سینوں میں لیکن دل نہیں

کس قدر نا آشنائے درد و غم ہے کائنات
یا خدا تو ہی بدل دے میرا عنوانِ حیات

تاروں بھری رات (صفی لکھنوی)

نظر کے سامنے ہے اک طلسمات
تری کیا بات اے تاروں بھری رات

ستارے ہیں کہ نازک آب گینے
رواں یا بحرِ اخضر میں سفینے

یہ انجم یہ فضائے چرخِ اخضر
سمندر میں بطیں جیسے شناور

ستارے جن کے ہر سو غلغلے ہیں
یہ سب بحرِ فنا کے بلبلے ہیں

ثبات ان کو نہیں دنیا میں زنہار
یہ جتنے ہیں ثوابت اور سیّار

جو ان کی گردشوں پر کیجئے غور
ہر اک کا ان میں سے محدود ہے دور

زباں پر ہے تحیّر کا ترانا
کسی کا ہے یہ دہر آئینہ خانا

خدا جانے سرِ منزل کہاں ہے
رواں دن رات یوں ہی کارواں ہے

فلک ہے یا کوئی لوحِ زبرجد
مرصّع کاریاں جس پر ہیں بے حد

کواکب ہے کہ نگ چھوٹے بڑے ہیں
یہ ہیرے دستِ قدرت نے جڑے ہیں

نہ جانے توڑ کر اک سلکِ گوہر
کئے کس نے ہیں یہ موتی نچھاور

یہ کس کا جلوہ یا رب گلفشاں ہے
کہ پا انداز فرشِ کہکشاں ہے

فلک پر جمع ہیں جنّت کی حوریں
زمیں کے رہنے والے کیوں نہ گھوریں

لگے ہیں پردۂ شب میں ستارے
نشاط انگیز ہیں دل کش نظارے

کسی کی سیج پر بکھرے ادھر پھول
تڑپ اُٹھا اُدھر دل حسبِ معمول

کبھی اک خندۂ دنداں نما پر
گہر افشاں مسلسل دیدۂ تر

جراحت خیز صحنِ باغِ گردوں
جوابِ سینۂ پرداغِ گردوں

بساطِ چرخ پر تارے بچھے ہیں
کہ خاکستر پہ انگارے بچھے ہیں

یہی اندیشہ ہے آہِ رسا سے
دہک اُٹھیں نہ یہ اخگر ہوا سے

بجا عقدِ ثریا کو گلہ ہے
کہ پہلو میں دل پر آبلہ ہے

بنات النعش! کیوں غم ہو نہ تازہ
لئے ہو اپنے کاندھے پر جنازہ

خدا ہی جانتا ہے رازِ ہستی
وہ ہو انجام یا آغازِ ہستی

ہوئے ہیں جس غرض سے خلق اختر
کھلے وہ عقدۂ سربستہ کیوں کر

جو ہے دل میں کہو کہہ دوں حفی میں
یہ شمعیں جس لئے روشن ہوئی ہیں

کریں تا اُن مزاروں پر چراغاں
نہیں جن کا جہاں میں کوئی پرساں

ترکِ لذّات (صفی لکھنوی)

جب میسر پہ ہوں لذیذ کھانے — بو سونگھ کے جن کی دل نہ مانے
قابوں میں منجن اور مزعفر — ہو جن سے مشامِ جاں معطّر
بھاری وہ پلاؤ زیبِ بشقاب — عنبر بو چاولوں کا القاب
خوشتر وہ خستہ شیرمالیں — بے بھوک فرشتے جن کو کھا لیں
خوش ذائقہ وہ کباب شامی — جن پر صدقے نمک حرامی
باریک چپاتیاں وہ شفّاف — دیکھیں تو دکھائی دے اُدھر صاف
رنگت وہ نفیس قورمے کی — بادامی ایک ایک بوٹی
سالن کا رنگ زعفرانی — باقر خانی، گُل ارغوانی
خستہ وہ پوریاں پراٹھے — سٹھے کھائیں تو ہوں وہ پاٹھے
پھر نیم برشت وہ ستارے — دیکھے سورج تو دم نہ مارے
مچھلی ایسی کہ جس کا کانٹا — چٹکی سے ملو تو جیسے آنٹا
اعلیٰ وہ کبابِ مرغ و ماہی — زینت افزائے خوانِ شاہی
وہ گھی کے تار پر پسندے — جن کے جو یا شکم کے بندے
اس درجہ لطیف اس قدر نرم — جن سے کرے مغزِ استخواں شرم
چٹنی آچار اور مربّے — لب چاٹنے ایسے ذائقے کے
وہ چوگنی کے سفیدے کی ڈش — جس میں بادام پستے کشمش
میٹھے ٹکڑوں کا طرفہ منظر — چاندی کے ورق لگے ہیں جن پر

چینی طشتریوں میں ملائی
دیکھے شیریں تو دے دہائی
پُر برف ولایتی میں پانی
برخوردوں کو آبِ زندگانی
شیشے کے گلاس ہلکے پھلکے
آبِ انگور جن میں جھلکے
کھانے پینے کے سب یہ اشیا
اک دامِ بلا ہیں بہرِ دانا
ہو کے بے فکرِ عیش و آرام
تو چاہے جو اسے حریصِ ناکام

کر مائلِ اکل و شرب کیوں دل
خطرہ ہے اس میں سخت غافل

عروس البلاد بمبئی (صفی لکھنوی)

بمبئی تو کشورِ ہندوستاں کی ناک ہے
آبروئے مصر تیرے سامنے کیا خاک ہے
سرزمیں تیری مقامِ سجدۂ افلاک ہے
دامنِ ساحل تمام آلائشوں سے پاک ہے

پُر فضا تیری خلیج آئینۂ بین الیدیں
اپنے ساغر میں لئے جوشِ بہارِ نشائتیں

ہر دو جانب کوہساروں کا تسلسل تا بہ دور
اور ان کے بیچ میں تو صورتِ بین السطور
اپنے سنگیں بازوؤں پر تجکو زیبا ہے غرور
روک دیتے ہیں جو طوفانی تموّج کا عبور

دل ہے لبریزِ محبت آگیا جب جوش میں
لے لیا بحرِ عرب کو حلقۂ آغوش میں

بمبئی ہندوستاں کا صدر دروازہ ہے تو
بلکہ رخسارِ عروسِ ہند کا غازہ ہے تو
اپنی آب و تاب سے ہر دم تر و تازہ ہے تو
اک زنگارنگ مجموعے کا شیرازہ ہے تو

آ کے صحبت میں جو بیٹھا کام کا جی ہو گیا
تیری چوکھٹ جس نے چومی نصف حاجی ہو گیا

ہم نشیں جن کو نہیں کچھ خشک تر میں امتیاز — سیرِ بندرگاہ کر لیں چڑھ کے بالائے جہاز
ہو گا اک نظّارۂ جاہ و جلالِ بے نیاز — خود بہ خود ہو نے لگیں گے منکشف قدرت کے راز

بحر میں موجوں کا اٹھ اٹھ کے کہیں ڈٹ ریلنا
سینہ زوری سے جہازوں کا پھر اُن کو ریلنا

دامنِ ساحل پہ صد ہا رنگ کے نقش و نگار — کوٹھیاں کچھ کچھ تلے اوپر منازل خانہ وار
جن کی پستی و بلندی یوں دکھاتی ہے بہار — جیسے زینوں پر لگا دیں سنج کے گملوں کی قطار

خیر مقدم کو مسرّت بڑھتی ہے دل کی طرف
اک نظر ڈالو سمندر سے جو ساحل کی طرف

جا بہ جا مضبوط چٹّانوں کی پتھریلی فصیل — زیبِ ساحل صف بہ صف اشجارِ انجیر و نخیل
بادِ صرصر تا نہ آبادی میں ہو آ کر دخیل — گولہ باری کرتے رہتے ہیں درختِ نارجیل

جاذبِ بادِ سموم و سایہ افگن بارور
خوانِ نعمت ہر مسافر کے لئے ایک اک شجر

خاص نمبر ہر مکاں ہر راہ کے ہر باٹ کے — خضرِ راہِ ساحلِ مقصود زینے گھاٹ کے
پاٹ دی کس نے یہ کھاری وال کیسر کاٹ کے — ہٹ گیا میلوں سمندر خاک آخر چاٹ کے

تاج ہوٹل کے جلو میں خوش نما وہ گھاٹ ہے
جس سے کوسوں تک خلیجِ بمبئی کا پاٹ ہے

کیا بتائیں اس سے پہلے حدِّ ساحل تھیں کہاں — پائے دھونی کا لقب تو دے رہا ہے خود نشاں

اللہ اللہ عقلِ انسانی کی کارستانیاں / نوکِ دُم بھاگا سمندر ہٹ گیا کوہِ گراں
خوش نما گھاٹ آج ہے کل تھی کوئی گھاٹی جہاں
تھی کبھی چوٹی وہیں پر اب ہے چوپاٹی جہاں
رے کے بالائے جبل سے تا نشیبِ موج خیز / ہے نسیمِ دامنِ ساحل مفرح عطر بیز
پرتگیزی شاہزادی کو ملا تھا جب جہیز / بمبئی شامل تھا لیکن تھا نصیب کا یہ تیز
کمپنی کے ہاتھ آیا، اس کی قسمت یوں پھری
سال میں دس پونڈ دیتی تھی زرِ استاجری
قبل اٹھارہ سو اٹھارہ کے یہ کچھ بھی نہ تھا / انگریزوں سے مگر پیدا ہوا جب پیشوا
پھر اُسے یوماً فیوماً اوج ملتا ہی گیا / قلعہ بھی تعمیر، ہائی کورٹ بھی قائم ہوا
اب گورنر کا امیر البحر کا ہے مستقر
ایک یونی ورسٹی بھی اس میں آتی ہے نظر
دوسرا نمبر ہے آبادی میں آج اس شہر کا / چوڑی سڑکوں پر دو رویہ گل دکانیں خوش نما
صاف ستھرا چپہ چپہ، معتدل آب و ہوا / رفتہ رفتہ ہر دساور کا یہ مرکز بن گیا
راہ اس کی بھی نہ روکی جس نے پہنچائی گزند
اس رواداری پہ تھا ہما عوام تک احسان مند
عام پیدا وار گیا ہے، پنبہ، غلہ، میوہ جات / خاص صناعی کی چیزیں روئی چمڑا اور دھات
رہنے والوں کو تجارت کی طرف ہے التفات / اور گجراتی ہی ہیں کرتے ہیں جب کرتے ہیں بات
ہیں بڑی تعداد میں ہندو مسلماں پارسی
چند قومیں رہتی ہیں ان کے علاوہ اور بھی

اُردوئے معلّیٰ (صفی لکھنوی)

اپنے منہ سے کہہ رہی ہے صاف اُردو کی زباں — مولد و ماویٰ ہے میرا کشورِ ہندوستاں
اس کے افعال و روابط دے رہے ہیں خود نشاں — کس طرح پیدا ہوئی کیونکر بڑھی پل کر یہاں
روز افزوں حسن کا ہر دور اک سیّارہ ہے
ہے دبستاں لکھنؤ دلی اگر گہوارہ ہے

مدّتوں سرکارِ دہلی میں رہی یہ باریاب — اب تک اُردوئے معلّیٰ ہے وہی شاہی خطاب
دور دورہ لکھنؤ میں بھی تھا قبل از انقلاب — کر لیا تھا نکتہ سنجوں نے اسی کو انتخاب
ہر ادا شیریں مذاقِ پارسا و رند میں
اس کا طوطی بولتا تھا سبزہ زارِ ہند میں

تجربے کی آنکھ سے دیکھا جو اس کو ہونہار — کمپنی نے کر لیا اپنا شریکِ کاروبار
دفتروں میں محکموں میں بڑھ گیا عزّ و وقار — جم گیا چلتے ہوئے سکّوں پہ نقشِ اعتبار
جب کوئین وکٹوریا کی یہ سہیلی ہو گئی
ہر زباں دنیا میں اس کی پھر تو چیلی ہو گئی

فارسی ہندی کی آمیزش سے ہے اس کا وجود — یادگارِ اتحادِ اہلِ اسلام و ہنود
دھوپ چھاں کے رنگ کی ہے وہ قبائے ہست و بود — کارگاہِ ہند سے منسوب جس کے تار و پود
سفت و سنگیں یا لباسِ عاریت باریک ہے
جامہ زیبا ہے قدِ موزوں پر اس کے ٹھیک ہے

تھی مہِ نو۔ رفتہ رفتہ ماہِ کامل بن گئی — شاعرانہ محفلوں میں شمعِ محفل بن گئی

جب زباں کی تیز نشتر نے رگِ دل بن گئی　　حسن فطرت کی ادا فہمی کے قابل بن گئی

کیا قیامت ہے کہ دل پر کچھ اثر لیتے نہیں

ہو رہا ہے خون اس کا تم خبر لیتے نہیں

مل کے سب تیار کر دو جامع و مانع لغت　　کھینچ دو اٹھ کر قواعد سے حصارِ عافیت

اک عمارت ہے ہوا پر ہو معلق جس کی چھت　　دیکھتے ہو آئے دن جو ہو رہی ہے اس کی گت

اس طرح علمی ستونوں پر اسے قائم کرو

زلزلہ کیسا ہی سخت آئے مگر جنبش نہ ہو

ہر لغت کے جذب کر لینے کی قوت اس میں ہے　　ہر زباں کا لفظ کھپ جائے یہ وسعت اس میں ہے

صاف قندِ فارسی کی بھی حلاوت اس میں ہے　　برج بھاشا میں ہے جو لذت وہ لذت اس میں ہے

اس جز شیر و شکر کوئی نہیں اس کی خورش

دو زبانیں چوس کر پائی ہے اس نے پرورش

الہ آباد (صفی لکھنوی)

تیرا دامن تین تہذیبوں کی ہے اک انجمن　　اے الہ آباد اے جولان گہِ گنگ و جمن

اتحادِ باہمی سنگم ہے تیرے موجزن　　سیکھتے ہیں تجھ سے فرقے میل و ملت کے چلن

جوشِ ہمدردی سے ہے لبریز پیمانہ ترا

خستہ حالوں کا ہے مے خانہ شفاخانہ ترا

دید کے قابل ہیں اس کے خوش نما دیوار و در　　تیرا خسرو باغ اسٹیشن سے تھوڑی دور پر

مختلف پتھر کے ٹکڑے وصل یوں باہم دگر　　چار دیواری اگر دیکھیں تو آتے ہیں نظر

جس طرح دلقِ گدائے تارکِ دنیائے زشت
اپنے گھوبے میں چھپائے سازو سامانِ بہشت

اے زیارت گاہِ خلق اے مجمع البحرینِ ہند — ماگھ میں میلا ترا مشہور ہے مابینِ ہند
اکبری قلعہ سرفرازی میں نصب العینِ ہند — اور خسرو باغ سے وہ چند زیب و زینِ ہند

رنگ و بو یا ذائقہ وہ تیرے امرودوں میں ہے
سیب کشمیری سر بازار مردودوں میں ہے

اس نگارستان کا جو نقش تھا وہ دل پزیر — سیر کرنے منزلوں سے آئے تھے برنا و پیر
صیغہ جاتِ مختلف میں تھے صنائع بے نظیر — جمع ہر سو خوش نما خیموں میں اک جم غفیر

سب طلسمی کارخانہ تھا یہاں پر کیا نہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ہندوستان (ضامن کنتوری)

اے مقدس آریہ ورت اے مرے ہندوستاں — اے مبارک سرزمیں اے گلشنِ جنت نشاں
نازِ گیتی کو نہ ہو کس طرح تیری ذات پر — خاک کو حاصل ہے تجھ سے رتبۂ ہفت آسماں
خوش فضا منظر ترے اور جاں فزا آب و ہوا — ایک فردوسِ نظر ہے ایک قوتِ جسم و جاں
تیری زرخیزی کی ڈھونڈے سے نہیں ملتی مثال — تو اکیلا اک طرف اور اک طرف سارا جہاں
تیری تقدیس و بزرگی میں بھلا ہو کیا کلام — کر گئے اوتار تجھ میں آ کے بزم آرائیاں
تجھ میں گزرے کیسے کیسے فلسفی اور مہندسی — تجھ میں گزرے کیسے کیسے سورما اور پہلواں
تجھ میں کیسے کیسے راجہ ہو گئے اور راج پُتر — تجھ میں گزرے کیسے کیسے خسروِ گیتی ستاں

گرچہ بیگانے تھے لیکن تھے یگانوں سے سوا
بابر و اکبر کے ہیں نام آج تک وردِ زباں
والمیکی اور کالی داس ہی تجھ میں نہ تھے
فیضی و خسرو پہ بھی ہے ناز تجھکو بے گماں
غارِ ایلوارا تری دانائیوں کی ہیں نظیر
تاج سے صنّاعیوں کا تری پیدا ہے نشاں
اب بھی ڈھاکا اور کشمیر و بنارس تجھ میں ہیں
اب بھی بیدر اور ٹرینیا میں ہیں باقی کارواں
الغرض کیا ہے نہیں جو تجھ میں ہاں ملتی نہیں
تیرے باشندوں کو پہلے کی طرح اب روٹیاں
وائے غفلت ہم نے خود تجکو کیا بے بال و پر
وائے قسمت ہم نہ سوچے آپ ہی سود و زیاں
اس طرح ہوتے نہ ہم اندھے اگر اور سادہ لوح
آج ہوتا کس لئے ہندوستانِ محتاجِ ناں

ضامن اب بھی ہے یہ گلشن ملک کے پھر جائیں دن
ہو اگر حامی سودیشی کا ہر اک پیر و جوان

انتظار (طالب باغپتی)

ہجر کی رات بدستور کٹی جاتی ہے
جاگتے جاگتے پھر صبح ہوئی جاتی ہے
آہ اُمّید کہ اب بھی نہیں سونے دیتی
مجکو مایوس بھی ظالم نہیں ہونے دیتی
دل یہ کہتا ہے کہ کیا ہو جو کوئی آجائے
اور سوتا ہوا دیکھے تو تجھے شرمائے
در کھلا چھوڑ دو سوتا ہوں تو سو جانے دو
کوئی آجائے تو روکو نہ اُسے آنے دو

پائے نازک کی صدا اگر نہ جگانا چاہے
اور پازیب کی جھنکار سلانا چاہے
ہمدمو تم بھی خدارا نہ جگاؤ مجکو
اور اُس خواب گراں سے نہ اُٹھاؤ مجکو
ہیں پرندوں کے خوش آئند ترنم بیکار
اور نسیم طرب افزا کے تبسم بیکار
میں نہ جاگوں گا مرے خواب پریشاں نہ کرو
آہ اتنا تو مجھے اُس سے پشیماں نہ کرو

اے خوشا وہ مری نیندیں وہ مری بے ہوشی — اُس کے چھونے پہ جو قرباں ہو بصد خاموشی
اے خوشا وہ مری جاگی ہوئی آنکھیں پُرخواب — جو کسی نورِ تبسم کے لئے ہوں بیتاب
صرف وہ نورِ تبسم جو کسی چہرے سے — آفتابِ شفقی رنگ کی صورت نکلے
اور تاریکیٔ غم خانے کو یوں دور کرے — جس طرح خوابِ صنم نیند کو پُرنور کرے
میری آنکھوں میں وہی نور سما جانے دو — اور دل میں وہی تصویر اُتر آنے دو
صبحدم آنکھ کھلے تو وہی صورت دیکھوں — چڑھتے سورج میں وہی موہنی مورت دیکھوں
اُسی نظارۂ دلکش سے محبت بن کر — ایک طوفان اُٹھے موجِ مسرت بن کر
بیقراری ہو مری روح کی بیداری میں — اور ہیجانِ عمل ہو رگِ بیکاری میں

وندریں راز چنیں باخبرے گردم باز
باز گردم بہ منازل کہ بہ خود جوہم راز

برسات (ظفر علی خاں)

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی — تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی
آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادرِ ابرِ سیاہ — برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ
بادل اتنے میں دُرِ ناسفتہ برسانے لگے — داستانِ قلزم و عماں کو دہرانے لگے
جھوم کر اُٹھی گھٹا برسی برس کر چھٹ گئی — گرد کی چادر زمیں کے منہ سے فوراً ہٹ گئی
بادلوں سے نورِ خورشید اس طرف چھننے لگا — سائباں قوسِ قزح کا اس طرف تننے لگا
جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور — کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور
ڈھل کے پہنچا تھا اُفق کے آستاں تک آفتاب — تھی شفق کی اُس کے منہ پر ایک نارنجی نقاب

یہ نظر آرا مناظر تھے کچھ ایسے دل فریب
ہاتھ سے جاتا رہا دل میرے اور دل سے شکیب
عالم از خود رفتگی کا مجھ پہ طاری ہو گیا
جوشِ مستی کا مری رگ رگ میں ساری ہو گیا

فصلِ بہار (ظفر علی خاں)

گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
ہر طیر نغمہ سنج سرِ شاخسار ہے
سرگرم ہیں جو ایسے ہی قدرت کے کارکن
گل لالہ زار ہوگا جو اب کوہسار ہے
محسوس کون باغ کی کرتا نہیں کشش
ہے کون دل یہ آج جسے اختیار ہے
مخمل کا فرش باغ میں سبزہ بچھا چکا
اب تو عروسِ گل کا فقط انتظار ہے
کچھ حظ اٹھا لے تو بھی کہ دو دن ہیں سیر کے
ناداں! بہارِ باغ کا کیا اعتبار ہے
منہ موتیوں سے گل کا بھرا ہے بہار نے
جو قطرہ اس کا ہے وہ دُرِ شاہوار ہے
ہے موسمِ بہار جنوں خیز بے خودی
جو شے ہے بے قرار ہے بے اختیار ہے

ہندوستاں (ظفر علی خاں)

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
تجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے
تہذیبِ ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل
یہ موجِ رنگ رنگ پھر آئی کہاں سے ہے
ذرے میں گر تڑپ ہے تو اس خاکِ پاک سے
سورج میں روشنی ہے تو اس آسماں سے ہے
ہے اس کے دم سے گرمیِ ہنگامۂ جہاں
مغرب کی ساری رونق اسی اک دکاں سے ہے

انگریز کا غلام مسلماں نہ ہے نہ تھا
یہ نسبت اس کو سرورِ کون و مکاں سے ہے

ماجرائے مصیبت (ظفر علی خاں)

کچھ آج اپنی مصیبت کا ماجرا کہئے مگر جو کہئے وہ سچ کہئے اور بجا کہئے
کبھی خود اپنے چلن کی برائیاں گنئے اور اس کو اپنی خرابی کی ابتدا کہئے
درازیِ شبِ فرقت کی داستاں میں اگر کمی رہی ہو تو کوتاہیِ قضا کہئے
یہ کیا غضب ہے کہ گھر کو لگا کے آپ ہی آگ پھر اس کو شومئ تقدیرِ نارسا کہئے
کیا ہے حملہ خود اپنی ہی فوج پر ہم نے ستم ہے اس کو بھی دشمن کی گر خطا کہئے
ہماری تیغ ہمارے ہی خوں میں پیر گئی اسے بھی شوق سے قاتل کی اک ادا کہئے
نہیں رہا ہے دراندازیِ رقیب کا خوف اب اٹھ کے بزم میں جو کہئے برملا کہئے

بقول غالب اگر پار اتر گئی کشتی
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

نیرنگ جہاں دیکھ (ظفر علی خاں)

گر چشمِ جہاں بیں ہے تو نیرنگِ جہاں دیکھ آفاق میں اللہ کی قدرت کے نشاں دیکھ
کس قطع سے دامانِ شبِ تار ہوا چاک کس وضع سے خورشید ہوا جلوہ فشاں دیکھ
کس طرح ہری ہو گئیں سوکھی ہوئی شاخیں رخصت ہوئی کیوں کر چمنستان سے خزاں دیکھ
چڑھتی ہے کس انداز سے اتری ہوئی ندی کس شان سے ہر جزو میں اک مد ہے نہاں دیکھ

پھر پاٹ میں پھیلاؤ وہی ہے جو کبھی تھا
توحید کے دریا کو گراں تابہ کراں دیکھ

اللہ کی رحمت کے کرشموں پہ نظر کر
ڈوبے ہوئے بیڑے سے گئے اُچھلنے کا سماں دیکھ

جو تخت پہ تھے تختہ ہے اُلٹا ہوا اُن کا
جو تھے سپرانداز چڑھی اُن کی کماں دیکھ

اے نالۂ مظلوم کی تاثیر کے منکر
آتش زدہ یورپ سے جو اُٹھتا ہے دھواں دیکھ

وہ قصر جو اسلام کے کھنڈروں پہ بنا تھا
اب چاٹ رہی ہے اُسے شعلوں کی زباں دیکھ

جاروب کشانِ حرمِ مصطفوی کا
اللہ نے کس طرح کیا پلّہ گراں دیکھ

نیرنگِ زمانہ (ظفر علی خاں)

قدیم وضع پہ اندازۂ جہاں نہ رہا
مکیں رہے مگر ان کا کہیں مکاں نہ رہا

زمین پاؤں تلے سے نکلتی جاتی ہے
سروں پہ سایہ فگن تھا جو آسماں نہ رہا

ہوا اک ایسی یکایک چلی زمانے میں
کہ جس کے ہم تھے عنادل وہ گلستاں نہ رہا

وہ رونقیں نظر آتی نہیں خیاباں پر
فضا وہ پہلی سی اگلا سا وہ آسماں نہ رہا

وہ بوئے نسترن و یاسمین و گل نہ رہی
وہ رنگِ لالہ و نسرین و ارغواں نہ رہا

خموش ہے چمنستاں کے شاخساروں میں
خروشِ نالۂ مرغانِ سبحہ خواں نہ رہا

بھٹک رہے ہیں اندھیرے میں قافلے والے
کہ رہبری کے لئے میرِ کارواں نہ رہا

دلِ شکستہ کو اُمیدِ عافیت نہ رہی
زبانِ بستہ کو یارائے الاماں نہ رہا

کبھی زمانے میں ڈالا تھا غلغلہ جس نے
وہ نام زینتِ عنوانِ داستاں نہ رہا

گلہ ہے بخت کی نیرنگیوں سے لاحاصل
عبث ہے شکوہ کہ گنبد پہ گردگاں نہ رہا

گئی جو خاتمِ جم ہاتھ سے تو غم کیا ہے — خدا تو سر پہ رہا گر خدایگاں نہ رہا
فلک نے بادہ کشوں کا الٹ دیا ساغر — تو کیا حجاز کا ساقی بھی مہرباں نہ رہا

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

مغربی جادو (ظفر علی خاں)

جدید وضع کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں — ہمارے طور طریقے بدلتے جاتے ہیں
دکھائی ہے ہمیں تہذیبِ مغربی نے جو راہ — ہم آنکھ بند کئے، اس پہ چلتے جاتے ہیں
بھڑک رہا ہے کچھ اس جوش سے تنورِ فرنگ — کہ دین کے برف کے تودے پگھلتے جاتے ہیں
دیارِ غرب کی مٹی کچھ ایسی چکنی ہے — بڑے بڑوں کے قدم بھی پھسلتے جاتے ہیں
اگل رہے ہیں جنھیں ریزہ چینِ خوانِ مسیح — مزے سے ہم وہی لقمے نگلتے جاتے ہیں
حرم کے رستے سے کاٹی ہے شیخ نے کنّی — تو بت کدے سے برہمن نکلتے جاتے ہیں
حبیب اپنے عہد پہ قائم نہ رہ سکے بندے — خدائے پاک کے وعدے بھی ٹلتے جاتے ہیں

سوراج (ظفر علی خاں)

یہ کل کی ابھی بات کہ تھے ہند کے سرتاج — دیتے تھے تمھیں آ کے سلاطینِ زمن باج
پر رنگ زمانے نے یہ بدلا ہے کہ تم کو — دنیا کی ہر اک قوم سمجھتی ہے ذلیل آج
دامانِ نگہ جس کی فضا کے لئے تھا تنگ — وہ باغ ہوا دیکھتے ہی دیکھتے تاراج
محفل میں ضیا بخش نہ ساقی ہے نہ ساغر — گلشن میں نوا ریز نہ بلبل ہے نہ دُرّاج

سوچو تو ذرا تم کہ تمھارا ہی سفینہ
کیوں ہو گیا بازیچۂ ذخّاریِ امواج

ہر برق جو کوندی ہے گری ہے وہ ہمیں پر
ہر فتنہ جب اُٹھتا ہے تمھیں بنتے ہو آماج

جب تک رہے تم دستِ نگر اپنے خدا کے
ہونے نہ دیا اس نے تمھیں غیر کا محتاج

جس وقت مگر ہاتھ سے سر رشتہ رضا کا
چھوٹا تو نہ تھا بخت نہ تھا تخت نہ تھا تاج

جھک جاؤ گے اب بھی اگر اللہ کے آگے
بن جاؤ گے گر خاکِ درِ صاحبِ معراج

مٹّی بھی اُچھالو گے تو ہو جائے گی سونا
کنکر بھی اُٹھا لو گے تو بن جائے گا پکھراج

جو ہو گئے اس کے وہ ہوا اُس کا نگہباں
اُس کی ہے جنھیں شرم ہے اُن کی بھی اُسے لاج

ترکوں ہی کو دیکھو کہ جب اس پہ ہوئے قرباں
یورپ کی دھری رہ گئی سب کثرتِ افواج

داتا کی ہے یہ دین ہیں رنگ اُس کے نرالے
مانگے نہ ملی بھیک نہ مانگا تو ملا راج

اک سجدے میں حاصل ہوئے جاتے ہیں دو عالم
وہ کیوں نہ کرو بات کہ اک پنتھ ہوں دو کاج

مٹ جاؤ مگر حق کو نہ مٹتے ہوئے دیکھو
سیکھو یہ روش گر تمھیں اب لینا ہے سوراج

انتظارِ سحر (ظفر علی خاں)

تجھے فکر کیوں ہے اے دل کہ یہ شب بسر بھی ہوگی
ہے ابھی اگر اندھیرا تو کبھی سحر بھی ہوگی

ہے اثر دوا میں پنہاں مگر اس کے ساتھ تجھکو
اگر اعتقاد ہوگا تو وہ زود اثر بھی ہوگی

یہ سوادِ آفرینش ہے یہ قدرِ نورِ بینش
تری آنکھ اگر کھلے گی تو جہاں نگر بھی ہوگی

ہو بپا کہیں بھی طوفاں وہ یہی گماں کریں گے
کہ ضرور اس میں شامل مری چشمِ تر بھی ہوگی

اگر آج ہم پہ آئی شبِ غم پہاڑ بن کر
تو یہ رات یوں ہی بھاری کبھی آپ پر بھی ہوگی

عرب و عجم کے ذرّے ہوئے آفتاب جس سے
کسی روز دیکھ لینا وہ نظر ادھر بھی ہوگی

حقائق (ظفر علی خاں)

دل ہے پہلو میں تو پیدا شیوۂ ترکانہ کر
جورِ ہفت افلاک کے ہوتے رہیں پروا نہ کر

غم کو خود آگر بہا لیجائے گی موجِ سرور
دیکھتا کیا ہے اُٹھا اور فکرِ مے و پیمانہ کر

دعوئ الفت جتا کر مفت میں رسوا نہ ہو
دار پر چڑھنے سے پہلے رازِ عشق افشا نہ کر

ظرفِ نیساں چاہتی ہے قلزم آشامی تری
برگِ گل کی طرح شبنم کے لئے ترسا نہ کر

کام ابراہیموں کا ہے کہ کھیلیں آگ سے
کود پڑ شعلوں میں خوفِ انجام کا اصلا نہ کر

لے کے نام اللہ کا طوفاں میں کشتی ڈال دے
خوفِ بے پایانِ دریائے موج افزا نہ کر

محو دِعمل تیرا ہے صورت گر تری تقدیر کا
شکوہ کرنا ہو تو اپنا کر مقدّر کا نہ کر

سایۂ شمشیر میں پوشیدہ جنّت ہے مگر
ناکسوں کے سامنے اس بھید کا چرچا نہ کر

ہندوستان (ظفر علی خاں)

سنا ہے دردِ دل رکھتا ہے اے ہندوستاں تو بھی
جگر کے خون کو دے سکتا ہے پلکوں کا نشاں تو بھی
جہاں سر پہ اُٹھایا بلبلوں نے اپنے نالوں سے
دکھا اندازِ محشر ہو کے سرگرم فغاں تو بھی

دکھا اپنے جگر کا داغ جو شرمائے سورج کو
بنا مغرب کو مشرق اور زمیں کو آسماں تو بھی
جھُلس دے سوزِ دل سے ٹیمسز کی موجوں کے داماں کو
کہانی اپنی دہرا گر کہ ہے آتش بجاں تو بھی
غلط انداز ہیں صید افگنوں کے بے اماں ناوک
نکال اک تیر ترکش سے کہ رکھتا ہے کماں تو بھی
سنی ہے ہم نے ٹن ٹن پال کے گرجا کے گھنٹے کی
بجا مندر میں سنکھ اور دے دے مسجد میں اذاں تو بھی.

فریادِ جرس (ظفر علی خاں)

کل کہہ رہے تھے ایک محبِّ وطن بزرگ
ہندوستان رہنے کے قابل نہیں رہا
انساں سے چھین لے گئی آزادیٔ ضمیر
لیلےٰ کے ناقے کے لئے محمل نہیں رہا
تھا حق کا دشنہ تیز بھی خوں ریز بھی مگر
کچھ دن سے در خورِ رگِ باطل نہیں رہا
سچ اور جھوٹ میں نہیں باقی رہی تمیز
اب امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
ہم آپ اپنی راہ کے سنگِ گراں بنے
رہرو کو فکر دوریٔ منزل نہیں رہا
آزادیٔ حیات کی جس دل میں تھی تڑپ
اب پہلوئے وطن میں وہی دل نہیں رہا
جو کوشش آشتی کی ہوئی رائگاں گئی.
اور کوئی اتحاد کا قائل نہیں رہا

پھر کس لئے یہ شکوہ کہ لطف خدائے پاک
ہندوستاں کے حال کو شامل نہیں رہا

فریاد (ظفر علی خاں)

ہر دل میں ہے یہ آرزو ہندوستاں آزاد ہو
یہ گھر جو ہے اُجڑا ہوا اک بار پھر آباد ہو

دنیا میں اس کا مرتبہ ہو ساری قوموں سے بڑا
جو بھی ہو اس کا فیصلہ عالم کا اُس پر صاد ہو

سرمایہ داری کا طلسم ہو ایشیا میں سرنگوں
برباد استعمار ہو نابود استبداد ہو

یہ نور ابھی چھننے لگے بینش اگر ہو آنکھ میں
یہ قصر ابھی بننے لگے اسلام اگر بنیاد ہو

کعبے کی ساری آبرو صرفِ کلیسا ہو گئی
جب دل ہی پہلو میں نہیں پھر لب پہ کیوں فریاد ہو

طلوعِ خورشید (عزیز لکھنوی)

جگہ پردۂ شب میں تاروں نے پائی
کھلا دفترِ شرحِ قدرت نمائی

بڑھا نور دریا میں اک لہر آئی
شفق نے ادھر سرخ بیرق دکھائی

ہوئی صبح تاثیر میں آہ ڈوبی
اُدھر بحر میں کشتیِ ماہ ڈوبی

تجلّی نے کی اپنی صورت نمائی
بڑھی نہر میں اور بھی کچھ صفائی

نمایاں ہوا ایک قرصِ طلائی
ادھر جگمگائی خدا کی خدائی

کیا کیسۂ زر کو گردوں نے خالی
چمکتی ہوئی اشرفی اک نکالی

صبح (عزیز لکھنوی)

جمالِ مہر انجم سوزِ محوِ گرم جوشی ہے
گلوں میں ہر طرف ہنگامۂ شبنم فروشی ہے

چمن مطربِ تجلی نغمہ زن عالم نشاط افزا
اگر زاہد بھی پی لے مے تو وقتِ چشم پوشی ہے

شجر میں وجد میں سرشار ہے معمورۂ دنیا
نسیمِ صبح گاہی مستِ شغلِ مے فروشی ہے

افق سے پھیلتی جاتی ہیں کرنیں مست ہے ہر شے
چھلکتا جام ہے ٹوٹی ہوئی مہرِ خموشی ہے

شفق کا بادۂ گلرنگ اور یہ جامِ مینائی
طلوعِ صبح بھی تمہیدِ رسمِ بادہ نوشی ہے

عزیز آزاد طائر شاخِ گل پر چہچہاتے ہیں
حیات اپنی مگر وابستۂ حلقہ بگوشی ہے

ابرِ نوبہار (عزیز لکھنوی)

بپاسِ خاطرِ رندانِ بادہ خوار برس
برس برس کے دن آئے ابرِ نوبہار برس

دعائیں مانگی ہیں ساقی نے کھول کر زلفیں
بسانِ دستِ کرم ابرِ دجلہ بار برس

کمی نہ بادہ پرستوں کے جوش میں ہو گی
ہزار بار برس یا کہ لاکھ بار برس

جبال و دشت و گلستاں میں بھر دے ایا جل تھل
نکال خوب سا دل میں جو ہے بخار برس

نگاہ جانبِ قبلہ ہے منتظر ہوں میں
ہوئے ہیں چار پہر آج مجھکو چار برس

کوئی تو تربتِ عاشق پہ رونے والا ہو
ذرا چمن میں برس کر سرِ مزار برس

بس انتظار ہے تیرا ہی بادہ نوشوں کو
لئے ہیں ہاتھ میں ساغر ترے نثار برس

مقابلے میں اگر تیری پست بے ہمت
تھمی ہوئی ہے مری چشمِ اشکبار برس

دلوں میں کچھ تو جمادات کے پڑے ٹھنڈک
نکل رہے ہیں ہر اک سنگ سے شرار برس

گلوں سے بھر گئیں ہیں جھولیاں زمین کی سب
نمو کا جوش ہے ہاں تو بھی بار بار برس

رکھا ہوا ہے خمِ مے چنے ہیں سب ساغر
مرے خدا یوں ہی برسے گھٹا ہزار برس

شبابِ حسن کی گرمی بڑھی ہوئی ہے بہت
دلوں کو شعلہ مزاجوں کے ہو قرار برس

پرانے داغ جو تھے دل میں پھر سے ہوں تازہ
سرِ زمینِ گلستانِ لالہ زار برس

ترے کرم سے ہے بارانِ لطفِ ساقی بھی
قریبِ مسکنِ رندانِ مے گسار برس

نگار و ساقی و مینا و مے کی صحبت ہے
بہ قدرِ شوقِ تماشائیان بار برس

عزیز تشنۂ افکارِ نو سے ہے سرخوش
اگر ہو جوش تو اے ابرِ نوبہار برس

امتحانِ عشق (عزیز لکھنوی)

حسنِ ادا شناس کے وہ سخت امتحاں
عشقِ شکستہ رنگ کی وہ ہمتِ بلند

وہ صبر آزما یہ سراپا رہینِ شوق
وہ بے نیاز یہ ہمہ تن اک نیاز مند

دیکھا ہے جب کبھی نگہِ دل گداز سے
بجلی کی طرح کانپ اُٹھا اس کا بند بند

کافی ہے اس کے خرمنِ ہستی کے واسطے
ہو اک نظر عتاب کی یا برقِ زہرخند

سونے میں بھی دماغ رسا تا حریمِ ناز
اللہ رے جذبِ دل کہ رگِ خواب ہے کمند

ہنگامۂ جہاں سے خرد بے نیاز تر
سر آشنائے ہوش نہ گوش آشنائے پند

تیغِ رضائے دوست اِدھر ہے کھنچی ہوئی
مقتل میں سر بکف ہے اُدھر عشقِ مستمند

اے شہسوارِ معرکۂ عشق ہوشیار
دل ہے پُر اضطراب سمِ افگندہ ہے سمند

سوزِ دروں سے کھینچ اک آہِ شرارہ بیز — پہنچے یہ تجھ کو آتشِ نمرود سے گزند
ہو تلخیوں سے تیرا مذاق اتنا آشنا — زہرابۂ اجل بھی ترے کام میں ہو قند
پہلے گلا تو رکھ تہِ تیغِ گلو نواز — فدیئے کو یوں نہیں کہیں آتا ہے گوسفند
خاکِ بنائے عشق پہ رکھ دے سرِ نیاز — اُس کو ادائے صبر و سکوں دل سے ہے پسند

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل
آید بزیرِ تیغ و شہیدش نمی کنند

عشق (عدم)

پھر رہا ہے عشق اپنی دھن میں لہراتا ہوا — وحشتِ کہنہ کے ہر قصّے کو دہراتا ہوا
شاعروں کے دل جلا کر نطق کی قندیل میں — حسن کی پُر تمکنت محفل کو گرماتا ہوا
حسن کی پُر تمکنت محفل کو گرما کر ندیم — جھومتا، ہنستا، مچلتا لغزشیں کھاتا ہوا
موت کی سرد اور بے رونق جبیں کو دیکھ کر — روح پرور قہقہوں کی آگ برساتا ہوا
چند صد ریزہ گریبانوں کے سرمائے کے ساتھ — دو جہاں پر پرچمِ تسخیر لہراتا ہوا
ہر شکستِ لازمی پر طنز سے ہنستا ہوا — ہر یقینی ہار پر فتحِ مبیں پاتا ہوا
جینے مرنے کے سلیقوں کا خدا ہر گام پر — زندگی اور موت کے رازوں کو سمجھاتا ہوا
کلفتوں سے درسِ عیشِ جاوداں لیتا ہوا — فخر سے ہنس ہنس کے بے اندازہ غم کھاتا ہوا
مضمحل روحوں کو دیکر جھوم اُٹھنے کا پیام — سرد و پژمردہ دلوں کو وجد میں لاتا ہوا
حاصلِ کون و مکاں، ہنگامۂ ہستی کی جاں — وسعتِ کونین پر ہر رنگ میں چھاتا ہوا
التہابِ عشق کو اس سے جدا کر دیں اگر — زندگی ہے اے عدم اک پھول مرجھاتا ہوا

مجھے معلوم نہ تھا (عسکری لکھنوی)

دوستی ترک کروگے مجھے معلوم نہ تھا
چاہ کا نام نہ لوگے مجھے معلوم نہ تھا
غیر کے ہو کے رہوگے مجھے معلوم نہ تھا
مجھ سے بچ بچ کے چلوگے مجھے معلوم نہ تھا

یادِ ایام کہ تم تھے مرے دل کے بس میں
تم سے تازہ تھیں محبت کی قدیمی رسمیں
یا وفا نام پہ کھاتی تھی تمہاری قسمیں
یا جفا بھی نہ کروگے مجھے معلوم نہ تھا

رسم و رہ چھوڑے ہوئے رنگِ پریدہ کی طرح
دل سے منہ موڑے ہوئے اشکِ چکیدہ کی طرح
رشتے سب توڑے ہوئے صیدِ رمیدہ کی طرح
دور ہی دور پھروگے مجھے معلوم نہ تھا

دل مجھے کوچہ و بازار میں لایا بھی اگر
چرخِ بدخواہ رہِ راست پہ آیا بھی اگر
کبھی قسمت نے سرِ راہ ملایا بھی اگر
اجنبی بن کے ملوگے مجھے معلوم نہ تھا

چاہ سی چاہ تھی جس دن سے سنبھالا تھا ہوش
باہمی لطف و مروّت میں برابر کا تھا جوش
گامزن راہِ محبت میں تھے ہم دوش بہ دوش
تا بہ منزل نہ چلوگے مجھے معلوم نہ تھا

دنیا کی بے ثباتی (غالب دہلوی)

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ایک اندھی لڑکی کی دعا (غلام رسول نازکی)

تو نے تاروں کو ضیا بخشی ہے سورج کو جمال
بارشِ انوار سے دنیا کی کھیتی ہے نہال
نور پاشی میں قمر ہے، آپ ہی اپنی مثال
مجھکو ان چیزوں کی کچھ خواہش نہیں اے ذوالجلال
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

لوگ کہتے ہیں کہ رنگوں کے کئی اقسام ہیں
سرخ ہیں، کالے ہیں، پیلے اور نیلی فام ہیں
اور ان رنگوں سے وابستہ بہت سے کام ہیں
مجھکو کیا؟ یہ آنکھ والوں کے لئے انعام ہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

سنتی آئی ہوں چمن میں کھل رہے ہیں لالہ زار
روئے گل پر رنگ برساتی ہے ساون کی پھہار
تازگی سی روح میں بھرتا ہے کلیوں کا نکھار
میں نہیں کہتی کہ یہ سب دیکھ لوں پروردگار
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

میری آنکھوں کو بصارت کی ہوس اصلا نہیں
بے بصر ہوں میں مگر اس کی مجھے پروا نہیں
تو نے سمجھا ہے میں عاجز ہوں مگر ایسا نہیں
مجھکو ہرگز آرزوئے دیدۂ بینا نہیں
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

گزر جا (فانی بدایونی)

خود برق ہو اور طورِ تجلّی سے گزر جا
خود شعلہ بن اور وادیِ سینا سے گزر جا

بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ
آئینہ اُٹھا حسنِ خود آرا سے گزر جا

یہ نقشِ قدم ہیں رہِ بے منزلِ دل میں
فردا تو ہے فردا بسِ فردا سے گزر جا

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظّارہ کہاں تک
اس مرحلۂ سعیِ تماشا سے گزر جا

ذرّے میں ہے گم وسعتِ صد عالمِ صحرا
ذرّے کو سمجھ وسعتِ صحرا سے گزر جا

کر قطعِ نظر وسوسۂ قلب و نظر سے
ہر جلوۂ پوشیدہ و پیدا سے گزر جا

کعبہ ہو کہ ہو دیر وہ دنیا ہو کہ عقبیٰ
ہر منزل و ہر جادہ و ہر جا سے گزر جا

یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے
دنیا ہی میں رہنا ہے تو دنیا سے گزر جا

اُٹھ بزمِ تحیّر سے وہ کہتے ہیں اِدھر آ
جا اور حدِ امکانِ تمنّا سے گزر جا

ہے دیدۂ دل کھول وہ کہتے ہیں اِدھر دیکھ
دیکھ اور حدِ آدابِ تماشا سے گزر جا

کشتی کا سہارا ہے تو گرداب ہے فانیؔ
دریا ہی میں تو ڈوب کے دریا سے گزر جا

دنیا کے دوست (فانی بدایونی)

دنیا سے کچھ نہ پوچھو کیوں سر گرانیاں ہیں
یاروں سے ہمدموں سے کیوں بدگمانیاں ہیں

اس باغ میں ہیں سارے مرجھانے والے پودے
شادی و غم کے جھگڑے جھوٹی کہانیاں ہیں

ہے عمر چند روزہ پانی کا بلبلا سا
عالم ہے خواب کا سایا نوجوانیاں ہیں

یاں ہم نے جس کو پایا اپنی غرض کا پایا　　یہ داغ دوستوں کی دل پر نشانیاں ہیں
ثابت ہوئیں وہ آخر غمّاز یاں سراسر　　ہم جن کو جانتے تھے یہ رازدانیاں ہیں
کرتے تھے فخر جن پر ہم مہرباں سمجھ کر　　کیا کیا نہ اُن کی ہم پر نامہربانیاں ہیں
کیا کیجیے شکایت ہے دہر جائے عبرت
جیتے ہیں اور جب تک یہ سخت جانیاں ہیں

علم (فانی بدایونی)

اے علم تری ذات سے دنیا کا بھلا ہے　　دنیا ہی نہیں دین کی بھی تجھ پہ بنا ہے
تو جس کے نہیں پاس وہ انسان نہیں ہے　　انسان کو شرف علم سے خالق نے دیا ہے
تو جس کا معین اُس کا زمانہ بھی ہے ساتھی　　تو جس سے خفا اُس سے زمانہ بھی خفا ہے
تو ہے وہ خزانہ کہ جسے تو نہیں حاصل　　گر شاہِ زماں بھی ہے تو مفلس ہے گدا ہے
چرچا نہیں جس گھر میں ترا وحشت سے بدتر　　جس دل میں نہیں تو وہ درندوں کی غذا ہے
ہیں اشرفِ مخلوق یہ تیری ہی بدولت　　انسانوں میں کیا ورنہ بہائم سے سوا ہے
ہے شش جہتِ دہر میں تیری ہی ترقّی　　آوازہ ترا چار طرف گونج رہا ہے
کھویا نہیں جس نے تجھے جس وقت بھی پایا　　بھولا نہیں جس نے کہ تجھے سیکھ لیا ہے
کھنچتا نہیں تو اُس سے جو دل دادہ ہے تیرا　　شاہد ہے مگر تیری طبیعت میں وفا ہے
ہوتی نہیں بے تیرے کسی فن میں ترقی　　مہمل ہے اگر لفظِ عمل تجھ سے جدا ہے
تیری ہی سبب سے ہے فلاطوں کی یہ شہرت　　رتبہ یہ ارسطو کو بھی تو نے ہی دیا ہے
کس خطّۂ دنیا میں نہیں تیری حکومت　　شاہوں کا سر آگے ترے ہر وقت جھکا ہے

جس نے تجھے چھوڑا وہ گیا دونوں جہاں سے
بے دین ہے رسوائے زمانہ ہے بُرا ہے
چکھ ذائقہ علم خدا کے لئے فانی
ایسا تجھے کیا اپنی جہالت میں مزا ہے

شفق (فرخ بنارسی)

قابلِ دید ہے رنگینیِ گلزارِ شفق
جگمگاتا ہوا وہ دامنِ زرتارِ شفق
تابشِ افزائے نظر حسن ضیابارِ شفق
افقِ شرق میں وہ جلوۂ انوارِ شفق
پرتوِ مہر کی تصویر نظر آتی ہے
جلوۂ صبح کی تنویر نظر آتی ہے

ارغواں زار شفق دیکھ کے ہے دل بے تاب
یاد آجاتی ہے رنگینیِ ایامِ شباب
رخِ روشن سے اُلٹ دی کسی مہوش نے نقاب
یا چھلکتی ہے کسی جامِ طلائی سے شراب
شوخیِ رنگ کفِ پائے حنا بستہ ہے
یا سرِ طاقِ فلک پھولوں کا گلدستہ ہے

عکسِ خورشید سے پھولا ہے شفق کا گلزار
ہے عیاں آئینۂ چرخ میں تصویرِ بہار
رنگ وہ خندۂ گل جس پہ ہے سو جاں سے نثار
حسنِ یوسف نظر آتا ہے میانِ بازار
مئے گلفام کی یا موج کوئی جاری ہے
یا تجلیِ تبسم کی ضیا باری ہے

یا کسی دستِ حنائی میں ہے زریں ساغر
موجزن یا کہ فضا میں ہے شرابِ احمر
مستیِ جلوۂ رنگیں سے ہے سرشار نظر
دیدۂ شوق کو ہو وجد وہ دلکش منظر

دل نشیں کیف فزا جلوۂ مستانہ ہے
کیا تماشہ ہے تماشائی بھی دیوانہ ہے

دوش پر چرخ کے اک چادرِ رنگیں ہے عیاں — یا ہے پیشانیٔ اصنام پہ قشقے کا نشاں
یا کوئی آتشِ سیّال کی ہے موج رواں — یا سرِ طور ہے اک برقِ تبسّم لرزاں

جلوۂ حسنِ شفق جاذبِ نظارہ ہے
نگہِ اہلِ نظر کے لئے گہوارہ ہے

سبق آموزِ فنا یہ بھی تماشا ٹھہرا — دو گھڑی بعد نہ یہ لطفِ نظارا ٹھہرا
نقش بر آب ہر اک نقشِ تمنّا ٹھہرا — حاصلِ شوق جو ٹھہرا تو بس اتنا ٹھہرا

اے شفق خون میں جب ڈوب کے تو آتی ہے
مجکو اپنے دلِ خوں گشتہ کی بو آتی ہے

عشق (قدوس صہبائی)

عشق کو سمجھا ہے تو واہمۂ کائنات — آ میں بتاؤں تجھے عشق کی کچھ کیفیات
عشق جہاں آفریں عشق مکاں آفریں — عشق جہانِ حیات، عشق دوامِ حیات
عشق سے پیدا ہوئی طاقت و حرکت تمام — عشق سے حاصل ہوا ارض و سما کو ثبات
عشق سے خالی نہیں روحِ زمین و زماں — عشق کے دو رنگ ہیں دہر میں دن اور رات
عشق کی آغوش میں حسن ہوا سر بلند — عشق کے آگے جھکے حسن کے لات و منات
عشق کا شعلہ بھی تو عشق کا پروانہ تو — عشق سے تو بن گیا اشرف و اعلیٰ صفات
عشق کی رنگینیاں باعثِ تسکینِ جاں — عشق ترا دین و دل عشق تیری کائنات

عشق غلامی نہیں، عشق ہے طاقت کا نام
حرکت فکر و عمل عشق کی ہیں نفسیات

ہے جو بپا انقلاب ہے جو یہ اک زندگی
عشق کے ہیں حادثات عشق کی ہے واردات

عشق اک الہام ہے حُبِّ وطن کے لئے
عشق کی ہے بندگی سارے جہاں کی نجات

مکالمۂ تدبیر و تقدیر (کیفی چریا کوٹی)

تدبیر:-

ایک دن تدبیر نے تقدیر سے ہنس کر کہا
کائنات دہر میں کوئی نہیں میرے سوا

علّت و اسباب میں ہے میری قدرت کی نمود
اور ہستی کی یہ دونوں ابتدا اور انتہا

قوّتِ ایجاد کیا ہے ؟ میرے منشا کا وجود
عالمِ تخلیق کیا ہے اک اشارہ ہے مرا

جب اشارے سے مرے ہو جاتی ہیں چیزیں بہم
اک نئی شے ان سے ہو جاتی ہے خود جلوہ نما

آبِ صافی میں ملاتی ہوں شکر کو جس گھڑی
اس سے شربت روح پرور رنگ لاتا ہے جدا

تاج و تختِ سلطنت بھی ہے مرا دستِ کرم
جنگ میں ہے نام میرا فتح نصرت کا لوا

الغرض ہر چیز میں دنیا کی ہے میرا ہی رنگ
عالمِ اسباب کا مجھ سے ہے کُل نشو و نما

صاف میں کہتی ہوں منہ پر سننے والے سن رکھیں
جس نے منہ پھیرا ہے مجھ سے وہ تباہی میں پڑا

رہبری میری رسائی منزلِ مقصد کی ہے
اور جو پیرو ہیں تیرے ہیں وہ بزدل برملا

دیکھ لے قرآں مُدبّر نام ذاتِ حق کا ہے
حکم میرا مانتی ہے قلبِ صالح کی رضا

تقدیر:-

سن چکی تقدیر جب تدبیر کا لاف و گزاف
ہنس کے یہ کہنے لگی اے خود پسند و خود نما

تو نے سمجھا ہی نہیں ہے آج تک رازِ وجود
ہر چمک کا نام نادانی سے سونا رکھ لیا

تیری چشمِ ظاہری باطن کی تہ میں کور ہے
ظاہری اسباب کے امراض میں ہے مبتلا

نام شربت جس کا رکھا تو نے اے غفلت شعار
اس میں جو تاثیر ہے میری ہے وہ جودِ عطا

دل میں جو ٹھنڈک پہنچتی ہے وہ میرا فیض ہے
جانِ شیریں کے لئے بن جائے ورنہ سنکھیا

ہے مری محتاج وہ ترکیب جس کا نام ہے
حکم سے میرے مرکّب میں ہے تاثیر و جلا

تو نے کیا دیکھا نہیں اکثر مریضوں کے لئے
وہ قضا بنتی ہے جس کا نام رکھتے ہیں دوا

اس کے آگے اور سن تو اپنے گوش و ہوش سے
تو عمل انسان کا ہے اور میں حکمِ خدا

بندۂ ایماں ہیں جو رہتے ہیں میرے کاربند
بوالہوس کہتے ہیں جن کو تو ہے ان کا مدعا

تو نے جنگِ بدر میں دیکھی نہیں قوّت مری
چند جاں بازوں نے ملکِ کفر میں کیا کر دیا

کفر کی جانب تھا سب کچھ ساز و سامانِ وجود
اور ادھر اسلام کی جانب فقط نامِ خدا

تو کہاں تھی اس گھڑی دنیا میں اے عالم فریب
کفر کی لاشوں سے جب میدان سارا بھر گیا

اک اندھا جا رہا تھا جب شبِ تاریک میں
پاؤں کی ٹھوکر لگی اس کو [illegible] گیا

یہ عمل میرا تھا اس کی رہنمائی میں نے کی
تو نے اس کی کیا مدد کی تھی مجھے ناداں بتا

میں ادھر حکمِ خدا ہوں اس طرف قولِ رسول
کون ٹھہرا ہے مطاعِ دو جہاں ان کے سوا

ہے خدا بے شک مدبّر اس کی بھی تشریح سن
ہے مگر تدبیر اس کی حکم اس کا [illegible]

تو نے ان قوموں کو بھی دیکھا ہے اے ظلمت پسند
ظاہری اسباب نے جن کو جہاں سے کھو دیا

میں نہ ہوں تو کام تیرے جتنے ہیں ابتر رہیں
تجھ میں بہتر سے ہے جو کچھ ہے وہ میری ہی رضا

تو نے اے تدبیر پھیلایا ہے وہ دامِ فریب
اس میں بندے پھنس کے ہو جاتا ہے آقا سے جدا

فریادِ صنم (کیفی دہلوی)

حلقۂ گیسوئے پر پیچ کی الجھن ہے وہی
دل تمہارا ہوس و حرص کا مخزن ہے وہی

یہ محبت ہے تو کہتے ہیں عداوت کس کو
طعن و تشنیع وہی۔ نالہ و شیون ہے وہی

کیوں نہیں آپ خلوص اور محبت کی ہیں جان
دل میں پنہاں ہے جو چہرے سے بھی روشن ہے وہی

کیا ضرورت کہ شبستانِ صنم کی ہو تلاش
دل ہو گر صاف تو دلدار کا مسکن ہے وہی

بدولی آپ کی دکھلاتی ہے رنگ اور کے اور
ورنہ یاں آنکھ وہی رخ وہی چتون ہے وہی

تن بدن شمع کا جس شعلے نے ہے پھونک دیا
دلِ پروانہ میں کچھ پر تو وہ افگن ہے وہی

چاک جس جوشِ جنوں سے ہوا دامن گل کا
دم کشِ نالۂ ہر بلبلِ گلشن ہے وہی

سرو کے پاؤں میں جو حلقۂ زنجیر ہے عشق
باغ میں قمریوں کی زینتِ گردن ہے وہی

رات دن تو تمہیں غیر اور رقیبوں کی ہے دھن
اور کہے جاتے ہو دل میں بت پرفن ہے وہی

حسنِ یوسف کی طرح جو سرِ بازار بکے
کہتے ہیں حسنِ دل آرا وہی جوبن ہے وہی

حشر میں ہاتھ نہ اس تک کبھی پہنچے بہتر
چور کا جو کہ مصلّی ہو یہ دامن ہے وہی

بت چھٹے مر گئے تو ہے حشر تلک حور کی دھن
حالت ان بوالہوسوں کی پس مردن ہے وہی

کوئی رسوا ہو کوئی خوار ہو کوئی بدنام
اپنے مطلب کا اک ان لوگوں میں گر فن ہے وہی

دوست کے دوست کو دشمن ہی ہمیشہ سمجھے
دل میں وہ ہی حسد و رشک ہے ان بن ہے وہی

کوئی وارفتہ ہو ان بوالہوسوں کا کیسے
سینہ دل کا تو دل ارماں کا نشیمن ہے وہی

ہاں خبردار تم ان بوالہوسوں سے بچنا
دل نہ دے ان کو صد آفات سے ایمن ہے وہی

فریبِ شادمانی (گوپال متل)

گھٹائیں یاس کی چھاتی ہیں جب قلبِ پریشاں پر
جب اپنی زندگی تنگ بار ہو جاتی ہے انساں پر
ہجوم اندوہ کا جب آدمی کو گھیر لیتا ہے
فلک جب اس کے دل پر رنج و غم کے داغ دیتا ہے
بشر محصور جب ہوتا ہے نرغے میں بلاؤں کے
جگر سہتا ہے جب چرکے یگانوں کی جفاؤں کے
شبِ غم میں اُمیدوں کا دیا جب جھلملاتا ہے
تو اس احساس سے انسان کا دل کانپ جاتا ہے
کہ وہ تنہا رہینِ سوزِ غمہائے نہانی ہے
جہاں میں کارفرما ورنہ ہر سو شادمانی ہے
مگر نورِ بصیرت گر عطا ہو چشمِ گریاں کو
کوئی دیکھے اگر گہری نظر سے بزمِ امکاں کو
بھرم کھل جائے گا اُس پر فریبِ شادمانی کا
حقیقی رخ نظر آنے لگے گا زندگانی کا
نظر آئے گی ہر اک روح بارِ غم سے آزردہ
ہر اک چہرہ وفورِ دردِ ناکامی سے افسردہ
نظر آئے گی رنج و غم کی اس درجہ فراوانی
کہ مہمل بن کے رہ جائے گی اپنی گریہ سامانی

بے زری (میر)

بے زری کا نہ کر گلہ غافل — رہ تسلّی کہ یوں مقدّر تھا
اتنے منعم جہاں میں گزرے — وقتِ رحلت کے کس کنے دل تھا
صاحبِ جاہ و شوکت و اقبال — ایک زاں جملہ اب سکندر تھا
تھے یہ سب کائنات زیرِ نگیں — ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زر و گوہر — چاہیے جس قدر میسّر تھا

آخر کار جب جہاں سے گیا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

بے اختیاریٔ عشق (میر)

بتوں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا — وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
وہ دل کہ شام و سحر جیسے پکّا پھوڑا تھا — وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فگار رہا
تمام عمر گئی اس پہ ہاتھ رکھتے ہی — وہ دردناک علی الرغم بے قرار رہا
ستم میں غم میں سرانجام اس کا کیا کہیے — ہزاروں حسرتیں تھیں تس پہ جی کو مار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا — رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا

گلی میں اس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

انعامِ الٰہی

(سورج نراین مہر)

جس کا ہُوا دعا کو بلند ایک بار ہاتھ — نیچا ہوا نہ ہو کے کبھی شرمسار ہاتھ
تیرے کرم نے بڑھ کے وہیں تین چار ہاتھ — سائل کو دور ہی سے صدا دی پسار ہاتھ

پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

شرمِ برہنگی تھی شجر کو بہار سے — دستِ دعا بلند ہوئے شاخسار سے
یارب ہمیں بچائیو اس ننگ و عار سے — اور تو نے ان کو لاد دیا برگ و بار سے

پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

کھولا تھا منہ صدف نے دعا کے لئے وہاں — ابرِ کرم کو حکم اُسی دم ملا کہ ہاں
خالی نہ بارگاہ سے جائے یہ بے زباں — بھر دو دُرِ خوش آب سے اس کا ابھی وہاں

پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

طوفانِ باد و موج میں ہے کون کارساز — غوطے پہ غوطے کھاتا ہے جب بحر میں جہاز
ہوتے ہیں ہاتھ سب تری درگاہ میں دراز — اور تو پناہ دیتا ہے ان سب کو بے نیاز

پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

تیرے کرم پہ رکھ کے بھروسہ جہان نے — بوئے تھے کھیت لطف سے کیا تیری شان نے

رحمت کی وہ لگائی جھڑی آسمان نے
اک اک کے لاکھ لاکھ کمائے کسان نے

پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

نعمت سے تو نے بھر دیا عالم کے خوان کو
اور سیم و زر سے کر دیا لبریز کان کو
تاروں کے تھال بھر کے دئے آسمان کو
رحمت ہے یا خدا تیری دینے کی شان کو

پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

معمور مال سے ہیں خزانے اُجاڑ کے
بھرپور سیم و زر سے ہیں دامن پہاڑ کے
دینے پہ تو جو آئے بنا دے بگاڑ کے
دے جس پہ تیرا فضل ہو چھپر کو پھاڑ کے

پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

یوں جب کہ فیضِ عام ہے مخلوق پر ترا
کیا مہر بارگاہ سے محروم جائے گا
یا مالک القلوب مرے دل کا مدّعا
روشن ہے تیری ذات پہ پھیلاؤں ہاتھ کیا

پھیلائے کیا کوئی مرے پروردگار ہاتھ
بندے کا ایک ہاتھ ہے تیرے ہزار ہاتھ

دورِ انقلاب (محشر لکھنوی)

چلن دنیا کا بدلا وضعِ شیخ و برہمن بدلی
پرانے لوگ اُٹھے انجمن کی انجمن بدلی
رواجِ نو ہوا جاری ہر اک رسمِ کہن بدلی
نئے الفاظ کی بندش سے ترکیبِ سخن بدلی

سب اگلی صورتیں خوابِ پریشاں ہو گئیں محشر
عدم کے پردے میں جا جا کے پنہاں ہو گئیں محشر

حسینانِ جہاں کا بدلا اندازِ جفا کاری رہی عشّاق میں باقی نہ اگلی سی وفاداری
نئی دنیا ہوئی آباد زیرِ چرخِ زنگاری نظامِ کارِ عالم بھی بہ طرزِ نو ہوا جاری
پلٹتے ہی ہوا کے آئی وہ جدّت طبیعت میں
نئے انداز پیدا ہو رہے ہیں رنج و راحت میں

جنابِ شیخ کا ممبر پہ اندازِ بیاں بدلا نئی حوریں ہوئیں پیدا گلستانِ جناں بدلا
ہوئے دل مطمئن ایسے خیالِ این و آں بدلا بہ زورِ فلسفہ رنگِ زمین و آسماں بدلا
ہر اک سر میں بھری ہے قوّت سودائے آزادی
جسے دیکھو وہ جان و دل سے ہے شیدائے آزادی

ہوئی تخئیل شائستہ مذاقِ شاعری بدلا مہذّب ناولوں سے رنگ افسانہ گری بدلا
کرشموں سے مسوں کے جلوۂ حسنِ پری بدلا ادائے مغربی سے کہنہ رنگِ دلبری بدلا
نگاہِ اہلِ نظّارہ خبر لے آئی لندن کی
ہے برقی روشنی میں جستجو عیسیٰ کی سوزن کی

گئے وہ دن کہ روزِ ہجر جب تھا آفتِ جانی شبِ فرقت حیات و مرگ کی صورت تھی طولانی
مضامیں نظم ہوتے تھے خلافِ عقلِ انسانی معاذ اللہ بتانِ دہر میں اوصافِ ربّانی
یہ سب باتیں فقط اگلے زمانے ہی پہ زیبا تھیں
کہاں تک کہہ سکے کوئی خدا معلوم کیا کیا تھیں

جو ہیں جدّت پسند اب ان کے ساماں اور ہی کچھ ہیں خیالات اور ہی کچھ دل کے ارماں اور ہی کچھ ہیں
ترقی کے ارادے تا بہ امکاں اور ہی کچھ ہیں طلسم سعی و کوشش کے یہ انساں اور ہی کچھ ہیں

معطّل لوگوں کو سب صاحب آزار کہتے ہیں
جنھیں ہے عقل وہ بے کار کو بیمار کہتے ہیں

نہیں دنیا کے زندہ دل کبھی بیکار ہیں دم بھر — مگر ہم ہیں لبِ گور اور پھر بیکار سر تا سر
ہمیں سے سب نے سیکھا سیکھ کر بن بیٹھے کاری گر — ہمارے نام سے اب تک رہے ہیں ہو گے نام آور

وہ سب کچھ ہیں مگر ہم کچھ نہیں اپنی جہالت سے
یہ کیا ہے صرف لاعلمی ہے اپنے علم و صنعت سے

اُٹھو اے کاہلی کے ناز بردارو بس اب اُٹھو — اُٹھو اے قیدِ ہستی کے گرفتارو بس اب اُٹھو
اُٹھو آزارِ بیکاری کے بیمارو بس اب اُٹھو — اُٹھو اے بادۂ مستی کے سرشارو بس اب اُٹھو

مثل النّوم اُخت الموتُ کی گو سنتے آتے ہو
مگر اِس کان سے سنتے ہو اور اُس کان اُڑاتے ہو

حریفانِ جہاں کی تازہ کاریاں دیکھ لو اُٹھ کر — یہ میدانِ ترقّی بے قراری دیکھ لو اُٹھ کر
حصولِ علم و فن میں جاں سپاری دیکھ لو اُٹھ کر — حدِ تکمیل تک محنت شعاری دیکھ لو اُٹھ کر

اُٹھو بس مل گئے آنکھیں لو سبق روشن دماغی کا
ہوئی ہے اور ہی کچھ صورتِ دنیا و مافیہا

پرانا تھا جو دنیا کا وہ دستور العمل بدلا — مفید مدّعا کاموں سے امرِ بے محل بدلا
نہ بدلے زندگی کیونکر کہ اندازِ اجل بدلا — رہے جدّت جو فیشن آج جاری ہے وہ کل بدلا

لئے بیٹھے رہیں ہم سب پرانی پوتھیاں اپنی
رٹیں دن رات طوطے کی طرح سے داستاں اپنی

شکایت ہے اگر افراط اور تفریط کی پیدا — تو آؤ انتخابی عقل سے لیں کام تھوڑا سا

موافق رسم اور ملت کے ہم کو مل سکے جتنا
نکالیں بس اُسی رستے سے اک رستہ ترقی کا

کریں جی توڑ کر کوشش معین اپنا خدا ہوگا
عمل خذ ما صفا پر کون کہتا ہے برا ہوگا

ترقی یافتہ اقوام کا معیار (محمود اسرائیلی)

کسی نے آ کے اک مردِ جہاں دیدہ سے یہ پوچھا
ترقّی یافتہ قوموں کا کیا معیار ہوتا ہے

میں سنتا ہوں کہ وہ دنیا میں اہلِ سیف ہوتی ہیں
ہر اک فرد ان کا جزوِ عسکرِ جرّار ہوتا ہے

زمیں پر کوندتے ہیں اُن کے خنجر برق بن بن کر
اور ان کا ہر نفس فی نفسہٖ تلوار ہوتا ہے

وہ دانش مند بولا گو یہ تو نے سچ کہا لیکن
بلند اس سے بھی کچھ تہذیب کا معیار ہوتا ہے

کہاں اب تیغ کی حاجت رہی کشور کشائی کو
مگر اب علم و فن اس کی جگہ درکار ہوتا ہے

مجاہد کے لہو سے بڑھ کے عالم کی سیاہی ہے
کہ اس کا نقطہ نقطہ رو کشِ گلزار ہوتا ہے

ترقی یافتہ اقوام کے اوصاف مجھ سے سن
ہر اک فرد ان کا آزاد و دیانت دار ہوتا ہے

حلیم الطبع، جاں باز و صداقت کیش و باہمّت
وطن پرور، سخی و خوگرِ ایثار ہوتا ہے

جری ہوتا ہے اس میں جرأتِ اخلاق ہوتی ہے
وہ کہہ دیتا ہے جو کچھ واجب الاظہار ہوتا ہے

وفا کی طرح دل میں غیرتِ قومی بھی ہوتی ہے
وہ ملّت کے لئے جاں دینے کو تیّار ہوتا ہے

وہ حتّی الوسع اپنے زورِ بازو سے کماتا ہے
اُسے بیکار رہنا وجہِ ننگ و عار ہوتا ہے

تو جیسے اہلِ مغرب کی طرح صورت بدلتا ہے
کبھی سیرت بدلنے کو بھی یوں تیّار ہوتا ہے

حالتِ قوم (محمود اسرائیلی)

پست ہو نہ جائے کیوں ہمّتِ بلند اپنی
بن گئی ہے دام اپنا آپ ہی کمند اپنی

موجبِ تکبّر ہے عجز بے محل اپنا
مائلِ تعدّی ہے طبعِ دردمند اپنی

آتشِ عداوت ہے شعلہ زن دماغوں میں
اور خرد پریشاں ہے صورتِ سپند اپنی

اب کہاں وہ یک رنگی اب کہاں وہ یک جہتی
اب کہاں وہ عزم اپنا رائے سودمند اپنی

اب کہاں وہ سینوں میں ولولے شجاعت کے
اب کہاں وہ اگلی سی قسمت ارجمند اپنی

اب کہاں وہ پہلو میں پاک پُرعقیدت دل
اب کہاں طبیعت وہ نیک و حق پسند اپنی

چھوڑ کر شریعت کو پیروی کی مغرب کی
مفلسی و محتاجی بڑھ گئی دوچند اپنی

خوبیاں جوانی کی کھوئیں شوقِ طفلی نے
مسخ کر دی مسلم نے شکلِ دل پسند اپنی

درسِ بصیرت (محمود اسرائیلی)

دستِ فرہاد بنا تیشۂ بُرّاں کے لئے
ہستیِ قیس ہوئی وقف بیاباں کے لئے

ہے دلِ بلبلِ بے تاب فغاں سے معمور
لذتِ سوز ہے پروانۂ رقصاں کے لئے

چشمۂ کوہ کی ہر موجِ گہر بار میں ہے
اک ترنّم کی صدا مرغِ غزل خواں کے لئے

منزلِ دہر میں جو نقشِ قدم ملتا ہے
مشعلِ راہ ہے وہ بے سروساماں کے لئے

کوئی مشکل نہیں دنیا میں جو آسان نہ ہو
عزم بالجزم مگر شرط ہے انساں کے لئے

جذبۂ شوقِ شہادت میں کبھی آہ تو کھینچ
کام شمشیر کا دے گی یہ رگِ جاں کے لئے

خستہ حالی پہ کبھی اپنی تو آنسو نہ بہا — کہ بنیں تارِ رفو چاکِ گریباں کے لئے
تیرے میدانِ شجاعت میں قدم کانپتے ہیں — ننگ ہے ننگ یہ خود دارِ مسلماں کے لئے
مکتبِ عشق میں جا درس براہیم کا لے — اک نیا کعبہ نیا قوّتِ ایماں کے لئے
رشکِ گلزار بنا اس دلِ صد چاک کو تو — کہ یہ درکار ہے گلدستۂ عرفاں کے لئے
منّتِ مہرِ درخشاں ہے اُسے موجبِ ننگ — اک شرر کافی ہو جس سوختہ ساماں کے لئے

آتشِ شوق سے کر بزم چراغاں غافل
در بدر پھرتا ہے کیوں شمعِ فروزاں کے لئے

سخنِ ماہر (ماہر القادری)

ہر نفس پیغامِ بربادی ہے انساں کے لئے — نبض کی ہر موج ہے نشتر رگِ جاں کے لئے
زندگی دی ہی گئی تھی کشمکش کے واسطے — دل بنایا ہی گیا تھا سوزِ پنہاں کے لئے
اپنے اندازِ کرم کی مجھ سے تاویلیں نہ کر — یہ بھی اک تقریب تھی جورِ فراواں کے لئے
اے مرے حسنِ عقیدت اے مرے نورِ یقیں — کفر کی بھی اک جھلک تکمیلِ ایماں کے لئے
کچھ نہ پا کر بھی سمجھتا ہے کہ سب کچھ پا لیا — زندگی سب سے بڑا دھوکا ہے انساں کے لئے
پھول ذرّے کہکشاں تارے شفق قوسِ قزح — نذر لائے ہیں ترے حسنِ فراواں کے لئے

رہ گئی ہے دولتِ ایمان و دیں ماہر کے پاس
یہ بھی حاضر ہے نگاہِ کفر ساماں کے لئے

بدگمانی (ماہر القادری)

ہم نشیں اہلِ جہاں کی تنگ دامانی نہ پوچھ
وہم زائیدہ جنوں کی فتنہ سامانی نہ پوچھ

کھو چکا ہے عظمتِ تقدیسِ انساں کا ضمیر
ڈھل چکا ہے وہم کے سانچے میں فطرت کا خمیر

خود تراشیدہ خیالوں پر یقیں کا ہے مدار
آدمی کا ہے تخیّل بدگمانی کا شکار

بن چکے ہیں وہم کے اڈے جہاں کے دشت و کوہ
آدمی کو آدمی کے حال کی رہتی ہے ٹوہ

کھا رہے ہیں اہلِ دانش بدگمانی کے فریب
چھٹ چکا ہے ہاتھ سے فطرت کا دامانِ شکیب

اک ذرا سی بات کو افسانہ کر دیتے ہیں لوگ
لگ چکا ہے بدگمانی کا دلِ انساں کو روگ

ہو رہی ہے وہم کے اجزا سے تعمیرِ خیال
ساغروں میں گھل رہا ہے بدگمانی کا گلال

اس جہاں میں وہم کی پرچھائیوں کا راج ہے
بدگمانی کا عمل رسوائیوں کا راج ہے

اس جہاں میں پھول کی پتّی کو چھو لینا گناہ
حسن کے موضوع پر اشعار کہہ دینا گناہ

اوس کی بوندوں سے دامن کو بھگو لینا گناہ
آبشاروں کے کنارے ہاتھ دھو لینا گناہ

چاندنی راتوں سے لذّت یاب ہونا بھی گناہ
اک ذرا سی دیر کو بے تاب ہونا بھی گناہ

ایک پاکیزہ مسرّت کا تصوّر بھی گناہ
حسن کے عنوان پر غور و تفکّر بھی گناہ

آسماں کے چاند تاروں کا نظارہ بھی گناہ
پھول کی معصوم ڈالی کا سہارا بھی گناہ

محفلِ شعر و ادب میں بار پانا بھی گناہ
شعر پڑھنا جرم اور کچھ گنگنانا بھی گناہ

انتہا یہ ہے کہ احساسِ مسرّت بھی گناہ
مختصر یہ ہے کہ پاکیزہ محبت بھی گناہ

اس جہاں میں شعر گو بھی کس قدر ہیں بدنصیب
لوگ شاعر کے تصوّر کو سمجھتے ہیں رقیب

فکرِ شاعر کو کوئی دل کش کھلونا چاہیئے
شعر کے ماحول کو رنگین ہونا چاہیئے

رنگ و بو کے گلستاں میں شعر پاتا ہے فروغ
کاش اس پہ غور کرتا بدگمانی کا دروغ

دل کی دھڑکن شعر میں جب تک کہ ہو جائے نہ بند
مطمئن ہوتی نہیں شاعر کی طبعِ دردمند

ہے محرک کی ضرورت دل کی دھڑکن کے لئے
چاہیئے مہمیز اس چالاک توسن کے لئے

لوگ شاعر کو سمجھتے ہیں فرشتے کی مثال
ایک مرکز سے کبھی ہٹتا نہیں جس کا خیال

اس جہاں میں زندگی کا نام ہے آوارگی
ہے دماغوں پر مسلّط زہد کی بے چارگی

فطرتِ شاعر پہ اور پابندیاں فریاد ہے
یہ زمانہ کس قدر نافہم اور جلّاد ہے

یادِ سلف (تلوک چند محروم)

شگفتہ لالہ و گل اب بھی ہوتے ہیں بہاروں میں
وہی ہے لمبی لمبی دوب اب بھی سبزہ زاروں میں

وہی اب ہے جو پہلے تھا ترنّم آبشاروں میں
دکھاتی ہے کرشمے اب بھی قدرت کوہساروں میں

نظارے ہیں وطن کے دل نشیں جیسے کہ پہلے تھے
مگر افسوس ہم ویسے نہیں جیسے کہ پہلے تھے

نہ وہ دل ہے نہ ہے وہ دیدۂ معنی نگر باقی
بزرگوں کی خصائل کا نہیں ہم میں اثر باقی

کمالات ان کے باقی ہیں نہ وہ علم و ہنر باقی
جو یاد اُن کی ہے وہ سونے کی چڑیا کے ہیں پر باقی

امینِ معرفت کہتے ہیں اب تک جن کے سینوں کو
ستم ہے اے زمیں تو کھا گئی ایسے سفینوں کو

بچّوں کی موت (تلوک چند محروم)

توڑتا ہے کس لئے غنچوں کو گلچینِ اجل
کس سے پوچھیں آہ! کیا ہے طرزِ آئینِ اجل

ہائے معصوموں کی جانوں پر عذابِ جاں کنی
پھول سے اجسام نذرِ التہابِ جاں کنی

آہ ہنستے کھیلتے خاموش ہو جاتے ہیں کیوں
جس سے پھر اُٹھتے نہیں وہ نیند سو جاتے ہیں کیوں

اپنے بیگانوں کا دل رہتا ہے جس سے باغ باغ
دیکھئے اُن کے جگر جن کو یہ دے جاتے ہیں داغ

تا دمِ آخر جدائی کے ستم سہتے ہیں وہ
مر نہیں جاتے مگر زندوں میں کب رہتے ہیں وہ

اُن کے اُجڑے باغ میں فصلِ بہار آتی نہیں
بام و در سے اُن کے اُٹھتی ہے یہ فریادِ حزیں

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

شام کا سماں (نظم طباطبائی)

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے

قدم گھر کی طرف کس شوق سے اُٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اُٹھا کر آنکھ اُدھر اک ہو کا ہے عالم

مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

کبھی اک گنبدِ کہنہ پہ بومِ خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے

کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

پندِ سود مند (نظم طباطبائیؒ)

خوبیاں انسان کی جتنی ہیں گر پیدا نہ کر
تو بھی ہے انسان پھر اس بات کا دعویٰ نہ کر

گر کسی کا عیب ہو معلوم تو اس کو چھپا
گر کسی کا راز ہو معلوم تو افشا نہ کر

آتش افروزی کرے کوئی کسی کا گھر جلے
ہے جو ہمدردی تجھے تو دور سے دیکھا نہ کر

ہے غبارِ فتنہ انگیز اس جہاں میں افتراق
بھول کر بھی تو کبھی اس راہ سے گزرا نہ کر

کر نہ دعوائے قناعت سیر ہو جب تک نہ چشم
دل غنی جب تک نہ ہو اظہارِ استغنا نہ کر

آنکھ کو تعلیم دے پاسِ ادب رکھے نگاہ
دل پہ کر قدغن کہ ہر اک بات پر مچلا نہ کر

گوہرِ یکدانۂ مطلوب کی گر ہے ہوس
کتنے پانی میں ہے تو اس کا خیال اصلا نہ کر

کرتا ہے مشکل کو مشکل تر وفورِ اضطراب
مرغِ زیرک ہے تو آ کر دام میں پھڑکا نہ کر

دیکھ لے گرجے برس پڑتا ہے اکثر ابرِ تر
بُخل اگر تجھکو برسنے میں ہے تو گرجا نہ کر

کہتے ہیں عاقل ہے از قسمِ جنوں طیش و غضب
شیر ہے تو، میں نے یہ مانا مگر بپھرا نہ کر

علم و حکمت چاہیئے انسان بننے کے لئے
آرزوئے نعمتِ دنیا و ما فیہا نہ کر

پر لگا دیتی ہے راہِ شوق میں دل کی اُمنگ
اُڑ کے منزل پر پہنچ تقلیدِ نقشِ پا نہ کر

جو کمالاتِ بشر ہیں چاہیئے حاصل ہوں سب
ہے دلیلِ نقص ہرگز اس میں استثنا نہ کر

جب حقیقت ہو عیاں اوہام کا دھوکا نہ کھا
ہو کے غافل صبحِ صادق کو شبِ یلدا نہ کر

صاف کر یہ زنگ ہے آئینۂ ادراک کا
ہم کسی سے کم ہیں دل میں یہ خیال اصلا نہ کر

ساتھ والوں سے پہنچ منزل پہ اپنی پیشتر
تھک کے پیچھے کوئی رہ جائے تو کچھ پروا نہ کر

التفات و انقلابِ دہر سب ہیں بے ثبات
یہ ہے چلتی چھاؤں اس کو دیکھ کر دوڑا نہ کر

ہاتھ کا ہے میل مال و زر کہ آیا اور گیا ۔۔۔ کر کے ہمّت پر بھروسہ دل کو تو میلا نہ کر

عقل کر دیتی ہے زائل نعمتِ دنیا کبھی ۔۔۔ خود سے رو گرداں اگر ہو جائے تو پیچھا نہ کر

جب کہ ناکامی کا باعث دست و بازو ہوں ترے ۔۔۔ ہے قصور اپنا فلک کا شکوۂ بے جا نہ کر

کل جو کچھ ہوتا ہے اُس کے واسطے آمادہ رہ ۔۔۔ شادیِ امروز کو محوِ غمِ فردا نہ کر

تیرے باطن کو ہے توفیقِ الٰہی سے بھی راہ ۔۔۔ منع وہ جس بات کو کر دے اُسے حاشا نہ کر

ہاتھ فوراً روک لے باز آ قدم پیچھے ہٹا ۔۔۔ جب صدا آتی ہو یہ دل سے کہ دیکھ ایسا نہ کر

بے تامّل اُٹھ جو نصرت کو پکارے تجکو قوم ۔۔۔ وقت ایسا ہو تو کچھ سوچا نہ کر سمجھا نہ کر

لَا یُلَامُ الْمَرْءُ فِی حُبِّ الْعَشِیْرَۃِ یاد رکھ ۔۔۔ پھر ملامت بھی کرے کوئی تو کچھ پروا نہ کر

تجکو حاصل ہو نہ جب تک اوجِ معراجِ کمال ۔۔۔ محو دل سے ذکرِ سبحان الّذی اسرا نہ کر

لکھ کے کچھ تو ظلِّ محمود اپنے خامے سے دکھا ۔۔۔ آپ کو منّت کشِ ظلِّ ہما اصلا نہ کر

نظمؔ یہ باتیں گرہ میں باندھ رکھنے کی ہیں سب
لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰے کر یا نہ کر

ایمان پیدا کر (نوح ناروی)

بسر آرام میں جس سے ہو وہ سامان پیدا کر ۔۔۔ خدا کی یاد پیدا کر خدا کا دھیان پیدا کر

نہ پوری ہو کہ ہو پوری نہ نکلے یا نکل جائے ۔۔۔ کوئی اُمید پیدا کر کوئی ارمان پیدا کر

ترقی کی اُمنگیں جسمِ بے حس کو اُبھاریں گی ۔۔۔ مزا جب ہے کہ اس تصویر میں تو جان پیدا کر

نفاقِ باہمی سے ہر طرح ہے اتفاق اچھا ۔۔۔ جو پیدا کر سکے تو اس کو تا امکان پیدا کر

اگر ایمان ہوگا تو ہزاروں خوبیاں ہوں گی ۔۔۔ یہ بات ایمان کی ہے پیش تر ایمان پیدا کر

کوئی بے علم ممتازِ جہاں ہو ہی نہیں سکتا
اسے ہر وقت ہر دم ہر گھڑی ہر آن پیدا کر

یہ تیرے کام کی باتیں ہیں تیرے کام آئیں گی
توکل صبر استقلال اطمینان پیدا کر

رضا جوئی، وفاداری، خوش اخلاقی، ملنساری
یہ پیدا کر یہ پیدا کر یہ کہنا مان پیدا کر

بہت سا عمر کا حصہ تو گزرا نوح غفلت میں
خدا کے واسطے کچھ اب بھی اے نادان پیدا کر

حالِ غم (نوح ناروری)

کیا کہوں میں حالِ غم مجھ سے کہا جاتا نہیں
چپ اگر رہتا ہوں تو چپ بھی رہا جاتا نہیں

اب ضعیفوں میں ضعیفوں کی وہ ہمدردی نہیں
اب جوانوں میں جوانوں کی وہ پامردی نہیں

اب نہاں بدلی میں خورشید و قمر کا روپ ہے
اب نہ گھر میں چاندنی ہے اب نہ حمیت پردہ پوش ہے

مذہب و ملت کی جانب سے طبیعت ہٹ گئی
جوش زن تھا خون جس رگ میں وہ رگ ہی کٹ گئی

ہر گھڑی ہے عیش کی ہر وقت ہے آرام کا
جو نہ کام آئے بشر کے وہ بشر کس کام کا

ہے یہی جھگڑا تو بس حاجت روائی ہو چکی
خانہ جنگی سے صفائی کی صفائی ہو چکی

رہنے سہنے ملنے جلنے کھانے پینے کا مزا
سب کے سب ہو جائیں یک دل تو ہے جینے کا مزا

ہر کسی کو پچھلی باتیں یاد کیا کیا آئیں گی
یہ جو آج آزادیاں ہیں کل نہ رہنے پائیں گی

بادۂ غفلت کو پی کر ساغرِ دل رکھ دیا
نام ناداری کا یاروں نے توکل رکھ دیا

پوچھنے والا نہیں کوئی دلِ ناشاد کا
یا خدا امداد کر یہ وقت ہے امداد کا

صنعت وحرفت (نوح ناروی)

اے مرے پیارے عزیزانِ وطن بیدار ہو
خوابِ غفلت سے اٹھو چونکو بس اب ہشیار ہو

کاہلی کا بوجھ سر پر اپنے اپنے دھر چکے
ہے یہی آرام اگر کرنا تو سب کچھ کر چکے

انقلابِ دہر نے صورت بدل دی دہر کی
ہو گئی تاثیر امرت میں بھی پیدا زہر کی

جادۂ بے رہ نما میں ساتھ سب کا چھٹ گیا
قافلہ منزل کے پاس آتے ہی آتے لٹ گیا

وہ شرف وہ شان وہ جاہ و حشم باقی نہیں
وہ سماں وہ بزم وہ مے خوار وہ ساقی نہیں

ورطۂ بحرِ مصائب سے ابھرنا چاہیے
تم کو پچھلا کارنامہ یاد کرنا چاہیے

چارۂ ردّ و بدل ہی جب نہیں تو کچھ نہیں
قوّتِ حسنِ عمل ہی جب نہیں تو کچھ نہیں

ہر طرف ادبار کی کالی گھٹائیں چھا گئیں
آسماں سے آفتیں چل کر سروں پر آ گئیں

دفتروں میں بھی کلی امید کی کھلتی نہیں
ہو گئے بی اے کلرکی تک مگر ملتی نہیں

شیوۂ حاجت روائی آپ حاجت مند ہے
کس طرف جائے کوئی ایک ایک رستہ بند ہے

جھیل کر آزار و غم جس سے گذر جانا پڑا
زندگی کے واسطے بے موت مر جانا پڑا

حدّ معیّن ہی نہیں خدمت گذاری کے لئے
اک زمانہ چاہیئے امیدواری کے لئے

اور جانب تھا پلٹنا اور جانب پھر گئے
دل سے اترے ساری دنیا کی نظر سے گر گئے

خرّمی مفقود عشرت گم مسرّت دور ہے
جیسی کرنی ویسی بھرنی یہ مثل مشہور ہے

ناو بھی ٹوٹی ہوئی دم بھی نہیں پتوار میں
ناخدا کی ناخدائی کیا کرے منجدھار میں

پیش تر آغاز سے ہو بند و بست انجام کا
جو نہ آپنے کام آئے کام وہ کس کام کا

پست ہمت کر سکے کوئی ترقی کس طرح
ویسی ہی گذرے گی اب تک اس کی گذری جس طرح

ناز تھا جس پر بہت کچھ وہ جسارت مٹ گئی — مدح خواں تھا جس کا عالم وہ حمیت لٹ گئی
لوگ کہتے ہیں زراعت سب سے اچھی چیز ہے — میں اسے تسلیم کرتا ہوں یہ گھر کی چیز ہے
رات کو پالا پڑے تو دن کی تیزی بھی فضول — وقت پر بارش نہ ہو تو تخم ریزی بھی فضول
رشتۂ الفت تن آسانی سے جوڑا کیا گیا — صنعت و حرفت سے اپنے منھ کو موڑا کیا گیا
اس کے پردے میں مفادِ ملکی و مالی بھی ہے — اس میں آزادی بھی ہے اور اس میں خوشحالی بھی ہے
کوشش و محنت کا ہر دم دھیان رکھنا چاہئے — ذائقہ تدبیرِ امکانی کا چکھنا چاہئے
جن ممالک میں نہیں ہے یہ وہیں تو کچھ نہیں — یہ اگر ہے تو ہے سب کچھ یہ نہیں تو کچھ نہیں
دست کاری پر فقط موقوف عزت رہ گئی — دست کاری دست گیرِ اہلِ حاجت رہ گئی
اس سے بڑھ کر مشغلہ ہے اور کیا دن رات کا — نام اپنے ملک کا ہے کام اپنے ہات کا
کی تجارت جس نے اس کے پاس دولت آگئی — اس کو سب کچھ آگیا جس کو تجارت آگئی

بحرِ طوفاں خیز میں ہر موج اک تلوار ہے
نوح کا کہنا اگر مانا تو بیڑا پار ہے

دیر و حرم (نوح ناروی)

پھر میری نگاہوں کے آگے اب دیر و حرم کا منظر ہے
یہ گھر بھی کیا اچھا گھر ہے وہ گھر بھی کیا اچھا گھر ہے
دونوں کے ضوابط اپنی جگہ دونوں کی عقیدت اپنی جگہ
دونوں کے مراتب اپنی جگہ دونوں کی حقیقت اپنی جگہ
اک پھول سے دونوں باغوں کی رونق بھی ہے زینت بھی ہے

اک شمع سے دونوں بزموں کی وقعت بھی ہے عزت بھی ہے
تشبیہ یہ ہے معقول اس کی معمار ہے اک تعمیریں دو
توجیہ یہ ہے مقبول اس کی اک کاتب ہے تقدیریں دو
دو رستے ہیں اک منزل ہے دو ساحل ہیں اک دریا ہے
دو مطرب ہیں اک نغمہ ہے دو ساغر ہیں اک صہبا ہے
وحدت میں کثرت کا عالم کثرت میں وحدت کا عالم
ہر منظر میں سو سو منظر ہر عالم میں صد ہا عالم
منہ اپنا رابطہ کامل نے دم بھر کو نہ موڑا خوب کیا
تسبیح کے دانوں کا رشتہ زُنّار سے جوڑا خوب کیا
اس سمت حضوری ہوتی ہے امیّد کے غنچے کھلتے ہیں
اُس سمت نکلتا ہے ارماں بے مانگے درشن ملتے ہیں
حاضر ہیں نمازی ایک طرف تقوے کی تمنّا ہے ان کو
بیٹھے ہیں پجاری ایک طرف پوجا کی تمنّا ہے ان کو
پڑھتا ہے مناجاتیں کوئی سر اپنا کوئی دھنتا ہے
گاتا ہے بھجن دل سے کوئی سو دل سے کوئی سنتا ہے
ناقوس و اذاں کی آوازیں گونجی ہیں فضائے عالم میں
پُر کیف ہوائیں شامل ہیں پُر لطف ہوائے عالم میں
جو بیچ میں پردہ حائل ہے اُٹھ جائے تو لطف آ جائے
سب کچھ کھو کر سب کچھ کی جگہ ہر طالب سب کچھ پا جائے

صوفی بھی خوش پنڈت بھی مگن اشلوک کہیں تکبیر کہیں
انوار کہیں اوتار کہیں تمہید کہیں تقریر کہیں
اسرارِ حقیقت کا کھلنا آسان نہیں ہے مشکل ہے
جو سہل کرے دشواری کو ادراک کا حاصل وہ دل ہے
مشرب میں ہے ملّت میں ہے چرچا ان کا شہرت ان کی
آنکھوں میں ہے نظروں میں ہے رتبہ ان کا حرمت ان کی
سنگِ اسود ہے وجہ شرف کیا اور حرم میں رکھا ہے
ہیں دیر میں سب بت پتھر کے پتھر ہیں خدا جانے کیا ہے
جو سمجھے گا اس کا نکتہ اس کو نہ کبھی خواری ہوگی
آپس کی برائی کرنے سے آپس کی دل آزاری ہوگی
خوددار کو پایا ڈرتے ہوئے خودبیں کو وہاں رکتے دیکھا
مغرور کو دکھا دیتے ہوئے سرکش کو یہاں جھکتے دیکھا
عقدہ یہ کسی سے حل نہ ہوا جو راز رہا وہ راز رہا
یعنی یہ کسی پر کھل نہ سکا کیا سوز رہا کیا ساز رہا
جب غور کرو تحقیق کرو سوچو سمجھو تو نام وہی
ہے فرق فقط ان لفظوں میں اللہ وہی ہے رام وہی
رہتا ہے نہاں ہوتا ہے عیاں اکثر اس میں اکثر اس میں
لیتا ہوں پتہ پاتا ہوں نشاں اکثر اس میں اکثر اس میں
حق ناحق کی بحثیں ہیں عبث حق ناحق سے مطلب کیا ہے

تفریق مذاہب کا جھگڑا وہ جب گیا تھا یہ اب گیا ہے
ایک کام بنے گا لڑ بھڑ کر اخلاق سکھاؤ مل جل کر
ہے شرط مگر موقع کی بھی اکثر چھپ کر اکثر کھُل کر
پوشیدہ ایسی قوت ہے دل جس سے کھنچتے جاتے ہیں
آزار و مصائب سہہ سہہ کر ہندو مسلماں آتے ہیں
گرمی ہو کہ جاڑا یا بارش اوقات کی کچھ تخصیص نہیں
کچھ شام و سحر کی قید نہیں دن رات کی کچھ تخصیص نہیں
کوئی اس کا عالم دیکھے کوئی اُس کا جلوا دیکھے
محدود نگاہوں سے لیکن کیوں کر دیکھے کیا کیا دیکھے
گو کچھ بھی ہو جب پوچھوگے تو کہہ دے گا فرزانہ یہی
اے نوح پرستش دل کی کرو کعبہ ہے یہی بت خانہ یہی

کمالِ سخن (خوشی محمد ناظر)

ہے کمالِ اہلِ سخن یہی کہ وہ حق کا جلوہ نما رہے
وہ ندائے ملہمِ غیب ہو وہ ضیائے نورِ خدا رہے

وہ نوائے سوز کا ساز ہو وہ صدائے زہرہ گداز ہو
وہ سرودِ روح نواز ہو کہ زمانہ مستِ نوا رہے

جو زمانہ نفس پرست ہو جو مقامِ روح کا پست ہو
اُسے یادِ قولِ الست ہو اُسی وعدہ پہ وہ گوا رہے

جو ہوائے اسفلِ خاک میں رہیں اہلِ حرص مغاک میں
تو فضائے عرشِ کریم میں وہ مقیمِ اوجِ سما رہے

جو زمیں پہ دانہ و دام ہو تو وہاں سے اس کا خرام ہو
کہیں ہم آشیانہ قدس میں وہ نہفتہ مثلِ ہما رہے

جو بھٹکتے پھرتے ہوں کارواں [illegible]
شبِ تار میں سرِ رہ گزر وہ چراغِ راہ نما رہے

اُسے شیخ و شاب کا غم رہے وہ عزیز دیر و حرم رہے — کہیں بت کدے میں بھی جا رہے تو بتوں کا قبلہ نما رہے
شبِ غم کی ظلمتِ یاس میں وہ کبھی جھلک ہو امید کی — کبھی حسرتوں کے مزار پر وہ چمکتا ایک دیا رہے
جو ہو بات روحِ نبات ہو جو سخن ہو رازِ حیات ہو — اسی خاکداں میں کہیں نہاں وہ بہ رنگِ آبِ بقا رہے
ہری کونپلیں ہوں بہار میں ہو شگوفہ شاخِ انار میں — تو چمن میں سبزۂ خفتہ کو وہ پیام پیکِ صبا رہے
کبھی بن میں پھول کھلائے وہ کبھی صحنِ باغ سجائے وہ — کبھی ہم رکابِ نسیم ہو کبھی ہم عنانِ صبا رہے

تمھیں ناظر اتنی خبر نہیں کہ تمھیں کو ذوقِ نظر نہیں
جہاں دیکھو منظرِ طور ہے کبھی دل کی آنکھ جو وا نہیں

جوگی (ناظر)

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی۔ جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سروِ سہی طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفاں کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دل کش وہ سماعِ طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ سرود سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا

تھا دل کش منظرِ دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرِ دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی

یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمۂ سیماب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی

یاں قلّۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کی اور انگ بھبھوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیبِ کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی

سب خلقِ خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی

جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اُٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آکے ستاتے ہو
میں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو

کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعوے گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آتے ہو

ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اُس نگری سے منہ موڑ چکے

ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی، ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی تم اُس کو آ کے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
اُس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا
ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللّٰہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اُترا ہے ہرجا. جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساگر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
وہاں دل کا غنچہ کھلتا ہے ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی
ان چکنی چپڑی باتوں سے مست جوگی کو پھسلا یا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اُس پہ نہ تیل گرا یا بابا

ہے شہروں میں غل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت ساد ھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہر میں شورش نفسانی جنگل میں جلوۂ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا
جو جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں، گاتی ہے ملار ہوا بابا
یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کے سندیش سناتے ہیں
یاں روپ انوکھ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا بابا
ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمھیں اور یاد نہیں بھگوان تمھیں
سل پتھر، اینٹ مکان تمھیں دیتے ہیں سکھ سے چھڑا بابا
تن من کو دھن میں لگاتے ہو پیتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا

عورت سے خطاب (نظیر لودھیانوی)

وہ دن بھی تھے کہ تجھ پہ مسرت حرام تھی ۔۔۔ تو شہریار ہو کے کنیز و غلام تھی

ٹکرائی تیری آہ درِ کارساز سے
اُٹھا سحابِ لطف فضائے حجاز سے
جس نے برس برس کے سمندر بہادئے
آفاق کے غلام جم و کے بنادئے
ہر سر بلند کو تہِ شمشیر کر لیا
آئینِ حق نے دہر کو تسخیر کر لیا

دنیائے درد خرّم و دل شاد ہو گئی
تو بھی قیود و جبر سے آزاد ہو گئی

قرباں تو بھی ہو اُسی آقا کے نام پر
احساں ہیں جس کی ذات کے ہر خاص و عام پر
اُٹھ کر حصیرِ خاک سے افلاک گیر ہو
عصمت کی بارگاہ میں مریم نظیر ہو
صحرائے گردوبار میں راہِ صفا پہ چل
خیر النساء کے اُسوۂ منزل نما پہ چل
آغوشِ مادری سے وہ شیرِ الست دے
جو لشکرِ مہیب کو تنہا شکست دے
درویش کی قبا میں جو اسکندری کرے
خنجر کے سایہ میں بھی جبیں گستری کرے

جس کے لہو سے روئے زمیں لالہ زار ہو
جو کربلا میں دینِ خدا پر نثار ہو

بھونرا (غلام بھیک نیرنگ)

طائرِ خوش خبر ہے نام مرا
الفتِ حسن ہے پیام مرا
میری بستی ہے پھول کی خوشبو
غنچۂ گل کی دید کام مرا
وادی کوہ سیرگاہ مری
باغ مسکن ہے صبح و شام مرا
نہیں کس گل سے رسم و راہ مری
سب پہ پھیلا ہوا ہے دام مرا
پھول پھولے نہیں سماتے ہیں
مسکراتے ہیں سن کے نام مرا

جتنے یہ کج کلاہ غنچے ہیں
جھک کے لیتے ہیں سب سلام مرا
مانتے ہیں صنوبر و شمشاد
سروِ آزاد ہے غلام مرا
بادۂ انس کا نشہ ہے مجھے
مئے الفت سے پر ہے جام مرا
حسن کو ڈھونڈتا ہوں ہر گل میں
ذوقِ دید اس قدر ہے عام مرا

جستجوئے گل است ہستیِ من
ہوشیاری نثارِ مستیِ من

شاہدِ گل کا حسنِ جاں پرور
کوئی دیکھے گا مجھ سے کیا بڑھ کر
ابھی اس کے جمالِ رعنا تک
نہیں پہنچی نگاہِ ذوقِ نظر
ابھی اس بھینی بھینی خوش بو سے
نہیں مہکا مشامِ بادِ سحر
ابھی اس پیارے پیارے چہرے کو
نہیں دھویا ہے اوس نے آکر
حالِ پر عندلیبِ نالاں کے
نہیں کی اس نے مسکرا کے نظر
میں ہوں اس حال میں بھی گل سے قریں
ہیں عنایات اس قدر مجھ پر
ہم نفس ہوں انیس و محرم ہوں
میری الفت میں اس قدر ہے اثر

حجلہ آرائے خلوتستم من
بزم پیرائے جلوتستم من

دادِ گلگشت دے رہا ہوں میں
محوِ ہر رنگ و ہر ادا ہوں میں
پیار کرتا ہوں جا کے گیندے سے
منہ بنفشے کا چومتا ہوں میں
آنکھ نرگس سے جا لڑاتا ہوں
مائلِ چشمِ فتنہ زا ہوں میں
لگ چلا ہنس کے سیوتی سے کبھی
کبھی چمپا سے جا ملا ہوں میں

یاسمن سے ہے میری سرگوشی — موتیا سے سخن سرا ہوں میں
ہے نسیمِ سحر سے یارانہ — رازدارِ دلِ صبا ہوں میں
دل دُکھاتا نہیں کسی کا کبھی — رہروِ جادۂ صفا ہوں میں
سرِ خُذْ مَا صَفَا سے واقف ہوں — علمِ دَعْ مَا کَدِرْ پڑھا ہوں میں

دلم از نورِ مہر معمور است
رسمِ بیگانگی ز من دور است

حالتِ قوم (نیرنگ)

دل بھر آیا قوم کی حالت پریشاں دیکھ کر — رو پڑے ہم اپنی بربادی کے ساماں دیکھ کر
اب کہاں وہ دن کہ جب خیرہ تھی چشمِ آفتاب — شوکتِ اسلامیہ کے ساز و ساماں دیکھ کر
صولتِ اہلِ عرب کی دھوم تھی آفاق میں — کانپ جاتے تھے انھیں بہرام و نریماں دیکھ کر
آرزو تو گدگداتی ہے ارادے کو مگر — دل بجھا جاتا ہے حالِ شوقِ یاراں دیکھ کر
بے تردّد یاس کے کشتِ آرزوئے قوم کو — رو پڑے ہم جانبِ ابرِ بہاراں دیکھ کر
کاش ہو ایسی یکایک قوم کی حالت درست — جیسے جاگ اُٹھے کوئی خوابِ پریشاں دیکھ کر

قوم کا غم جاں گزا ہے جس قدر روشن ہو کم
ہاں مگر اپنی بساط اے چشمِ گریاں دیکھ کر

بانگِ درا (غلام رسول نازکی)

پَو پھٹنے لگی دور ہوئی شب کی سیاہی — منزل پہ پہنچ بھی گئے یارانِ سبک پے

دینے لگے مرغانِ سحر حق کی گواہی، — جو راستے دشوار تھے ہمّت نے کیے طے
کرنے لگے پیرانِ حرم یادِ الٰہی — پیچھے نہ رہو راہ خطرناک بہت ہے
میدان میں آیا ہے کمربستہ سپاہی — ہے قافلہ سالار کی آواز پیاپے

جاگ اُٹھو کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور
جاگ اُٹھو کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور

دشواریِ منزل ہے عزیزوں کی نظر میں — دیتی ہے یہ پیغام تمھیں بادِ بہاری
لٹ جاتے ہیں احباب اسی راہ گزر میں — یہ نکہتِ گل مشرق و مغرب میں ہے جاری
ہر وقت ہے اندیشہ لٹیروں کا سفر میں — اک لمحہ بھی بیکار نہیں اس کی سواری
لٹکا کے چلو خنجر و شمشیر کمر میں — سب مل کے اُٹھو کوچ کی آئی ہے یاری

جاگ اُٹھو کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور
جاگ اُٹھو کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور

فرزندِ اسلام سے خطاب (نہال سیوہاری)

اے مکینِ کلبۂ احزاں نہ رو گھر کے لئے — پھر عیاں عالم پہ اپنی قوّتِ تعمیر کر
زندگانی ہے حقیقت اہلِ ہمّت کے لئے — کون کہتا ہے اسے تو خواب سے تعبیر کر
یا جہاں سے نقشِ باطل کی طرح ہو یا فنا — یا جہاں کو ہمّتِ مردانہ سے تسخیر کر
جلوہ ارزانی جہاں میں کر مثالِ آفتاب — نورِ باطن سے رخِ گیتی کو پُر تنویر کر
اپنے عہدِ رفتہ کی عظمت کو پھر آواز دے — بازگشتِ شوکتِ اسلام کی تدبیر کر
عام کر اے درہمِ ہستی میں پیامِ امن کو — دور ذہنِ شمع سے اندیشۂ گل گیر کر

دستِ بندی سے تو ہم کی جہاں کو دے نجات — پارہ پارہ قوتِ ایماں سے یہ زنجیر کر
داغ ہے تاریخِ انساں پر غلامی کا وجود — اس ستم پرور کی جتنی ہو سکے تحقیر کر
فرض ہے اہلِ وفا کا پاسِ پیمانِ وفا — ساتھ دے اسلام کا اسلام کی توقیر کر
دہر پہ چھا جائے عظمت دینِ ابراہیم کی — مشرق و مغرب کو محوِ نعرۂ تکبیر کر

جاں نثارِ شمعِ ملت صورتِ پروانہ بن
راس گر فرزانگی تجھ کو نہیں دیوانہ بن

عروج و زوال (نفیس کمبل پوری)

نتیجہ ایک ہی ہے سارے انسانی فسانوں کا — رہی ہے داستانوں میں یہی اک داستاں باقی
کہ آغازِ جلال قوم ہے "اخلاصِ آزادی" — ہیں اس ایثار و قربانی سے قومیں کامراں باقی
بڑھی مسعودیِ ایثار سے جب دولتِ شخصی — رہیں پھر چندے عیاشانہ بزم آرائیاں باقی
مٹے پھر اپنی نوبت میں وفورِ عیش و عشرت سے — نہ کلدانی و رومی ہیں نہ شاہانِ کیاں باقی
یہی گردش ترقی اور تنزل کی ہمیشہ ہے — اعادہ ہے اسی گردش کا تاریخِ جہاں باقی

پر اے "اسلام" معنی ہیں ترے ایثار و قربانی
رہے گی تیرے حصے میں حیاتِ جاوداں باقی

درسِ عمل (سید رضا علی وحشت)

گزر بے خوف اگر کرنے کے قابل کام ہے — رد نہ کر اے دل اسے، ہمت کا یہ پیغام ہے
ذکرِ آزادی عبث، ممکن جب آزادی نہیں — کیوں اسے تڑپائے کوئی جو اسیرِ دام ہے

بہرِ آغازِ عمل درکار ہے ہمت کا جوش
اور تو افسردۂ اندیشۂ انجام ہے

کامیابی کے وسائل پر کبھی ڈالی ہے نظر
قائلِ الزام خود تو ہے اگر ناکام ہے

رونقِ صبحِ جوانی کی عبث ہے اب تلاش
آمدِ پیری نہیں ہے زندگی کی شام ہے

مرتعش کیوں ہے رگِ جاں دل کو ہے کیوں اضطراب
کچھ تو آخر اس نگاہِ ناز کا پیغام ہے

سرگزشتِ دل کہوں تو کیا کہوں کس سے کہوں
خستہ ہے مظلوم ہے افسردہ ہے ناکام ہے

میری محویت بنی ہے پردہ دارِ رازِ عشق
دل میں جس کی یاد ہے لب پر اسی کا نام ہے

فتنے برپا کر رہا ہے دم بدم نیرنگِ حسن
اور وحشتؔ مفت کو عشق میں بدنام ہے

لیل و نہارِ زندگی (میلا رام وفا)

یاد آیا ہے کہ میں تھا کامگارِ زندگی
وقفِ بہجت مرے تھے لیل و نہارِ زندگی

گلشنِ دل میں مرے کھلتے تھے گلہائے مراد
تھی خزاں ناآشنا میری بہارِ زندگی

نشۂ الفت سے میں سرشار رہتا تھا مدام
میرا حصّہ تھی شرابِ خوشگوارِ زندگی

گیت گاتا تھا محبت کے سحر سے شام تک
میں کہ تھا اک عندلیبِ لالہ زارِ زندگی

آہ تو نے بھی نہ سمجھا میری بدحالی کا راز
کھا گیا تو بھی فریبِ انتشارِ زندگی

چھا گیا میری نگاہوں میں اندھیرا یاس کا
ہو گیا تاریک میرا روزگارِ زندگی

میں ہوں اب بے بہرۂ لطفِ بہارِ زندگی
وقفِ کلفت ہیں مرے لیل و نہارِ زندگی

کعبے کے سامنے (یلدرم)

آوارہ گرد آج ترے در پہ ہے کھڑا — اللہ کیا کشش ہے ترے آستانے میں
تشکیک و شبہ دشمنِ ایمان ہی رہے — سنتا ہوں دل کا چین ہے تیرے خزانے میں
دل کو نہ جب خشوع و تضرّع ہوا نصیب — کیا فائدہ ملا مجھے سر کے جھکانے میں
احرام و طوف سارے ظواہر تو مل گئے — اے کاش اور کچھ بھی ملے اس بہانے میں
صحرائے بے گیاہ ہے اور کوہ ہائے خشک — کیا رمز تھا یہاں چمنِ دیں کھلانے میں
مسلم کو جس طرح سے ستاتے ہیں اہلِ دیر — ہے پاسباں حرم کا بھی ماہر ستانے میں
رنگیں کیا حجاز ترک و عرب کے لہو سے تھا — کوشاں ہے نجد اور اسے رنگیں بنانے میں
یہ سب تو ہے مگر مرے اللہ یہ نہ ہو — اغیار دخل پائیں ترے آستانے میں
واقف ہے تو کہ درد بھرا ہے ہمارا حال — کیا تیرے آگے درد بھروں اس فسانے میں

طیّارہ کامراں پہ ہے جذبے پہ ہے جہاز
تو اپنے گھر کو خود ہی بچا اس زمانے میں

ضمیمۂ نظم لطیف

نشاطِ اُمیّد (حالی)

اے مری امید میری جاں نواز — اے مری دل سوز میری کارساز

میری سپر اور میرے دل کی پناہ — درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ

عیش میں اور رنج میں میری شفیق — کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

کاٹنے والی غمِ ایّام کی — تھامنے والی دلِ ناکام کی

دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ — تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ

تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ — تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج — کھول دیے تو نے قناعت کے گنج

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس — تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو — عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو

نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو — چاہ میں یوسفؑ کی دل آرا تھی تو

رام کے ہم راہ چڑھی رن میں تو — پانڈوؤں کے ساتھ پھری بن میں تو

تو نے سدا قیس کا بہلایا دل — تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل

ہو گیا فرہاد کا قصّہ تمام — پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام

تو نے دی رانجھے کی یہ بندھوائی آس — ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

ہوتی ہے تو پشت پہ ہمّت کی جب
مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

ہات میں جب آکے لیا تو نے ہات
سات سمندر سے گزرتا ہے بات

ساتھ ملا جس کو ترا دو قدم
کہتا ہے وہ یہ ہے عرب اور عجم

گھوڑے کی لی اپنے جہاں تو نے باگ
سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ

عزم کو جب دیتی ہے تو میں جُست
گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پست

تو نے دیا ہے کسے اُبھارا جہاں
سمجھے کہ مٹھّی میں ہے سارا جہاں

ذرّے کو خورشید ہیں دے تو کھپا
بندے کو اللہ سے دے تو ملا

دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ
دین کی تو اصل ہے دنیا کی جڑ

نیکیوں کی تجھ سے ہے قائم اساس
تو نہ ہو تو جائیں نہ نیکی کے پاس

دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو
تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو

خشک تھا بن تیرے درختِ عمل
تو نے لگائے ہیں یہ سب پھول پھل

دل کو لبھاتی ہے کبھی بن کے حور
گاہ دکھاتی ہے شرابِ طہور

نام ہے سدرہ کبھی طوبیٰ ترا
روز نرالا ہے تماشا ترا

کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل
جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال و قیل

روپ ہیں ہر پنتھ میں تیرے الگ
ہے کہیں فردوس کہیں ہے سُرگ

ایک سے ہے ایک انوکھا برن
ہے کہیں محشر کہیں آواگون

ایک ادا میں تیری لاکھوں رشی
کھپ گئے جن کی نہ خبر کچھ ملی

کوہ ہمالہ میں بہت جا گلے
اور تپسیا میں بہت جل بجھے

تیرے تصوّر میں ہزاروں ولی
ڈوبے کچھ ایسے کہ نہ اُچھلے کبھی

پڑھ دیا زاہد پہ کچھ ایسا فسوں
دل کی تپش اُس کی ہے ہر دم فزوں

کر دیا راہب پہ خدا جانے کیا
ہو گیا دنیا سے وہ بیزار سا

جس کو غرض دیکھئے دھن ہے یہی
صوفیِ صافی ہو کہ ہو مولوی

نشۂ امید میں ہیں چور سب
ایک پیالے سے ہیں مخمور سب

جب کہ ہمایوں سے چھٹا ملک و تخت
اور پھنسا بندِ حوادث میں سخت

یار رہا اور نہ کوئی غمگسار
دوست و دشمن کے لگے چلنے وار

پھر گئے دل دادۂ فرماں تھے جو
چھٹ گئے وابستۂ داماں تھے جو

گھر میں نہ رہنے کی ملی کوئی راہ
ملک میں لی غیر کے جا کر پناہ

ہو گئے اغیار یگانے سبھی
تو نے مگر ساتھ نہ چھوڑا کبھی

چھوٹ گئے سارے قریب اور بعید
ایک نہ چھوٹی تو نہ چھوٹی امید

تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت
تیرے ہی صدقے سے ملا تاج و تخت

خاکیوں کی تجھ سے ہے ہمت بلند
تو نہ ہو تو کام ہوں دنیا کے بند

تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں
تو نہ ہو تو ہو ابھی برہم جہاں

کوئی پڑا پھرتا ہے بہرِ معاش
ہے کوئی اکسیر کو کرتا تلاش

ایک تمنا میں ہے اولاد کی
ایک کو دلدار کی ہے لو لگی

ایک کو ہے دھن کہ جو کچھ ہاتھ آئے
دھوم سے اولاد کی شادی رچائے

ایک کو کچھ آج اگر مل گیا
کل کی ہے یہ فکر کہ کھائیں گے کیا

قوم کی بہبود کا بھوکا ہے ایک
جس میں ہو اُن کے لئے انجام نیک

ایک کو ہے تشنگیِ قربِ حق
جس نے کیا دل سے جگر تک ہے شق

جو ہے غرض اس کو نئی جستجو — لاکھ اگر دل ہیں تو لاکھ آرزو
تجھ سے ہیں دل سب کے مگر باغ باغ — گل کوئی ہونے نہیں پاتا چراغ

سب یہ سمجھتے ہیں کہ پائی مراد — کہتی ہے جب تو کہ اب آئی مراد
وعدہ تیرا راست ہو یا ہو دروغ — تو نے دئے ہیں اُسے کیا کیا فروغ

وعدے وفا کرتی ہے گو چند تو — رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو
بھاتی ہے سب کو تیری لیت و لعل — تو نے کہاں سیکھی ہے یہ آج کل

تلخ کو تو چاہے تو شیریں کرے — بزم عزا کو طرب آگیں کرے
آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس — رکھے غنی اُس کو ہے جس کے پاس

یاس کا پاتی ہے جو تو کچھ لگاؤ — سیکڑوں کرتی ہے اُتار اور چڑھاؤ
آنے نہیں دیتی دلوں پر ہراس — ٹوٹنے دیتی نہیں طالب کی آس

جن کو میسّر نہیں کملی پھٹی — خوش ہیں توقّع پہ وہ زربفت کی
چٹنی سے روٹی کا ہے جن کی بناؤ — بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ

پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ ذوق — گھوڑا جو سبزہ ہو تو نیلا ہو طوق
فیض کے کھولے ہیں جہاں تو نے باب — دیکھتے ہیں جھونپڑے محلوں کے خواب

تیرے کرشمے ہیں غضب دل فریب — دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب
تجھ سے مہوّس نے جو شوری لیا — پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا

دل سے بھلایا زن و فرزند کو — لگ گیا گھن نخلِ برومند کو
کھانے سے پینے سے ہوا سرد جی — ایسی کچھ اکسیر کی ہے لو لگی

دین کی ہے فکر نہ دنیا سے کام — دھن ہے یہی رات دن اور صبح و شام

دھونکنی ہے بیٹھ کے جب دھونکتا — شہ کو سمجھتا ہے اک ادنیٰ گدا
پیسے کو جب تاؤ یہ دیتا ہے تاؤ — پوچھتا یاروں سے ہے سونے کا بھاؤ
کہتا ہے جب ہنستے ہیں سب دیکھ کر — رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر
ہے اسی دھندے میں وہ آسودہ حال — تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال
تولے کے گر دیکھیے اس کی خوشی — کوئی خوشی اس کو نہ پہنچے کبھی

پھرتے ہیں محتاج لٹی تیرہ بخت — جن کے بڑوں میں تھا کبھی تاج و تخت
آج جو برتن ہیں تو کل گھر گرو — ملتی ہے مشکل سے انھیں نانِ جو
تیرے سوا خاک نہیں ان کے پاس — ساری خدائی میں ہے لے دے کے آس
چھوڑ لے سماتے نہیں اس آس پر — صاحبِ عالم انھیں کہئے اگر
ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے — حوصلے کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ — عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھائیے — پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
بیٹھنے لگتا ہے دل آوے کی طرح — یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا — اڑتا ہے خاکا کبھی تدبیر کا
ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی — ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی
جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل — کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل
کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں — رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی — ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحتِ جاں کا ہے بھید
چھوڑیو جائی کا نہ ساتھ اے امید

خدا کی صنعت (از مولانا محمد اسمٰعیل صاحب)

جو چیز خدا نے ہے بنائی
اُس میں ظاہر ہے خوش نمائی

کیا خوب ہے رنگ ڈھنگ سب کا
چھوٹی بڑی جس قدر ہیں اشیا

روشن چیزیں بنائیں اُس نے
اچھی شکلیں دکھائیں اُس نے

ہر چیز کی ہے ادا نرالی
حکمت سے نہیں ہے کوئی خالی

ہر چیز ہے ٹھیک ٹھیک لاریب
ہیں اس کے تمام کام بے عیب

ننھی کلیاں چٹک رہی ہیں
چھوٹی چڑیاں پھدک رہی ہیں

اُس کی قدرت سے پھول مہکے
پھولوں پہ پرند آ کے چہکے

چڑیوں کے عجیب پر لگائے
اور پھول ہیں عطر میں بسائے

چڑیوں کی ہے بھانت بھانت آواز
پھولوں کا جدا جدا ہے انداز

محلوں میں امیر ہیں بہ آرام
ہے در پہ پڑا غریب ناکام

ہے کوئی غنی تو کوئی محتاج
بے گھر ہے کوئی کسی کے گھر راج

روزی دونوں کو دی خدا نے
معمور ہیں قدرتی خزانے

تاروں بھری رات کیا بنائی!
دن کو بخشی عجیب صفائی

موتی سے پڑے ہوئے ہیں لاکھوں
ہیرے سے جڑے ہوئے ہیں لاکھوں

کیا دودھ سی چاندنی ہے چٹکی!
حیراں ہو کر نگاہ ٹھٹکی!

تارے رہے صبح تک نہ وہ چاند
آگے سورج کے ہو گئے ماند

نیلا نیلا اب آسماں ہے
وہ رات کی انجمن کہاں ہے

شام آئی تو اس نے پردہ ڈالا
پھر صبح نے کر دیا اُجالا

جاڑا گرمی بہار برسات
ہر رُت میں نیا سماں نئی بات

جاڑے سے بدن ہے تھرتھراتا
ہر شخص ہے دن میں دھوپ کھاتا

سردی سے ہیں ہاتھ پاؤں ٹھٹھرتے
سب لوگ الاؤ پر ہیں گرتے

سرسوں پھولی بسنت آئی
ہولی پھاگن میں رنگ لائی

پھوٹیں نئی کونپلیں شجر میں
اک جوش بھرا ہوا ہے سر میں

جاڑے کی جو رُت پلٹ گئی ہے
دن بڑھ گیا رات گھٹ گئی ہے

گرمی نے زمین کو تپایا
بھانے لگا ہر کسی کو سایہ

برسات میں دَل ہیں بادلوں کے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے

رو آئی ہے زور شور کرتی
دامانِ زمین کو کترتی

کس زور سے بہہ رہا ہے نالا
اونچے ٹیلے کو کاٹ ڈالا

بل کھا کے ندی نکل گئی ہے
رُخ اپنا اُدھر بدل گئی ہے

دریا ہے رواں پہاڑ کے پاس
بستی ہے بسی اُجاڑ کے پاس

بستی کے اِدھر اُدھر ہے جنگل
جنگل ہی میں ہو رہا ہے منگل

مٹّی سے خدا نے باغ اُگائے
باغوں میں اُسی نے پھل لگائے

میووں سے لدی ہوئی ہے ڈالی
دانوں سے بھری ہوئی ہے بالی

سبزے سے ہرا بھرا ہے میداں
اونچے اونچے درخت ذی شاں

ہم کھیلتے ہیں وہاں کبڈّی
میری ہے کوئی کوئی پھسڈّی
گائیں بھینسیں عجب بنائیں
کیا دودھ کی ندیاں بہائیں
پیدا کیے اونٹ بیل گھوڑے
ہر شے کے بنا دیے ہیں جوڑے
روشن آنکھیں بنائیں دو دو
قدرت کی بہار دیکھنے کو
دو ہونٹ دیے کہ منھ سے بولیں
شکر اس کا کریں زبان کھولیں

ہر شے اُس نے بنائی نادر
بے شک ہے خدا قوی و قادر

صبحِ امّید (از مولوی محمد حسین آزاد)

جب کیا صبح نے روشن فلکِ مینائی
بسترِ خواب سے میں لے کے اُٹھا انگڑائی
آنکھیں مل کر جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں
ذرّے ذرّے میں نظر آیا رخِ جانِ جہاں
کام کرتی تھی جہاں تک نگہِ دور انداز
تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمنِ قدرتِ راز
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ
جس پہ ہے فرشِ زمیں گلشنِ گردوں کی شکوہ
برگ برگ اس کا ہے آئینہ لیے پیشِ نظر
جن میں ہیں جلوہ نما دل کی مرادوں کے ثمر
آرزوؤں سے کھلے ہیں گلِ رعنا یکسر
جن سے نکلیں گے ثمرہائے تمنّا یکسر
قلّۂ کوہ کہ تھا چرخِ بریں سے ہم راز
رکھتا تھا طولِ امل سے بھی سوا راہِ دراز
تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اُس کی
اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اُس کی
اس پہ چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے
دم اکھڑتے نہ تھے اور سینے قوی ہوتے تھے
گرچہ تھا پاؤں اُٹھانے کا نہ یارا دل کو
کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو

کہ چڑھائی جو نظر آرہی تھی دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت

جشنِ شاہانہ کا ساماں نظر آتا تھا وہاں
سازِ عشرت کوئی در پردہ بجاتا تھا وہاں

دل اس آواز پہ اس طرح کھنچے جاتے تھے
گویا ذرّے سوئے خورشید اُڑے جاتے تھے

اس طرف میرا دلِ زار بھی یوں آہ چلا
جیسے بلبل سوئے گل کبک سوئے ماہ چلا

کاہ کی طرح سوئے کاہ ربا پہنچا میں
الغرض منزلِ مقصود پہ جا پہنچا میں

دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں
گل خود رو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں

مخملِ سبز سے ہے سبزۂ تر یا انداز
رنگِ گل اس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز

برسرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری
نہر بن بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری

آب یوں سر ہے بدامانِ جبل مار رہا
سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا

سنگِ مرمر کی لبِ آب جو اک سل ہے پڑی
اُس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی

رنگِ رخ کو گل گلزار سے چمکائے ہوئے
بیٹھی اک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے

اُس پہ ہے چتر کی جا سایہ فگن سبز نہال
پھول بر ساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال

نو جوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے
فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے

سر پہ جو اُس کے دھری ہے کلہ تاجوری
ہے بجائے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری

اس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ
کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ

اس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے
ہر دماغ اُس سے نئے ڈھب کا مزا لیتا ہے

رخ جو ہے آئینۂ روئے تمنا اُس کا
شمع ساں چاروں طرف ایک ہے جلوہ اُس کا

اک طرف عقل ہے اک سمت کو تدبیر کھڑی
آگے جامِ مئے غفلت لئے تاثیر کھڑی

دیتی ہر دل پہ ہے وہ نور سے تنویر جدا
کامیابی کی دکھا دیتی ہے تصویر جدا

رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اُس کی
ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارا ہے مجھے
اس کے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے
دم بہ دم ہے جو نسیمِ سحر آتی جاتی
دل نے دربار یہ جس وقت دکھایا مجھ کو
دیر تک دل رہا تصویرِ تہِ آئینہ
غور کی رازِ نہفتہ میں بہت سی میں نے
دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال
دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوش حالی
آؤ تم قیدِ تعلّق سے ہو آزاد بہت
آؤ یاں سایۂ اقبال میں لیویں تم کو
آؤ اس سائے میں تم ابرِ گہربار ہے یہ
اُس کے نغمہ سے جو یہ رازِ پُرافسوں نکلا
آگہ آباد ترے دم سے ہے دائم دنیا
آگہ ہے تیرے ہوا میں دلِ شیدا گلشن
دل کے گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا
کون سا دل ہے کہ جس پر نہ چلے نم تیرا
کون سا باغ ہے جس میں کہ صبا تیری نہیں
کون سا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری

پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر اک سو اُس کی
تڑپ اُٹھتا ہے ہر ایک دل کہ پکارا ہے مجھے
اپنے دامانِ تمنّا کو ہیں پھیلائے ہوئے
بوئے امیّد ہے ایک اک کو سنگھاتی جاتی
اور طلسمات کا عالم نظر آیا مجھ کو
پر جو تہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نا
شجرِ چتر پہ لیکن جو نظر کی میں نے
دونوں پر کھولے ہوئے ہے یہ ہوائے اقبال
آؤ آزاد تمھاری ہی جگہ تھی خالی
اپنی وارستگیِ دل سے ہو تم شاد بہت
لاؤ کیا آرزوئے دل ہے کہ دیویں تم کو
یعنی شہزادیِ امیّد کا دربار ہے یہ
دل سے بے ساختہ یہ مطلعِ موزوں نکلا
اور مثل ہے کہ باامیّد ہے قائم دنیا
لہلہاتے ہیں تری یاد میں کیا کیا گلشن
کون سا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا
کون انسان ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا
کون سا گل ہے لگی تیری ہوا جس کو نہیں
کون سا کوچہ ہے جس میں کہ نہیں راہ تری

تار برقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے   دیکھا جس ملک میں واں سکہ ترا چلتا ہے

عہد آئندہ کا میداں ہے اندھیرا بالکل   غیب نے رنگ سیہ جس پہ ہے پھیرا بالکل
اُس میں ہیں چلتے تری تدبیر کے ہیں تیر سدا   اسی میداں میں ہیں پھرتے ترے نخچیر سدا

ذرے ذرے سے ترے اگتے ہیں اشجار مراد   خاک میں تیری نظر آتے ہیں گلزار مراد
جب ہے کھیتوں میں خزاں آگ لگاتی پھرتی   اور ہوا باغ میں ہے خاک اُڑاتی پھرتی
چشمے خشک اور چمن ہوتے ہیں بے آب پڑے   چاہ بے آب تو ٹوٹے ہوئے دولاب پڑے
پیر دہقاں ہے کہیں بے سر و ساماں بیٹھا   باغباں خاک پہ حیران و پریشاں بیٹھا
ہوتا اُس وقت مصیبت میں نہیں یار کوئی   نہ مددگار کوئی اور نہ غمخوار کوئی
ہاں مگر تو کہ جو اُس وقت میں آجاتی ہے   جلوہ گر باغ مراد اُس کو دکھاتی ہے
ابر تر سامنے آنکھوں کے لے آتی ہے کبھی   پھلے پھولے اُسے اشجار دکھاتی ہے کبھی
کبھی کھیتوں کو ہرا کر کے دکھا دیتی ہے   کر کے خرمن کبھی انبار لگا دیتی ہے
دم بہ دم تازہ فسوں آکے سناتی ہے اُسے   باغ سبز ایسا غرض اپنا دکھاتی ہے اُسے
تھا جو مایوس پڑا سینہ و سر باندھ کے وہ   اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یکبار کمر باندھ کے وہ
دھوپ میں کھاتا ہے بہاتا ہے پسینہ اپنا   کرتا لبریز مرادوں سے ہے سینہ اپنا
ہر مصیبت میں غرض تو ہے سہارا اُس کا   تیری ہی آس پہ ہوتا ہے گذارا اُس کا

اہل ہمت جو ہیں مردان تجارت پیشہ   مشغلہ جن کا سیاحت ہے سفر اندیشہ
کوہ و صحرا میں ہیں وہ زاد سفر باندھے ہوئے   اور چلے جاتے ہیں دن رات کمر باندھے ہوئے
نہ تو پانی کا ہے آرام نہ پانی کا مزا   اُٹھ گیا ان کے نصیبوں سے زمانے کا مزا
ہر قدم پہ بسر راہ خطر ہیں لاکھوں   ایک جوکھوں ہے اگر پاس تو ڈر ہیں لاکھوں

خلشِ خار سے ہے دامنِ دل چاک کبھی
صدمۂ یادِ وطن کرتا ہے غمناک کبھی

دل تو ہے سنگِ مصیبت سے شکستہ اُن کا
اور کسی طرح سے کٹتا نہیں رستہ اُن کا

ہر قدم تو ہے مگر اُن کی کمر باندھ رہی
سمتِ مقصود پہ ہے تارِ نظر باندھ رہی

حسنِ انجام منافع کا دکھاتی ہے کہیں
کرسیاں جاہ و مراتب کی سجاتی ہے کہیں

سامنے جلوۂ اقبال دکھاتی ہے اُنھیں
اور خزانے کہیں پُر مال دکھاتی ہے اُنھیں

کامیابی سے کبھی پھر ہے وطن میں لاتی
آبِ رفتہ کو ہے پھر جوئے چمن میں لاتی

طائرِ دل پرِ پرواز ہیں پھیلائے ہوئے
اور ترا شوق لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

گرم ہوتا سرِ میداں ہے جو بازارِ ستیز
تیغِ خوں بار کہیں اور کہیں خنجرِ خوں ریز

ہوتی حملوں سے دلیروں کے ہے آفت برپا
عرصۂ جنگ میں ہوتی ہے قیامت برپا

نعرۂ توپ سے شیروں کے ہیں منہ مڑ جاتے
بلکہ ہیں گنبدِ نیلی کے دھوئیں اُڑ جاتے

کہیں خنجر کہیں شمشیر نظر آتی ہے
سامنے موت کی تصویر نظر آتی ہے

پر وہیں معرکۂ جنگ میں ہے تو آتی
ہاتھ میں ہے لئے ایک شیشۂ جادو آتی

ایسا مستِ مئے جرأت انھیں کر دیتی ہے
بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے

کہ نشا آنکھوں پہ عینک ہے لگاتا گویا
سیرِ فانوسِ خیالی ہے دکھاتا گویا

دیتی ہے چشمِ تصوّر میں ہر ایک کام دکھا
ہے پھر اُس کام کا دیتی انھیں انجام دکھا

کہ رخِ فتح بھی دیکھتے ہیں گلنار کبھی
زیبِ سر دیکھتے ہیں تاجِ سپہ سالاری

فتح یابی سے کبھی پھیر کے ہے گھر لاتی
پیشِ لشکر ہے یہ سرداریِ لشکر لاتی

شہرتِ عام کے دربار میں لاتی ہے انھیں
فخر و اعزاز کی کرسی پہ بٹھاتی ہے انھیں

نام پر فتح کے نقارے بجا دیتی ہے
شرق سے غرب تلک اک شور مچا دیتی ہے

بہ رحیم فتح کبھی لا کے ہے لہرا دیتی
فتح یابوں کے ہے سر پر اُسے جلوا دیتی
نام اک اک کے نشانوں پر رقم دیکھتے ہیں
اُن کو اس طرح سے شہرت میں علم دیکھتے ہیں
سیکڑوں دور فلک سر پہ گذر جائیں گے
وہ ستارے سے چمکتے ہی نظر آئیں گے

دیکھتی چشمِ تصوّر ہے یہ جب باغِ مراد
اور چمک اُٹھتے ہیں سینوں ہیں جو ہیں داغِ مراد
سر بہ کف برسرِ میداں ہیں دلاور آتے
اہلِ جوہر ہیں دکھلاتے ہوئے جوہر آتے
جامِ دل خونِ شجاعت سے چھلک جاتے ہیں
نعرۂ اہلِ وغا تا بہ فلک جاتے ہیں
آبِ شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں
اور جو مرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں
خوں دلیروں کے ہیں پانی کی طرح بہ جاتے
اور جگر سینوں میں خوں ہو ہو کے ہیں رہ جاتے
گرم ہو جاتا ہے یہ موت کا بازار وہاں
کہ خریدار پہ گرتا ہے خریدار وہاں
جان و تن موت کے منھ کا ہیں نوالا ہوتے
آسماں اور زمیں ہیں تہ و بالا ہوتے
فتح یابی سے بہت چہرے ہیں گلگوں ہوتے
اور بہت تن بسر خاک ہیں پُرخوں ہوتے
اے اُمید ایسے ہزاروں ہیں کرشمے تیرے
یوں ہی بہتے ہیں سدا خون کے چشمے تیرے

ہیں کتب خانۂ ہستی میں بہت صاحبِ علم
اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالبِ علم
سوزِ محنت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے
حسرتوں کے لئے لبریز ہیں سینے اپنے

نہ تو کھانے کا ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال
ذوقِ راحت ہے نہ ہے لطف جوانی کا خیال
ہو گئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح
بلکہ پیوندِ ورق ہیں جزءِ اصلی کی طرح
پھرتے دن بھر ہیں کتابیں لئے سودائی سے
ہاتھ اُٹھا بیٹھے اسی شغل میں بینائی سے
تن کو راحت نہیں اور جان کو آرام نہیں
دن ہو یا رات انھیں محنت کے سوا کام نہیں

روز و شب خونِ جگر اپنا جو کھاتے ہیں وہ — اور کلا بارِ مشقت کے اُٹھاتے ہیں وہ
ان مصائب کی ہے تو ہی انھیں طاقت دیتی — لطفِ انجام سے ہے حسنِ لیاقت دیتی
دیدۂ دل میں لگا دیتی ہے سرمے کیا کیا — دیتی ہے شاہدِ مقصود کو جلوے کیا کیا
اہلِ تصنیف کو ہے عمرِ دوامی دیتی — بادۂ شوق سے ہے عیشِ مدامی دیتی
سطحِ کاغذ پہ تو اک باغ کھلا دیتی ہے — برگ و بار اس میں مرادوں کے لگا دیتی ہے
عوضِ آب ہے دیتی اُسے تو آبِ حیات — اور دکھا دیتی ہے اس طرح سے شادابِ حیات
شہرہ گلزارِ زمانہ میں رہے عام ان کا — تیّے تیّے پہ سدا نقش رہے نام ان کا
کبھی طیّار لیاقت کے ہے تمغے کرتی — کہیں ایم۔ اے ہے بناتی کہیں بی۔ اے کرتی
بر سرِ کرسیِ دربار بٹھاتی ہے انھیں — خلعتِ بوقلموں لا کے پنھاتی ہے انھیں
بزم کو جلوۂ رنگیں ہے دکھاتی اُن کے — اس طرح فخر سے دامن ہے اڑاتی ان کے
ہو گئے شاداب ہیں دل ہائے فسردہ اُن سے — تازہ دم ہوتے ہیں سب کے دلِ مردہ اُن سے
کلفتِ محنت و آفت سے ہیں سب جی جاتے — زہر کے گھونٹ ہیں شربت کی طرح پی جاتے

اک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا — دشتِ پُرخار میں ہے بے سر و ساماں جاتا
نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لیے — اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ اُٹھانے کے لئے
اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اُسے — رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اُسے
تپشِ راہ سے جلتا ہے جگر سینے میں — بجھ کے رہ جاتا ہے دل مثلِ شرر سینے میں
دفعۃً آبِ رواں دور نظر آتا ہے — اور وہ اس لطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے
کہ دلِ سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا — اور خوشی سے تنِ بے دم میں ہے دم آ جاتا
دل جو تھا لوٹ رہا سینہ میں بے آبی سے — جاتا ہے بے سر و پا دوڑتا بے تابی سے

جامِ ہمت جو اُسے تو نے ہیں پلوائے ہوئے — کوسوں اک دم میں لئے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے
نورِ ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی — اتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

یاس اُس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے — دلِ مایوس کو جب اُس کے یقیں آجائے
کہ جسے آب سمجھتا تھا نہیں آب ہے یہ — سرِ دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ
یہ سمجھتے ہی اندھیرا ہو جہاں آنکھوں میں — ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں
دل میں ہمت نہ رہی جسم میں حالت نہ رہی — صورتِ نقشِ قدم ہلنے کی طاقت نہ رہی
جان پانی میں ہو اٹکی ہوئی دم سینے میں — وہ بھی پر ضعف سے اگر رہے تھم سینے میں
اس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تو — سرِ بالیں وہ مسافر کوئی لاتی ہے تو
حضرتِ خضر کی ہے راہ دکھاتا آتا — ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آتا
اُس کے آجانے سے ہوتی ہے نجات اُس کے لئے — ہوتا ہے قطرۂ آب آبِ حیات اُس کے لئے

کرتے زاہد جو خدا کی ہیں عبادت دن رات — ترکِ دنیا سے ہیں سرگرمِ ریاضت دن رات
ذکرِ فردوس ہیں تو نے انھیں سنوائے ہوئے — لطف ہر دم ہیں وہی ہشت نظر آئے ہوئے
رندِ آزاد جو ہر دم ہے گرفتارِ گناہ — بارِ عصیاں سے ہے بیچارہ گراں بارِ گناہ
نہیں بجز رحمتِ حق کوئی سہارا اُس کا — تیری ہی چشمِ کرم پر ہے گزارا اُس کا
تو نہ ہو وے تو تڑپ کر دلِ مضطر رہ جائے — وہ گنہگار تو غم سے ابھی مر کر رہ جائے
رکھتے ہیں شعر و سخن سے جو سروکار سدا — کارِ اربابِ جہاں سے ہیں وہ بیزار سدا
ہے شبِ تار تو سونے سے انھیں کام نہیں — دن کو جز فکرِ مضامیں کبھی آرام نہیں
لوگ آرام سے ہیں رات کو سویا کرتے — اور یہ بیٹھے دُرِ مضموں ہیں پرویا کرتے
یہ جو ہر لطف سے ہیں ہاتھ اٹھائے بیٹھے — یا کہ دیوانوں کی صورت ہیں بنائے بیٹھے

باغ سبز اپنے تو ہر لحظہ دکھاتی ہے انھیں
مژدۂ خلعت و انعام سناتی ہے انھیں

اُنھیں مطلب نہیں پر اور کسی بات سے ہے
ہاں غرض ہے تو فقط اتنی تری ذات سے ہے

کہ جو آہ اُن کے دلِ سوختہ جاں سے نکلے
یا کوئی نالۂ موزوں کہ زباں سے نکلے

اثرِ درد سے ناخن پہ جگر ہووے سدا
اور جگر درد سے لبریز اثر ہووے سدا

ہووے اس پر بھی جو آشوبِ جہاں حد سے زیاد
قولِ آزاد سے کرتی ہے اُنھیں یوں ارشاد

کہ سخن فہم تہِ چرخ بریں ہوویں گے
خوردہ ہیں ہیں تو سخن داں بھی یہیں ہوویں گے

داد مل جائے گی جب اور کوئی دیکھے گا
آج دیکھا نہ کسی نے تو کبھی دیکھے گا

ترکیب بند (حالی)

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا

تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا

یہ دیا بہتر ہے اُن جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہے جن کی سدا

گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا

سُرخ رو دریا میں وہ حاجت روا مینار ہیں
روشنی سے جن کے ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

ہم نے ان عالی بناؤں سے کیا اکثر سوال
آشکارا جن سے اُن کے بانیوں کا ہے جلال

شان و شوکت کی تمھاری دھوم ہے آفاق میں
دور سے آ آ کے تم کو دیکھتے ہیں با کمال

قوم کو اس شان و شوکت سے تمھاری کیا ملا
دو جواب اس کا اگر رکھتے ہو یارائے مقال

سرنگوں ہو کر وہ سب بولیں زبانِ حال سے
ہو سکا ہم سے نہ کچھ الانفعال الانفعال

بانیوں نے تھا بنایا اس لئے گویا ہمیں
ہم کو جب دیکھیں خلفِ اسلاف کو رویا کریں

شوق سے اس نے بنایا مقبرہ اک شاندار
اور چھوڑا اس نے اک ایوان عالی یادگار

ایک نے دنیا کے پودے باغ میں اپنے لگائے
ایک نے چھوڑے دفینے سیم و زر کے بے شمار

اک محبت قوم نے اپنے مبارک ہاتھ سے
قوم کی تعلیم کی بنیاد ڈالی استوار

ہوگی عالم میں کہو سرسبز یہ پچھلی مراد ؟
یا وہ اگلوں کی امیدیں لائیں گی کچھ برگ و بار؟

چشمہ سرجیون ہے جو بہتا رہے گا یاں وہی
سب اتر جائیں گی چڑھ کر ندیاں برسات کی

دور سے امید نے جھلکی سی اک دکھلائی ہے
ایک کشتی ڈوبتے بیڑے کو لینے آئی ہے

قوم کے پیر و جواں سب ہو گئے تھے مردہ دل
دردمندی جوش میں چند اہلِ دل کو لائی ہے

پاؤ گے تاریخ میں ہرگز نہ تم اس کی مثال
سلطنت نے قوم کی جو یاں مدد فرمائی ہے

غیر قوموں نے بھی کی ہے شرطِ ہمدردی ادا
یہ بنا چلتی ہوا تک کو بھی دل سے بھائی ہے

آؤ ہم بھی اے عزیزو مغتنم سمجھیں اسے
اک ضروری کام اپنا کم سے کم سمجھیں اسے

یہ مبارک گھر نزولِ خیر و برکت ہے جہاں
جس کی پیشانی سے ظاہر ہیں سعادت کے نشاں

یہ نہالِ تازہ جس کو اک زمینِ شور میں
خرم و سرسبز کرنا چاہتے ہیں باغباں

یہ مسیحائی علاج اس دردِ بے درماں کا
لادوا ٹھہرا چکے جس کو اطبائے زماں

یہ نمونہ اس عزیزِ مصر کا جس نے ستم
جن کے ہاتھوں سے سہے دی قحط سے ان کو اماں

عہد و پیماں اے عزیزو تم سے کچھ لینے کو ہے
قوم کو پھر برکتیں بے انتہا دینے کو ہے

آرہی ہے اُس مکاں کے گوشے گوشے سے صدا | قوم اگر سمجھے تو ہاں ہوں میں قوم کا حاجت روا
ہے کوئی اکسیر دنیا میں تو ہاں ہوں اکسیر میں | اور اصل کیمیا کچھ ہے تو میں ہوں کیمیا
ہاتھ آجاتا سکندر کو اگر میرا سراغ | چھوڑ دیتا جستجوئے چشمۂ آبِ بقا
میرے جو حامی ہیں اُن کی یوں پھلیں گی کوششیں | ایک دانے سے ہوں خوشے جس طرح بے انتہا

ہے عبث گر قوم نے بے وقت پہچانا مجھے
برکتیں اُن پر جنھوں نے وقت پر جانا مجھے

اُن سے کہہ دو قوم میں ہیں جو کہ عالی خاندان | یا جنھیں جاگیر و منصب پر ہے نازِ بے گراں
کیا لئے بیٹھے ہو فخرِ منصب جاگیر کو | منصب و جاگیر ہیں سب کوئی دن کے مہماں
تم نہیں رتبے میں بڑھ کر تغلق و تیمور سے | تنگ ہے آج اُن کی نسلوں پر زمین و آسماں
چھوڑ جاؤ واسطے اولاد کے کوئی سپر | ورنہ وار اپنا کرے گی گردشِ دورِ زماں

آؤ باندھو عہد مجھ سے اور میرا ساتھ دو
میرا سودا نقد ہے اس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو

میں تمھیں پستی سے پہنچاؤں گا تا اوجِ کمال | میں تمھیں دیکھوں گا جب گرتا ہوا لوں گا سنبھال
میں بناؤں گا تمھارے کام سب بگڑے ہوئے | میں سمجھاؤں گا زمانے کی تمھیں سب چال ڈھال
جو کریں گے آج میری دست و بازو سے مدد | میں صدا کرتا رہوں گا ان کی نسلوں کو نہال
قوم کا حامی ہوں اور اسلام کا یاور ہوں میں | لوگ دار الکفر سمجھیں مجھ کو یا دار الضلال

میں دکھادوں گا کہ جو دشمن تھے میرے نام کے

تھے حقیقت میں وہ دشمن قوم اور اسلام کے

ملک میں عزت سے رہنا میں سکھاؤں گا تمہیں
سلطنت کا معتمد بننا بتاؤں گا تمہیں

قابلیت تم میں بڑھنے کی ہے دیکھوں کس قدر
بڑھ سکو گے جس قدر اتنا بڑھاؤں گا تمہیں

تب یہ سمجھو گے کہ ہم سوتے تھے کب کے بے خبر
دفعتہ جب خواب غفلت سے جگاؤں گا تمہیں

یاد ہو گا تم کو وہ کھویا ہوا اپنا خطاب
پھر مخاطب "خیر امتہ" کا بناؤں گا تمہیں

مجھ کو دیکھو گر مرے دعووں میں ہو کچھ اشتباہ
روز روشن آپ اپنی روشنی پر ہے گواہ

بارک اللہ اے ریاض علم اے عین الحیات
ہے ہمارے تخت و دولت کی عناں اب تیرے ہات

ہو تو ہو اب روشنی تیری دلیل کارواں
چار سو کالی گھٹا چھائی ہے اور کالی ہے رات

قوم سے تو بھی یوں ہی جہل اور تعصب کو مٹا
جس طرح دین حنیفی سے مٹے لات و منات

چھوڑ جائیں گے جہاں ہیں جو کہ تجھ جیسے نشاں
چھوڑ جائیں گے وہی کچھ باقیات الصالحات

ایک باہمت جماعت جب سے تیرے ساتھ ہے
ہم سمجھتے ہیں ترے سر پر خدا کا ہاتھ ہے

تو سدا آباد رہ اے قوم کی امید گاہ
اے یگانوں اور بیگانوں کے یکساں خیر خواہ

دیکھتے ہیں غیر حیرت اور تعجب سے تجھے
قوم نے اب بھی اگر سمجھا نہ تجھ کو آہ! آہ

اپنے حامی آپ پیدا کر کہ تو وہ سر بلند
اپنی اونچی سے ہے آپ اپنے لئے پشت و پناہ

تیری امید رکھنی ہے عبث اس قوم سے
آپ کو جس نے کیا ہو اپنے ہاتھوں سے تباہ

چارہ آخر کچھ نہیں حالی بجز صبر و سکوں
کر دعا اہد قومی انہم لا یعلمون

خدا کی شان (حالی)

اے زمین آسماں کے مالک
ساری دنیا جہان کے مالک

تیرے قبضے میں سب خدائی ہے
تیرے ہی واسطے بڑائی ہے

تو ہی ہے سب کا پالنے والا
کام سب کے نکالنے والا

بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے
پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے

آنکھ دی تو نے دیکھنے کے لئے
کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیے

بات کے سننے کو دیئے دو کان
بات کہنے کو تو نے بخشی زبان

دن بنایا کمائی کرنے کو
رات دی تو نے نیند بھرنے کو

آئی موسم سے تنگ جب خلقت
تو نے موسم کی دی بدل صورت

گرمیاں ہو گئیں اجیرن جب
تو نے برسات بھیج دی یا رب

سب کے گرمی سے تھے خطا اوسان
مینھ برسنے سے آئی جان میں جان

گئے جب مینھ سے لوگ سب گھبرا
حکم سے تیرے جب پڑی پچھوا

یا تو تھیں ساری چیزیں سیل رہیں
یا رہا سیل کا نہ نام کہیں

جاڑا آ پہنچا اور گئی برسات
دم کے دم میں پلٹ گئے دن رات

پھر لگی پڑنے جب بہت سردی
مشکل آسان تو نے پھر کر دی

جاڑا آخر ہوا اور آئی بہار
جنگل اور ٹیلے ہو گئے گلزار

تو یونہیں رت پہ رت بدلتا رہا
یونہیں دنیا کا کام چلتا رہا

کیں سدا تو نے مشکلیں آسان
تیری مشکل کشائی کے قربان

مرغی اور اس کے بچے (حالی)

شام ہے اور اندھیرے کا وقت — ہے پرندوں کے بسیرے کا وقت
اب ہے پانی کی نہ دانے کی تلاش — جس کو ہے اپنے ٹھکانے کی تلاش
رات بھر جب کہ گزر جائے گی — اور اُجالے کی گھڑی آئے گی
سُنو تم اُٹھ کے سویرے سے ذرا — یہ جو ہے گھر میں تمہارے مرغا
پھڑپھڑاتا ہے پر و بال کو گیا — جھاڑ دیتا ہے وہ سستی گویا
اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں — چیختا زور سے ہے "ککڑوں کوں"

دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی — فوج بچوں کی لئے نکلے گی
تا کہ وہ صبح کا کھائیں کھانا — رات بھر کے ہیں بے آب و دانا
چونچ سے دے گی وہ منہ میں اُن کے — جو پڑے پائے گی دانے تنکے
ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو دانہ — ہے غذا اُن کی یہی روزانہ

مینہ برستا ہے تو بچے سارے — آ دُبکتے ہیں پروں میں ماں کے
چین سے اُن میں چھپے رہتے ہیں — ماں کی چھاتی سے لگے رہتے ہیں
مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی — کرتی ہے شام و سحر رکھوالی
بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا — ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

سیرِ دیرہ دول (چکبست)

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون
عجیب خطّۂ دلکش ہے شہر دیرہ دول

نگاہِ شوق نے کیا کہیے کیا سماں دیکھا
نئی زمین نیا رنگِ آسماں دیکھا

سنا جو کرتے تھے وہ باغ پرفضا ہے یہی
اگر پہاڑ ہیں جنّت تو راستہ ہے یہی

ازل میں تھی جو فضا اس کا یادگار ہے یہ
نشیبِ کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ

کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے
یہ سبزہ زار سجایا ہے دستِ قدرت نے

سپرد ابر کے ہے انتظام پانی کا
ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اُٹھے اُس طرف ہے ہریالی

لباس پہنے ہیں گل خشت و سنگ سبزے کا
بجائے خاک کے اُڑتا ہے رنگ سبزے کا

اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن میں
پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن میں

گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب

کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں

طلسمِ حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں جو آکے مسافر مقام کرتے ہیں
یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

جو دور جائیے بستی سے اور ہی ہے سماں
یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں

بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا
یہ بل زمین کی تیوری پہ آگیا کیسا

بلندیوں سے جو ہو مائلِ نشیب نظر
فریب دیتا ہے ندّی کا پیچ و خم اکثر

نگہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

قریب ہوتا ہے آخر یہ دور کا عالم
فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے
بس ایک عالمِ ہو چار سمت طاری ہے
اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دل گیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں
وہی سُنے گا اسے دل گداز ہے جس کا
یہ راگ مجھ میں سمایا سرور سے ہو کر
حریمِ خاص میں قدرت کی باریابی تھی
نشستِ سنگ پہ تھی سایۂ شجر کے تلے
شریکِ حال تھی وضعِ قدیمِ قدرت کی
شرابِ اُنسِ حقیقی سے تھا ہر اک سرشار
درخت و کوہ ہیں کیا ذاتِ پاکِ انساں کیا
یہ موجِ ہستیِ بیدار کے عناصر ہیں
یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے ان میں غیر نہیں
انھیں سے نغمۂ قدرت ہے اوج و پستی میں
جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنی راز نہیں
ہے جسمِ خاک یہاں اس کا جسم پانی ہے
اسی خیال میں طبعِ لطیف تھی سرشار
دل اپنے رنگ میں بے تاب تھا اس ارماں سے

نگاہ دیکھتی ہے پھر سرور کا عالم
بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے
نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے
شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ حرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا
ہوس تھی روح کو مل جائے اس میں نے ہو کر
نگاہِ شوق میں اک شانِ بے حجابی تھی
رواں تھا چشمۂ آبِ خنک نظر کے تلے
عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی
شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مُشتِ غبار
طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا
سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں
سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں
سب ایک ساز کے پردے ہیں بزمِ ہستی میں
کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں
جو روح ہم میں ہے اس میں وہی روانی ہے
کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش اس پہ نثار
کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زنداں سے

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے ‌ ‌ بنے مزار کسی آبشار کے نیچے
غرض کہ روح کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھا ‌ ‌ ازل کے دن جو چھٹا تھا وہ آشیاں دیکھا
نیا سرور میسّر ہوا سفر کر کے ‌ ‌ مگر نہ سیرِ چمن کر سکے نظر بھر کے
نصیب دل کو رہا ایسے میزباں سے نیاز ‌ ‌ کہ جس کی ذات پہ ہے خاکِ دیرہ دوں کو ناز
وہ ذات کیا ہے کہ تصویر ہے حمیّت کی
اسی سے شرح ہوئی لفظِ آدمیّت کی

ایک یا ہر ایک (از سید احمد حسین امجد حیدرآبادی)

کبھی نقش دل پر ہے شام و سحر کا ‌ ‌ کبھی ہے اثر ہم پہ شمس و قمر کا
ہر اک چیز رکھتی ہے پہلو اثر کا ‌ ‌ ہر اک سے تعلّق ہے نفع و ضرر کا
بہت سے بُروں سے تو اک نیک اچھا
کہو ایک اچھا کہ ہر ایک اچھا؟

کوئی خود پرستی میں سرشار نکلا ‌ ‌ کوئی فانیوں کا طرفدار نکلا
ہر اک اپنی دُھن کا پرستار نکلا ‌ ‌ ہر اک دل، ہر اک کا گرفتار نکلا
بہت سے بُروں سے تو اک نیک اچھا
کہو ایک اچھا کہ ہر ایک اچھا؟

کبھی زندوں سے طالبِ مدّعا ہیں ‌ ‌ کبھی مُردوں پر جان و دل سے فدا ہیں
اگرچہ کہ بالقول عبدِ خدا ہیں ‌ ‌ مگر فعل سے شرک میں مبتلا ہیں

بہت سے بروں سے تو اک نیک اچھا
کہو ایک اچھا کہ ہر ایک اچھا؟

امیروں کو حاجت روا مانتے ہیں
انھیں مستحق ثنا مانتے ہیں
حقیقت میں زر کو خدا مانتے ہیں
اگر کچھ کہو تو بُرا مانتے ہیں

بہت سے بروں سے تو اک نیک اچھا
کہو ایک اچھا کہ ہر ایک اچھا؟

کبھی حاکموں کی ہے دربار داری
کبھی اہلِ دولت کی خدمت گزاری
عجب بیسواسی ہے حالت ہماری
کبھی اس سے یاری کبھی اُس سے یاری

بہت سے بروں سے تو اک نیک اچھا
کہو ایک اچھا کہ ہر ایک اچھا؟

ہر اک شخص کا دم کہاں تک بھروگے
ہر اک ذرّے ذرّے سے کب تک ڈروگے
ہر اک چیز پر تم کہاں تک مروگے
کہاں تک زمانے کی پوجا کروگے

بہت سے بروں سے تو اک نیک اچھا
کہو ایک اچھا کہ ہر ایک اچھا؟

بھرے گا نہ یہ کاسۂ بے حیائی
جہاں بھر سے ممکن نہیں آشنائی
ہے منظور اگر اپنی مشکل کشائی
کسی ایک کے ہو رہو میرے بھائی

بہت سے بروں سے تو اک نیک اچھا
کہو ایک اچھا کہ ہر ایک اچھا؟

ہوا پر جاؤ گے گنبد کہاں تک
تذبذب کا یہ جزر اور مد کہاں تک

کروگے ہر اک کی خوشامد کہاں تک   سر اپنا جھکاؤ گے امجد کہاں تک

بہت سے بروں سے تو اک نیک اچھا
کہو ایک اچھا کہ ہر ایک اچھا؟

دامنِ کوہ (غلام ربانی عزیز)

کوہ کے دامن میں تھا اک روز میں محوِ خرام   کائناتِ دل ہوائے دہر سے بے اضطراب
فطرتِ زرکار کی نیرنگیاں تھیں جلوہ زا   تھا چراغِ لالہ روشن اور نرگس محوِ خواب
شاخِ گلبن پر وہ دُرِ دیدہ نگاہِ چشمِ گل   ایسی تھی جیسے نکل آئے چمن میں ماہتاب
آبشاریں اس طرح وادی میں تھیں نظارہ سوز   جیسے پانی ہو کے بہہ جائے شعاعِ آفتاب
قطرۂ شبنم درخشاں اس طرح تھے پھول پر   جس طرح تاریکیٔ شب میں چمکتا ہے شہاب
برق تھی وقفِ روانی موج کے گہوارے میں   کس قیامت کا سماں تھا یہ طلسمِ سیم و آب
یاسمن، ریحان و سوسن، ارغواں اور موتیا   یہ تھے وانِ دیوانِ فطرت کے نظر افروز باب

دامنِ کہسار کا منظر تھا اتنا دل فریب
دردِ دل نظارگی نے صبر ماندہ نے شکیب

عروسِ سحر (حافظ غازی پوری)

بہارِ سبزہ زار میں   نشاطِ مے گسار میں
ہجومِ برگ و بار میں   غنائے آبشار میں
سرور میں خمار میں   خیالِ کیف بار میں

فضائے کوہسار میں　　گلوں کے ہر قطار میں
ضیائے مستعار میں　　قلوبِ داغ دار میں

چمک تھی ایک نور کی
حریفِ برقِ طور کی

شعاع تھی وہ نور کی　　کہ داستاں غرور کی
تجلیاں تھیں ہر طرف　　"عروسِ ناصبور" کی
وہ نکہتِ گلاب میں　　شمیمِ زلفِ حور کی
نسیم خوش خرام میں　　خبر تھی دور دور کی
مچل رہی تھیں لذتیں　　سرور میں سرور کی

شباب پر بہار تھی
کہ چشمِ مے گسار تھی

وہ مستیِ بہار تھی　　کہ لغزشِ خمار تھی
گلوں پہ بلبلِ چمن　　نظیرِ بادہ خوار تھی
شفق کی "سرخیٔ نمو"　　انیسِ لالہ زار تھی
چمن کی سرد تر ہوا　　محیط و کیف بار تھی
وہ صبح کی گھڑی تھی کب　　"عروسِ تاج دار تھی

پیامِ زندگی تھی وہ
کہ نورِ سرمدی تھی وہ

حسین عاشقِ سحر　　یکایک آ گئی نظر

رباب ہاتھ میں لئے   خموشیوں کی پردہ در
تفننِ لطیف سے   تھی ہوشیار و باخبر
نمودِ حسن میں نہاں   فروغِ برقِ فتنہ گر
غرور و تمکنت سے تھی   شباب سے نڈر مگر

تکلم شباب تھی
تبسم حجاب تھی

وہ زلف پُر غرور تھی   کہ دامگاہِ شور تھی
جبیں تھی وہ عرق عرق   کہ صبحِ ناصبور تھی
وہ چشم وحشت آشنا   کہ پیکِ نزد و دور تھی
وہ غم فروش تھی ادا   کہ مژدۂ سرور تھی
وہ سادگی لباس میں   کہ فطرتِ غیور تھی

شباب بے نقاب تھا
نقاب میں شباب تھا

وہ خالِ کفر دل رُبا   کہ نقطۂ خدا نما
وہ بادہ ریز آنکھیں تھیں   کہ بجلیاں تھیں برملا
وہ عارضِ صبیح تھے   کہ وجہِ جوشِ مدعا
وہ گل فروش لب تھے یا   کہ مرکزِ نشاط زا
وہ تنگنائیِ دہن   کہ بابِ گوہرِ صفا

وہ گردنِ بلور تھی
کہ منبعِ غرور تھی

وہ خندۂ ارم نما — وہ جلوۂ صنم نما
وہ نازِ مستیٔ نظر — وہ غمزۂ عدم نما
وہ جوششِ ادا طلب — وہ عشوۂ الم نما
وہ فتنۂ سبک روی — وہ جادۂ ستم نما
وہ تمکنت شباب کی — وہ ظلم بھی کرم نما

وہ شورشِ خموش تھی
مگر نمودِ دوش تھی

وہ گرم جوشیٔ جہاں — وہ رنگ و بوئے گلستاں
وہ نغمہ ہائے شوق تھے — کہ حسن کی تھی داستاں
تڑپ وہ انگلیوں میں تھی — چمک رہی تھیں بجلیاں
ابل رہی تھی کیفیت — مچل رہی تھیں مستیاں
وہ آہوئے رمیدہ تھی — کہ حسن سے تھی بدگماں

ہزار پردہ پوش تھی
مگر ادا فروش تھی

بہارِ عمر دوش تھی — خمارِ کیف ہوش تھی
قدم میں لغزشیں نہ تھیں — اگرچہ بادہ نوش تھی
ربابِ حسن صوت سے — اسیرِ جذبِ جوش تھی

تلاطمِ حیات میں — وہ فتنۂ خموش تھی
مگر فراق و ہجر سے — وہ دردو غم فروش تھی

وہ حسنِ پُر بہار تھی
سعید و کامگار تھی

عروسِ بے رفیق تھی — انیسِ درد و ضیق تھی
محیطِ بحرِ لطف میں — شناور و غریق تھی
شکستگیِ دل کی وہ — انیس تھی شفیق تھی
ہجومِ لالہ زار میں — وہ پیکرِ عقیق تھی
مگر نگاہِ غور میں — وہ نکتۂ دقیق تھی

صبوحیوں کی لہریں
عیاں ہوئی تھی دہر میں

جو گا کے کچھ ٹھہر گئی — تو لذّتِ سحر گئی
اٹھی کسک سی دل میں پھر — چمک کے تا جگر گئی
کچھ اشک سرخ ہو چلے — شفق بہ جیب نظر گئی
وہ زلفِ عنبریں غضب — بکھر کے تا کمر گئی
وہ تھرتھرا کے گر پڑی — کہ جان سے گزر گئی

وہ دورِ عیش مٹ گیا
کہ وقت ہی پلٹ گیا

یہ انقلابِ دہر ہے — کہ صد بلائے قہر ہے

حیات کی ہے کشمکش — کہ بحرِ غم کی لہر ہے
ثبات کی بھی چاشنی — اثر میں خاص زہر ہے
تباہ بھی وہ ہو گیا — بسا جو آج شہر ہے
وجودِ حافظِ حزیں — حبابِ موجِ نہر ہے
اٹھو اٹھو کہ سو چکے
عزیز عمر کھو چکے

عروسِ برشگال (از حافظ غازی پوری)

موسمِ گرما سے لب پر جان تھی آئی ہوئی — روئے عالم پر تھی بے ڈھب مردنی چھائی ہوئی
روحِ انسانی پر آفت اس کی تھی لائی ہوئی — آسماں پر ہر نظر پڑتی تھی للچائی ہوئی
اضطراب انگیز دنیا کی ہر اک تصویر تھی
ذرّے ذرّے میں جہاں کے خواہشِ تفسیر تھی
ناگہاں دیکھا گیا ابرِ سیہ آتا ہوا — اس طرح دوشِ صبا پر پیچ و خم کھاتا ہوا
جس طرح اٹھے کوئی بالوں کو بکھراتا ہوا — آمدِ فصلِ بہاری کی خبر گاتا ہوا
گوہرِ ابرِ کرم ہر سمت بکھرانے لگا
موتیوں سے دامنِ امّید بھر جانے لگا
چشمکِ برقِ جہندہ باعثِ فرحت ہوئی — لرزشِ موجِ نسیمِ صبح سے ہمّت ہوئی
تشنگی کی شدّتوں سے حلق کو فرصت ہوئی — پھر شگفتہ پیکرِ عالم کی ہر صورت ہوئی

آ، بلائیں تیری لے لوں اے عروسِ برشگال
اپنی آنکھوں میں جگہ دوں اے عروسِ برشگال

مرحبا اے نازنیں ناظورۂ سحر آفریں   اُف تری شوخی ترے نقش و نگارِ دلنشیں !!
یہ نگاہِ مست تیری اور چشمِ سرگیں   دوش نازک پر ترے بکھری ہے زلفِ عنبریں

ہے ترے دامن میں پنہاں ایک لیلائے بہار
صورتِ مجنوں نہ کیوں عالم ہو شیدائے بہار

پھر نسیمِ صبح کے دامن کو اک جنبش ہوئی   شاخسارِ یاسمیں کو پھر ذرا لرزش ہوئی
لالۂ مے گوں کے قدموں کو بھی لغزش ہوئی   پھول برسے کھل گئیں کلیاں عجب بخشش ہوئی

چشمِ نرگس وا ہوئی تیرے ہی جلوؤں کے لئے
کھل گئی منقارِ بلبل تیرے نغموں کے لئے

آسماں پر اب نظر آتے ہیں بادل دل کے دل   ہیں نشاط آسودہ سارے دشت و کہسار و جبل
کھل گئے افسردہ دل بھی اس طرح جیسے کنول   مے کدے میں ہو گئے میکش صراحی در بغل

ہر طرف سے پھر پپیہوں کی صدا آنے لگی
"پی کہاں" کے بھیس میں بانگِ درا آنے لگی

اودی اودی سی گھٹاؤں کا جو ہے آنچل کہیں   تو کہیں بکھرا رہی ہے زلف کوئی نازنیں
ابر میں بجلی چمکتی ہے سرِ چرخِ بریں   آ رہی ہے جھینگروں کی بھی صدائے دلنشیں

سارے دریا ہو چکے سرمستِ ریحانِ شباب
یعنی ہے سیلِ رواں میں جوشِ طوفانِ شباب

آبشاروں کے کنارے پر ہے بگلوں کی قطار   مرغِ آبی کی جھیل پر یہاں ہاؤ ہو ہے شثار

نغمۂ فطرت سے ہیں لبریز سارے کوہسار — جس طرف دیکھو پڑے ہیں سیکڑوں پھولوں کے ہار
حسن کی نیرنگیاں اب عشق کے دامن میں ہیں
وصل کی "سرشاریاں" اب دامنِ گلشن میں ہیں

جاذبِ نظارہ ہے کیا قوس کی رنگیں کماں — سرخوشِ کیفِ ترنّم ہیں طیورِ خوش بیاں
پھول سے معشوق ہیں زینت دہِ باغِ جہاں — اپنے جامے میں سماتا ہی نہیں ہے باغباں
باصرہ افروز ہیں نیرنگیاں برسات کی
سلسبیلِ گوش ہیں موسیقیاں برسات کی

پھر لبِ غنچے پہ لرزاں ہے شمیمِ جاں فزا — باندھتا پھرتا ہے رنگِ گل چمن میں اب ہوا
نغمۂ آبی سے ہے گونجی ہوئی ساری فضا — آرہی ہے آبشاروں سے ترنم کی صدا
بادۂ خوش کیف سے لبریز ہے جامِ بہار
مُردہ دل بھی جی اُٹھے سُن سُن کے پیغامِ بہار

رات کو جگنو کی تابش، جیسے آوارہ کرن — ہائے یہ افشاں کا عالم، اُف یہ زلفِ پُرشکن
ہے بجا پُرنور تاروں کی فلک پر انجمن — کہ جھلکی لیلائے شب زرّیں قبا پھر زیبِ تن
چرخِ نیلی کی جبیں پھر نور افشاں ہو گئی
سیلِ انجم میں شبِ دیجور پنہاں ہو گئی

چشمۂ دریا کے ہاتھوں میں چھلکتا جام ہے — تشنہ کامانِ ارادت کے لئے پیغام ہے
پینے والے خوش ہیں، جاری آج فیضِ عام ہے — انتظارِ روزِ فردا اک خیالِ خام ہے
ابتدائے رنگ و بُو کی انتہا ہونے کو ہے
لمحہ لمحہ میری ہستی کا فنا ہونے کو ہے

حافظِ خستہ جگر "ماضی" پہ رکھ اپنی نظر
حال کی رنگینیوں کو رہینِ مستقبل نہ کر
آنے والا رنگ ہے اک حرفِ مشروطی "اگر"
نقطۂ موہوم پر ہوگا ترا کب تک گزر

کُلُّ شَیٍٔ ھَالِکٌ اک آخری پیغام ہے
عالمِ ایجاد کا انجام، کیا انجام ہے

جلوۂ سحر (سید شاہ ولی الرحمٰن ولی)

خاموش فضا میں وقتِ سحر جذبات کا دریا جاری ہے
اک کیف کا طوفاں اُمڈا ہے اک وجد کا عالم طاری ہے
وہ چاک ہُوا دامانِ سحر، وہ ظلمتِ شب کافور ہوئی
عالم عالم پر نور ہوا، دنیا دنیا مسرور ہوئی
وہ کرنیں نور کی نکلی ہیں، خورشید کے زرّیں ساغر سے
وہ بادۂ سُرخ چھلکتا ہے، ہر پھول کے رنگیں ساغر سے
وہ بادِ صبا مستانہ چلی وہ پتلی شاخیں ہلنے لگیں
وہ پتّے آ گئے جنبش میں، وہ نازک کلیاں کھلنے لگیں
خاموشیٔ شب تحلیل ہوئی، چڑیوں کی ترنّم ریزی میں
شبنم کی نظر افروزی میں، پھولوں کی شمیم انگیزی میں
ہر شاخ میں رنگا رنگی ہے، ہر پھول میں بو قلمونی ہے
ہے ایک تناسب ہر شے میں ہر چیز میں ایک موزونی ہے
ہے جنّتِ گوش اک اک نغمہ ہر منظر ہے فردوسِ نظر

پہلو میں ہو دل گھنٹوں رقصاں احساس کا ہو کچھ ذوق اگر
اس وقت عروسِ فطرت کی زیبائش دید کے قابل ہے
ہر غمزہ اس کا ظالم ہے ہر عشوہ اس کا قاتل ہے
ہر سو ہے سعادت کی تابش ہر سمت ہے بارش رحمت کی
تنویرِ سحر ہے ایک ضیار رخسارِ عروسِ فطرت کی
موسم نہیں خوابِ غفلت کا موقع نہیں سہل انکاری کا
اُٹھ اے غافل بیدار ہو اب ہے وقت یہی بیداری کا
کافر ہے وہ دل اس وقت بھی گر جس دل میں خدا کی یاد نہیں
ملحد بھی اگر دیکھے یہ سماں سجدے میں جھکا دے اپنی جبیں
پیغامِ عمل پھر لائی سحر پھر دنیا اپنے کام میں ہے
سرگرم ہے کوئی طاعت میں کوئی بادہ و جام میں ہے
کچھ میری نہ پوچھو اے رندو اک گوشۂ باغ میں بیٹھا ہوں
خمخانۂ فطرت میں ہر دم صہبائے مسرت پیتا ہوں
ہر سو ہیں شگفتہ لالہ و گل پُر کیف ہوائے گلشن ہے
اک ہاتھ میں جامِ صہبا ہے اک ہاتھ میں اُن کا دامن ہے

بصائر (عبدالباری آسی)

اُلّو سے سلیمان نے اک روز یہ پوچھا
کھیتوں میں تو کس واسطے دانہ نہیں کھاتا
اُلّو نے کہا ڈرتا ہوں اے حضرتِ والا
جنت سے اسی دانے نے آدم کو نکالا

پوچھا کہ تو ویرانے میں کیوں رہتا ہے دن رات
آبادیوں میں تجھ کو بُری لگتی ہے کیا بات
بولا کہ یہ سب ایک ہیں دنیا کے مواطن
معمور بھی ہو جائیں گے ویرانے کسی دن
پوچھا کہ تو کیا کہتا ہے ویرانوں میں اکثر
جو کچھ تیرا مفہوم ہے وہ مجھ سے بیاں کر
بولا مری تقدیر میں یہ راز نہاں ہے
جو رہتا تھا کل محلوں میں وہ آج کہاں ہے
پوچھا کہ تو آبادیوں میں کیوں نہیں آتا
بولا ستمِ انسان کا دیکھا نہیں جاتا
پوچھا ہمیں سمجھا دے ذرا اس کو وہ کیا ہے
جو کچھ کہ نشیمن میں ترے تیری صدا ہے
بولا کہ نشیمن میں ہے یہ میرا ترنم
چلنا ہے تمھیں غافلو ہشیار رہو تم
لو زادِ سفر ساتھ میں تم تا حدِ مقدور
بے فکر نہ ہو منزلِ مقصد ہے بہت دور

٢

دیکھا فنثیا غورث نے اک شخص کو
جس کی تھی پوشاک بے حد خوشنما
جب مگر کچھ گفتگو کرتا تھا وہ
تو غلط جملے بہت سے بولتا
دیکھ کر یہ حال فنثیا غورث نے
کان میں اس شخص کے جھک کر کہا
یا تو اپنی گفتگو کر لے درست
یا ابھی جا کر اُتار آ یہ قبا

٣

لکھا حریف کو یہ اردشیر بہمن نے
جو مانو ہم کو تو ہم تم کو بخشدیں یونان
اگر ہمیشہ ہمارے مطیع ہو کے رہو
تو فائدہ ہو تمھیں اور رہے ہم کو اطمینان
لکھا حریف نے اس کو جواب میں کہ جناب
حقیقی فائدہ سوچے اگر کہیں انسان
نہ دیکھے ملک کو غیروں کے آنکھ بھر کے کبھی
کسی طرح سے نہ پہنچائے غیر کو نقصان
عدو کو فائدہ پہنچانے کے لئے بے خوف
خوشی کے ساتھ کرے اپنے فائدے قربان

بجائے اس کے کہ مل جاؤں اپنے دشمن سے ۔ میں جان دینا سمجھتا ہوں جنگ میں آسان
بجائے اس کے کہ حاکم ہوں قوم پر اپنی ۔ زیادہ خوش ہوں میں آزاد ہو اگر یونان

فلسفۂ حسن (سید ابوالقاسم سرور لکھنوی)

حسن کا لفظ سہ حرفی آج ہے موضوعِ بحث ۔ اس کے ہر ہر جزو کو تنقید سے ہے دیکھنا
علمِ حسیات و وجدانات و جذباتِ بشر ۔ پورا سرمایا ہے یہ فنِ جمالیات کا
کس طرح ہوتا ہے احساسِ جمالی کا ظہور ۔ کونسی شے ہے جو ہو حسنِ مجسم برملا
کیا سبب اس کا کہ اک شے ایک کرتا ہے پسند ۔ دوسرا کرتا ہے نفرت وہ بھی کیسی ناروا
کون سے ہیں ایک شے کے وہ نمایاں خط و خال ۔ جن سے سمجھی جاتی ہے وہ شے نہایت خوش نما
صورت میں پنہاں ہے آخر کون سی وہ ساحری ۔ جس سے ہو جاتی ہے جذبِ سامعہ دلکش صدا
اس طرح کے اور جتنے بھی کیے جائیں سوال ۔ ان سبھوں کا ہے جمالیات سے رشتہ جڑا
ایسے استفسار پر ردوقدح اور غور و خوض ۔ فنِ بالا میں رہا کرتا ہے اپنا مشغلہ
فطرتِ خاموش کے لاکھوں مناظر بے بدل ۔ سطوت و عظمت ہیں جن کے فہم عالم ہے فدا
خوبصورت کوئی بت یا کوئی تصویرِ جمیل ۔ کوئی عمدہ نظم یا دلکش صدا کا سلسلہ
دیکھتے ہی سنتے ہی ان کے بشر کے قلب میں ۔ خوش گوار احساس کا طوفان ہوتا ہے بپا
دل میں بھر جاتے ہیں جذباتِ مسرت ناگہاں ۔ سازِ لب سے اٹھتا ہے تحسین کا ایک غلغلہ
یا خموشی اس پہ چھا جاتی ہے ایسے وقت میں ۔ جب کہ ہو جاتا ہے ذہنِ نارسا بے دست و پا
لفظ تک اظہارِ کیفیات کے ملتے نہیں ۔ جوشِ دل لفظوں میں لب سے ہو نہیں سکتا ادا
شکل، حرکت، رنگ اور نیز اس طرح کے ارتسام ۔ دیکھنے یا سننے سے جن کا ہوا نشو و نما

اطلاع اُن کی دیا کرتے ہیں ہر دم گوش و چشم
یہ وہی ہے جس کو کہتے ہیں جمالی التذاذ
یہ وساطت سے حواسِ آدمی کے روز و شب
نفس میں پیدا کیا کرتا ہے جذباتِ نفیس
حسیات۔ احساس اور لذات کی وتجیب بحث
کچھ نواہائے شنیدہ کچھ بہارِ دیدہ سے
خوش گوار احساس کا اُٹھتا ہے جب جوشِ طرب
حسن کو سقراط ٹھہراتا ہے مانندِ مفید
جو تصور خیرِ برتر اور الوہیت کے ہیں
حسن سے اشیائے عالم کل کے کل لبریز ہیں
حال کے نقاد کہتے ہیں نہیں ایسا نہیں
جو کسی شے کے تصور سے ہوا ہو ارتسام
پھر صفاتِ اعراضِ اشیا دیکھتے ہیں غور سے
حسن کی تخئیل سے پیدا ہیں وہ وہ لذتیں
سب سے پہلے کانٹ نے اس امر کی تعیین کی
اس کے احساس و شعورِ اولیں کے باب میں
جتنے گہرے رنگ رجحانات کو ہوں گے پسند
ہلکے رنگوں کی نفاست جتنی دل کو بھائے گی
حسن کے قصرِ بصیرت زا کی جانیں رات دن

جس سے پیدا ہوتی ہے احساسِ لذت کی نوا
اس کا باعث حسن ہے جس میں نہیں چون و چرا
عقل و وجدان و تخیل کو ہے کرتا تیز تا
روح کو پہنچاتا ہے تا حدِ بامِ اعتلا
ہے یہی وہ روزنِ در جس سے یہ ہے جھانکتا
دونوں سے مل کر بنا ہے اس کا سحرِ حشر زا
اس کو کہتے ہیں یہ ہے سیلابِ حسنِ خود نما
اور فلاطوں کی نظر میں ہے یہ اس کا مرتبہ
حسن ہے ایسے تصور کا مثیل و ہم نوا
یہ خیالاتِ فلاطوں کا ہے مجمل تذکرہ
ہے یہ احساس و حواسِ آدمی کا شعبدہ
اہلِ یورپ کرتے ہیں اپنی یہیں سے ابتدا
تاکہ حاصل ہو جمالی کیفیت کا مدعا
مادی اغراض کا جن میں نہیں کچھ شائبہ
حسن کی لذت نہ ہو وابستۂ حرص و ہوا
ماہرینِ فن نے لوتیت سے کی ہے ابتدا
سمجھا جائے گا تمدن کا ابھی ہے بچپنا
اتنا ہی ہو گا تمدن کو عروج و اعتلا
ہر تمدن بڑھتا ہے لے کر مسئلۂ ارتقا

آبشاروں کی روانی چرخ آسا کوہسار — نیّر تاباں کا چھپ چھپ کر نکلنا ڈوبنا
اور اجرامِ سماوی کے منوّر قمقمے — آج تک فہمِ بشر جن کی نہ گنتی گن سکا
ابر کی اودی سنہری نیلی پیلی ساریاں — جن کو پھیلاتی ہے بامِ چرخ پر بادِ صبا
وہ شفق کا پھولنا، وہ اس کی زرّیں آب و تاب — تودۂ غبرا ہو جس سے صاف سونے کا ڈلا
قلزم و عمّاں کی موجوں کا فلک فرسا خروش — دیکھنے سے ان مناظر کے ہے دل ہیبت کدہ
ان کی لامحدودیت مرعوب کرتی ہے ہمیں — سامنے آنکھوں کے رہتی ہے جلالت کی فضا
اس تصوّر میں اسی حد پر ہے احساسِ الم — جس سے پہلے ہوتی ہے افسردہ کچھ طبعِ رسا
بعد اس کے خود ابھرتے ہیں وہ جذباتِ شریف — جس سے پھر بڑھتا ہے آگے ذوقِ دل کا حوصلہ
ایک ہی آواز یا صورت ہر اک پر اک طرح — کیوں اثر کرتی نہیں اس کی ہے آخر وجہ کیا
ساختِ عصبی ریشوں کی ہر شخص میں یکساں نہیں — اختلافِ عادت و تعلیم ہے اس کے سوا
ذہن کی بالیدگی میں بھی بہت باہم ہے فرق — بیش و کم تفریق کرتی ہے طبائع کو جُدا
اک تخیّل ہی نہیں اس حُسن کے زیرِ اثر — عقل تک پھیلا ہوا ہے اس اثر کا دائرہ
دل کشی، آواز، حرکت۔ رنگ، خط میں جو بھی ہو — ہے یہ امدادِ حواس اک فعل ہے ادراک کا
ان میں پیدا کرتے ہیں موزونیت فکر و شعور — جس سے بن جاتا ہے یہ نقشہ عجب لذّت فزا
قوّتِ ذہنی یہیں انسان اور حیوان کی — باہمی تفریق کو کرتی ہے ظاہر برملا
مختلف رنگوں کی اک تصویر کو یا نظم کو — دیکھتا سنتا ہے حیواں بھی مگر کیا فائدہ
اس سے حیواں کو حصولِ کیف ہوتا ہی نہیں — جس سے آجائے نظر جذبہ کوئی ابھرا ہوا
کس طرح ہوتا ہے ظاہر یہ جمالی التذاذ — فعل اور تخلیق سے ہے اس کا کیسا واسطہ
دل میں انساں کے یہیں رہتی ہے خواہش جاگزیں — جو کرے محسوس اس کو جوں کا توں کر دے ادا

بت گری معماری و موسیقیِ کلفت شکن
شاعری جس میں کہ رہتا ہے درِ تخئیل وا

نیز نقاشی کہ جو دنیا ہے نقش و رنگ کی
ارتسامِ ذہنی و طبعی کا ان میں سلسلہ

سب یہ ظاہر ہوتا ہے الفاظ یا اصوات سے
نام صنّاعی ہوا ایسے ہی اظہارات کا

خارجی صورت میں ہم وجدان یا احساس کو
جب کریں ظاہر تو صنّاعی ہی کہلائے گا

منفعل رہتا ہے یا خوابیدہ احساسِ جمال
عام لوگوں میں مگر صنّاع میں ہے جاگتا

فعل ہے افراطِ قوت کا نتیجہ اور یہی
چادرِ تخلیق سے کرتا ہے ظاہر دست و پا

دیکھتی ہے غیر مرئی چیز کو کس غور سے
صوت و رنگ و سنگ میں صنّاع کی طبعِ رسا

پھر اسے مرئی بنا کے سامنے لاتی ہے یہ
جس سے دل کے باغ میں چلتی ہے لذت کی ہوا

یا یہ کہئے کام میں صنّاعِ سحر انگیز کے
صاف ہے توضیحِ نصب العین کا نقشہ کھنچا

یہ مدد سے حسِّ انسانی کے اس کے ذہن کو
لے کے آغوشِ اثر میں اور بڑھتا ہے سوا

روح کو دے کر سہارا پھر یہ کرتا ہے بلند
اور جذباتِ شریفانہ کو دیتا ہے جلا

اس سے وجدانات اعلیٰ پاتے ہیں اوجِ کمال
یہ دماغ و دل کو دیتا ہے تاثر کی غذا

قوّتیں انسان کی کل اس کے ہیں زیرِ اثر
روح کی گہرائیوں میں بھی ہے یہ پیرا ہوا

عام نظروں سے نظر صنّاع کی ہوتی ہے تیز
وہ تعقّل کرتا ہے جب ایک نصب العین کا

ساتھ ہی اس کے کسی پیرایۂ دل چسپ سے
جوں کا توں کرتا ہے بس اس کا اعادہ بے خطا

اس بیان میں اس جگہ پیدا یہ ہوتا ہے سوال
کیا ہے صنّاعی؟ فقط تقلید کی بانگِ درا

جو اعادہ کرتی ہے حسّی ظواہر کا تمام
کوئی کیا اس کا بھی ہے مقصود غایت مدّعا

کیا نہیں اخلاق سے اس کا تعلق پاک ہے
محض صنّاعی کی خاطر سیکھیں صنّاعی کو کیا

ان سوالاتِ عجیبہ کی ہے ایسی شاہ راہ
ماہرانِ فن یہیں سے ہوتے ہیں باہم جدا

نقلِ فطرت کی بعینہ یا تشابہ بس یہی
بعض کے نزدیک صنّاعی کا مقصد ہے بڑا

بعض کہتے ہیں مناسب ہی نہیں صنّاع کو
نقلِ فطرت میں کرے فطرت کی پوری اقتدا

بلکہ کچھ ہو نقل اور کچھ ہو اضافہ ساتھ ساتھ
وہ اضافہ اپنے افکار اور وجدانات کا

فطرتِ خاموش سے اشیا کو کرے منتخب
ربط دے کر سرِّ فطرت کو کرے اُن سے ادا

ایسی صنّاعی جو ہو مخصوص خطّ و خال کی
یا تصوّر کوئی یا سیرت ہو جس سے رونما

یہ حقیقت سے زیادہ منکشف ہوتی ہے اور
ذہن کو پہناتی ہے پورے تاثر کی قبا

ذہن میں وجدانی اثر کے آ کر اِک صنّاع کو
فکر ہوتی ہے بنا دے فعل کی اس کو سبھا

اس لئے پوری وہ کرتا رہتا ہے فطرت کی نقل
اتنی ہی کرتا ہے جو محسوس وہ خود کر چکا

پھر یہیں سے اور پیدا ہوتا ہے مشکل سوال
جس کو کہہ سکتے ہیں پہلے کے مقابل دوسرا

تابعِ اخلاق صنّاعی کو ہونا چاہئے
یا نہیں اخلاق سے بالا ہے اس کا مرتبہ

بعض اس بارہ میں رسکن کے ہوئے ہیں ہم خیال
کہتے ہیں اخلاق پر صنعت کی قائم ہو بِنا

اپنے وجدانات اعلیٰ میں کرے ہم کو شریک
سب سے بڑھ کر کارنامہ ہے یہی صنّاع کا

مقصدِ اعلیٰ ہے صنّاعی کا بس یہ ایک ہی
اس سے ہو اخلاق کی تعلیم کا نشو و نما

بعض کہتے ہیں کہ صنّاعی نہ ہو پابند قید
اس کو ہونا چاہئے مطلق جمیل و خوش نما

ہیئت و صورت ہی میں موجود ہوتا ہے جمال
بے تعلّق جس سے یہ رہتا ہے وہ ہے مادّہ

بعض گزرے ہیں جمالیین میں ایسے بھی فرد
جو جمالیات کی کرتے ہیں اس حد تک ثنا

کہتے ہیں رتبہ جمالیات کا مافوق ہے
اور ہے اخلاق سے بھی اس کا اونچا مرتبہ

الغرض یہ ایسا دل کش روح پرور پھول ہے
جس کی خوبی سامعہ اور باصرہ کی ہے غذا

چشمِ نظارہ طلب میں اس سے سحرِ بے خودی
سامعہ میں اس کی لذّت کا ہے اک طوفاں بپا

جنتِ گوش اور فردوسِ نظر ہر ایک میں — جلوہ ہائے حسن کی رہتی ہے نور افشاں ضیا
روز و شب سمع و بصر کے پردۂ فانوس پہ — کوندھتی رہتی ہے اُس کی برقِ استعجاب زا
سامعہ اور باصرہ کے ساز میں وہ تار ہیں — جن کی جنبش میں نہفتہ ہے مسرت کی صدا
حسن کی تصویر کے دو رُخ ہیں دونوں دل فریب — باصرہ ہے ایک ان میں سامعہ ہے دوسرا
عشوہ ساماں صورتیں ہیں باصرہ سے ہم کنار — مژدہ ہائے روح کا مرکز ہے جوفِ سامعہ
عشوہ و ناز و کرشمہ کے خدنگِ دل شکار — باصرہ کے گھر میں بنتے ہیں یہ پیکانِ قضا
سامعہ کے باغ میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی — ہر روش پہ بکھرتی ہے نطق و تکلّم کی صبا
دل رُبا رنگین تصویریں بصر کے ساتھ ساتھ — سمع کے کاشانے میں ضو ریز نغموں کی خنیسا
دونوں کی بینائیاں لبریزِ کیفِ حسن ہیں — بستیاں احساسِ لذّت کی ہیں ہر اک میں جُدا
یہ الگ اشیائے عالم سے نظر آتا نہیں — یہ دکھایا کرتا ہے رہ کر انھیں میں معجزہ
ریگ کے ذروں میں اجرامِ سماوی میں یہی — جس جگہ جاؤ ملے گا اس کا قصر آراستہ
کہکشاں کی چادرِ پُر نور قصرِ ماہ و مہر — التہابِ برق اور بزمِ نجومِ لامعہ
سنگِ خارا کی روائیں اور بناتی جامہ وار — کسوتِ حیوان و انساں سب میں ہے پیدا و نما
رنگِ سبزی و نوا ریزی اسی کے ہیں محل — مختلف رنگت کی تصویریں ہیں جس میں جا بجا
باصرہ افروز جنگلوں میں گلوں کے ہے یہی — سامعہ میں لحن کے آئینوں کی یہ ہے جِلا
ساز کے پردوں میں خوابیدہ ترنم بھی یہیں — جب ذرا مضراب نے چھیڑا اُٹھا ہنستا ہوا
یا حجابِ ساز اک محفل ہے ذوقِ گوش کی — حسن کے نغموں کا رہتا ہے جہاں پر جمگھٹا
یا یہ پردے اس کے روئے دل رُبا کی ہیں نقاب — جن کے اُٹھتے ہی شکیب و ضبط ہوتے ہیں فنا
دہر کے خم خانۂ لذّت کا ساقی ہے یہی — جس نے پیمانوں کو احساسات کے یکسر بھرا

روح بالیدہ ہو جس سے یہ ہے وہ کیفِ نشاط
گل کدے دل کے مہک جاتے ہیں یہ ہے وہ صبا

مادیت پست کر دیتی ہے جب ذوقِ طلب
پھونکتا ہے آ کے یہ انساں میں روحِ اعتلا

اس سے جذباتِ مہذب جاگ اُٹھتے ہیں تمام
گلشنِ تہذیب اس سے پاتا ہے نشو و نما

مادیت سے نکل کر سیر کرنے کے لئے
جادۂ ادراک پر لاتا ہے بن کر رہنما

چشمِ باطن کو دکھا دیتا ہے ایسا جلوہ زار
جس کا لپکا ذوقِ تشنہ سے نہیں پھر چھوٹتا

حسنِ مطلق کا یہ اک پرتو ہے جو عالم میں ہے
سایہ پھر سایہ ہے جس کو اصل سے نسبت ہے کیا

یہ مقید حسنِ مطلق کی دلیلِ راہ ہے
اس سے ملتا ہے ہمیں روحانیت کا راستہ

وہ کشادہ راہ جس جا ششجہت کل اک قدم
وہ بلندی جس جگہ ہفت آسماں تحت الثریٰ

ہر طرف پھیلی ہوئی ذوقِ طلب کی تیز دھوپ
دور تک کوئی نشانِ رہ نہ منزل کا پتا

اور اس سے آگے گلزارِ تحیر کی مہک
جس سے بے خود ہو کے رہ جاتا ہے ادراکِ رسا

رنگ و بوگینی کے ہیں سرمایہ دار التذاذ
اس جگہ دونوں کے دونوں بے حقیقت بے نوا

کل نوا ریزی تصدقِ لذت آوردہ سکوت
گل تبسم ہیچ و ناکارہ شگفتہ وہ فضا

کیف و کم کی اس جگہ میزاں نہیں منت پذیر
قید و بندش کا وہاں ادنیٰ نہیں کچھ واسطہ

نورِ عالم کل کا کل اس جا پہ اک داغِ سپید
اور وجودِ عالم اس جا ایسا جیسے نقشِ پا

مادیت تاب لا سکتی نہیں جس دید کی
اس طرح کا حسنِ مطلق ہر طرف پھیلا ہوا

لامکاں کے گوشۂ تقدیس میں اک عشوہ ریز
سامنے جس کے ہے اپنی منزلت کا آئینہ

دیکھتا ہے آپ ہی اپنا جمالِ بے مثال
غیرِ فانی اپنی سج دھج کا ہے خود ہی مبتلا

بے جھجک آگے بڑھے جاتے ہو بس ٹھہرو حضور
کیا نہیں معلوم تم کو راستہ ہے کونسا

بصائر (عبدالباری آسی)

دیو جانس کو یہ عادت پڑی تھی — کہ پھرتا شہر کی گلیوں میں اکثر
کسی دن ایک نے اُس سے یہ پوچھا — کہ اے عاقل حکیمِ نکتہ پرور
کہیں کیا کوئی تیرا گھر نہیں ہے — کہ لے آرام جاکر اُس میں دم بھر
کہا گھر کی اگر تعریف یہ ہے — کہ لوگ آرام پائیں اس میں رہ کر
تو پھر میں بھی جہاں آرام پاؤں — اُسی کو فرض کر لیجیے مرا گھر

۲

ایک مُسرف سے دیو جانسِ کلبی نے کہا — کہ مجھے آپ عطا کیجیے من بھر چاندی
سُن کے مُسرف نے کہا اس سے کہ اے مردِ فقیر — ٹک سمجھ میں نہیں آتی تری فرمایش کی
ایک پیسے کا جب اوروں سے تو کرتا ہے سوال — مجھ سے کس واسطے چاندی کی طلب ہے اتنی
بولا اس واسطے کرتا ہوں میں تجھ سے یہ سوال — دیکھتا ہوں کہ تنزّل پہ ہے دولت تیری
اور لوگوں سے تو ملتا ہی رہے گا پیسا — تجھ سے لیکن نہ ملے گی کبھی پھر اک کوڑی

۳

جلسہ کیا تھا کوئی فلاطوں نے ایک دن — مدعو تھے جس میں شہر کے سب صاحبِ کمال
آیا جو بزم میں دیو جانس تو اس طرح — کیچڑ بھری تھی پاؤں میں سر کے بڑھے تھے بال
آتے ہی دونوں پاؤں جو قالین پر ملے — تو فرش کو بنا دیا یکسر خراب حال
رگڑا کیا جو پاؤں اسی طرح دیر تک — تو حاضرینِ بزم نے اس سے کیا سوال
کیا کر رہا ہے اے دیو جانس یہ حرکتیں — محفل کا پاس تجھ کو نہ تہذیب کا خیال

اس نے دیا جواب کہ تلووں سے پاؤں کے — کرتا ہوں میں غرورِ فلاطوں کو پائمال
سن کر یہ بات اس کی فلاطوں ہنسا مگر — ہنسنے کے بعد کہنے لگا وہ خجستہ فال
کرتا ہے پائمال یہ بے شک غرور کو — لیکن بڑے غرور سے کرتا ہے پائمال

۴

اک مصوّر نے کیا پیشہ طبابت کا شروع — خردہ گیری سے زمانے کی جو عاجز آیا
ایک دن اپنے مطب میں تھا وہ مصروفِ علاج — دیکھ کر اس کو یہ دیوجانسِ کلبی نے کہا
آپ کی فہم و فراست کے ہوئے ہم قائل — چھوڑ دی آپ نے تصویر کشی خوب کیا
کیوں کہ تصویر بتاتی ہے مصوّر کے عیوب — قبر کی خاک چھپاتی ہے طبیبوں کی خطا

التجائے سکون (راشد علی پوری)

ردائے خواب میں خاموش سوتی ہے دنیا،
مئے سکوت سے مدہوش سوتی ہے دنیا،
مثالِ رندِ سیہ کوش سوتی ہے دنیا!
میں تیری یاد میں رہتا ہوں رات بھر بیدار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

فضا میں پھیلتی جاتی ہیں چاندنی راتیں
سرورِ عیش سناتی ہیں چاندنی راتیں
سرورِ کیف بہاتی ہیں چاندنی راتیں

مگر خوشی کو ترستی ہے میری جانِ نزار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

سحر کے وقت کہ ہوتا ہے رحمتوں کا نزول
جہان والوں کی محفل پہ عشرتوں کا نزول
فضا سے لطف و مسرّت کی نکہتوں کا نزول
مگر میں رہتا ہوں نا آشنائے صبر و قرار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

ہزار کیف بداماں ہو لالہ زارِ شفق،
نظر فریب ہو دامانِ زر نگارِ شفق،
مری نظر میں مگر ہیچ ہے بہارِ شفق،
کہ ہے حیات مری اب بھی تیرگی بہ کنار!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

ستارے شام کے جس وقت جھلملاتے ہیں،
فلک پہ اپنی ضیاؤں کے دُر لٹاتے ہیں!
تو میرے دیدۂ تر اشکِ غم بہاتے ہیں،
اور اُن کی نذر میں کرتا ہوں موتیوں کا ہار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

ترے بغیر تماشائے گلستاں بے کیف،
ترے بغیر ہر اک حسنِ گلفشاں بے کیف،

ترے بغیر ہے رنگینیِ جہاں بے کیف!
ترے بغیر ہیں بے کیف میرے لیل و نہار!!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!
رہین آتشِ فرقت دل و جگر کب تک؟
رہے گی دور، مری جنتِ نظر! کب تک؟
غمِ فراق سہوں تو سہی! مگر کب تک،
نہ ہوگی جانِ حزیں آشنائے صبر و قرار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!
ترے شباب میں رنگینیٔ بہار رہے!
فروغِ حسن سے تو سحر در کنار رہے!
تو خلد زارِ محبت میں جلوہ یار رہے
تو میری روح پہ گر جائے بارشِ انوار!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!
سپہرِ عشق کا ٹوٹا ہوا ستارا ہوں!
تمہارے وعدۂ صبر آزما کا مارا ہوں!
مگر قسم ہے تمہاری کہ میں تمہارا ہوں!
ہے میری خاک میں جب تک کہ زندگی کا شرار!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

گوکل کی شام (پنڈت ہری چند اختر۔ بی اے)

گوکل کے جھونپڑے ہیں۔ جمنا کا ہے کنارا
اے دیدۂ تصوّر کر لے پھر اک نظارا

مغرب میں رفتہ رفتہ اک شام بن رہی ہے
پریوں کی سبز وادی گلفام بن رہی ہے

سیندور مل لیا ہے خورشید نے جبیں پر
جمنا نے اوڑھ لی ہے اک سرخ زرد چادر

پچھم سے آ رہی ہیں مستی بھری ہوائیں
پورب پہ چھا رہی ہیں۔ نیلوفری گھٹائیں

سبزہ لہک رہا ہے کلیاں چٹک رہی ہیں
گوکل کی چھوٹی چھوٹی گلیاں مہک رہی ہیں

کھیتوں سے آ رہی ہیں کچھ رس بھری صدائیں
اک کیفِ سرمدی سے معمور ہیں فضائیں

چھوٹا سا ایک لڑکا بنسی بجا رہا ہے
الفت کے بھولے بسرے نغمے سنا رہا ہے

پیغام برگلوں کے مے میں بسے ہوئے ہیں
یعنی ہوا کے جھونکے لے میں بسے ہوئے ہیں

نیچے گھروں کے باہر کچھ گوپیاں کھڑی ہیں
اِک دو یہاں کھڑی ہیں، اک دو وہاں کھڑی ہیں

یہ بھولی بھولی شکلیں۔ یہ منتظر نگاہیں
یہ گرم گرم آنسو۔ یہ سرد سرد آہیں

کیوں ہوک اٹھ رہی ہے، آرام کیوں نہیں ہے؟
شام آ گئی ہے۔ لیکن گھنشام کیوں نہیں ہے

اے بے وقوف اختر! جھگڑے ہیں یہ پرانے
یہ بھید کون سمجھے۔ یہ راز کون جانے؟

ڈیک پر ایک صبح (جگل کشور بیدر)

ہیں پیڑ کیکروں کے اور ڈیک کا کنارا
او مچھلیوں کے رسیا کر لے پھر اک نظارا

مشرق کے آسماں پر جھاڑو سی پھر رہی ہے
چھڑکاؤ بھی ہوا ہے شبنم جو گر رہی ہے

خورشید نے افق کے گھونگھٹ سے سر نکالا
اور ڈیک نے بھی شب کا چولا اتار ڈالا

پانی نہیں ہے اس میں نیلم پگھل گیا ہے
گھنشام یا نہا کر باہر نکل گیا ہے

مرغابیوں کے ٹولے ہر سمت اُڑ رہے ہیں
دکھن سے آ رہے ہیں پچھم کو مڑ رہے ہیں

کلیاں چٹک رہی ہیں سبزہ لہک رہا ہے
اور کالا شاہ کاکو سارا مہک رہا ہے

پُل پر سے ریل چھک چھک کر کے گزر رہی ہے
روشن فضا دھوئیں سے تاریک کر رہی ہے

اک سنگ دل شکاری بنسی لگا رہا ہے
پھیلا کے دامِ الفت مچھلی پھنسا رہا ہے

سر کنڈے بنسیوں کے رہ رہ کے ہل رہے ہیں
گویا یہ مچھلیوں کے پیغام مل رہے ہیں

ریتی پہ زخم خوردہ کچھ مچھلیاں پڑی ہیں
اک دو یہاں پڑی ہیں اک دو وہاں پڑی ہیں

سیماب وار ان کا رہ رہ کے تلملانا
پانی کی سمت اُچھلنا اور پیچ و تاب کھانا

اک روگ یہ لگا ہے جس کی دوا نہیں ہے
مُنھ تو کھلا ہوا ہے پر کیچوا نہیں ہے

بیہودہ بدر بس کر جھگڑے ہیں یہ پرانے
مچھلی کی بے کسی کو مچھلی ہی خوب جانے

یہ عید ہماری عید نہیں (ابوالاثر حفیظ جالندھری)

یہ عید ہے روزہ داروں کی
محبوبِ خدا کے پیاروں کی

جن کی طاعت مشکور ہوئی
پروان چڑھی منظور ہوئی

سجدوں نے جبینیں چمکائیں
منت کی مرادیں بر آئیں

محنت کا شجر پھل لایا ہے
دن فضلِ خدا کا آیا ہے

یہ بخشش کی امیّد کا دن
یاروں کے لیے ہے عید کا دن

رحمت کی گھٹائیں چھائی ہیں ۔ قبلے کی طرف سے آئی ہیں
وا ہیں توحید کے مئے خانے ۔ اور گردش میں ہیں پیمانے
ساقیِ ازل کی چوکھٹ ہے ۔ مستانِ الست کا جمگھٹ ہے
یہ سب اللہ کے دیوانے ۔ شمعِ وحدت کے پروانے

توحید کے نغمے گاتے ہیں
مل مل کر عید مناتے ہیں

ہم بد قسمت ہم بے چارے ۔ آزارِ فرقت کے مارے
عید آئی یہ کیسے مانیں ۔ ہم عید کی خوشیاں کیا جانیں
یثرب سے نہیں پیغام آیا ۔ غربت میں ماہِ صیام آیا
محبوب کے در سے دور رہے ۔ لاچار ہوئے مجبور رہے

جب نورِ خدا کی دید نہیں
یہ عید ہماری عید نہیں

موت کا قافلہ (حفیظ جالندھری)

آتی ہے آوازِ درا!
یہ قافلہ ہے موت کا

دیکھو وہ گرد اڑاتی ہوئی ۔ آکاش پر چڑھتی ہوئی

ہر موڑ پر مڑتی ہوئی   ہر سمت کو بڑھتی ہوئی
حسرت بھری خاموشیاں
ہیں ساتھ ساتھ اُس کے رواں
آہوں کے ڈیرے ساتھ ہیں   گہرے اندھیرے ساتھ ہیں
یہ قافلہ ہے موت کا!
آتی ہے آوازِ درا
ہاں موت ہے یہ موت ہے!
اپنا سفر کرتی ہے طے
یعنی دیارِ ہست کو   پھرتی ہے سر کرتی ہوئی
ہر اک بلند و پست کو   زیر و زبر کرتی ہوئی
کہسار کیا میدان کیا
آباد کیا ویران کیا
یہ سب کو ٹھکراتی ہوئی   زیرِ نگیں لاتی ہوئی
اپنا سفر کرتی ہے طے
ہاں موت ہے یہ موت ہے!
پنجے درندوں کی طرح
بازو پرندوں کی طرح
ہے ہڈیوں کے ڈھانچ پر   افسردگی لپٹی ہوئی
ڈائن کی صورت سربسر   آزردگی لپٹی ہوئی

آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی
اور مردنی چھائی ہوئی
پچکے ہوئے سے گال ہیں — بکھرے ہوئے سے بال ہیں
بازو پرندوں کی طرح
پنجے درندوں کی طرح

اس کی خوشی ماتم میں ہے
اس کی مسرت غم میں ہے
نالے نہیں یہ درد کے — اس دیوی کا راگ ہے
جھونکے ہوائے سرد کے — اس کے نفس کی آگ ہے
جس شہر میں جلتی ہے یہ
جس راہ پر چلتی ہے یہ
آتی ہے آوازِ فغاں — اُٹھتا ہے آہوں کا دھواں
اس کی مسرّت غم میں ہے
اس کی خوشی ماتم میں ہے

اس کے جلو میں ہیں رواں
گل پیرہن بانکے جواں
بوڑھے بھی ہیں بچے بھی ہیں — ہیں عورتیں بھی مرد بھی
چھوٹے بھی ہیں سچّے بھی ہیں — احرار بھی دل سرد بھی
خاطی بھی ہیں معصوم بھی

مسرور بھی مغموم بھی

مجبور بھی مختار بھی   مفلوک بھی زردار بھی

گل پیرہن بانکے جواں

اس کے جلو میں ہیں رواں

یاروں سے دل برداشتہ

پیاروں سے دل برداشتہ

یہ پریم گھاتی موت کے   موہ لوبھ تج کر آئے ہیں

سارے براتی موت کے   پھولوں میں سج کر آئے ہیں

عاشق وفا بھولے ہوئے

معشوق ادا بھولے ہوئے

بیوی کا دل توڑے ہوئے   بچّوں سے منہ موڑے ہوئے

پیاروں سے دل برداشتہ

یاروں سے دل برداشتہ

کہتی ہے آوازِ جرس

اللہ بس باقی ہوس

سنتے ہیں سب شاہ و گدا   یہ موت کی آواز ہے

سب ہیں اسی کے ہم نوا   کتنا سُریلا ساز ہے

لاچار ہیں مجبور ہیں

اس سحر میں مسحور ہیں

یہ نیند کے ماتے ہیں سب　　سوتے چلے جاتے ہیں سب
کہتی ہے آوازِ جرس
اللہ بس باقی ہوس

یہ قافلہ ہے موت کا
بس یوں ہی چلتا جائے گا
اس قافلے کے ہم سفر　　ہر روز بڑھتے جائیں گے
سود و زیاں سے بے خبر　　زوروں پہ چڑھتے جائیں گے
یہ تیز رو آتش قدم
جائیں گے تا حدِ عدم
منزل مگر معدوم ہے　　اللہ کو معلوم ہے
بس یوں ہی چلتا جائے گا
یہ قافلہ ہے موت کا!

اب مجھ کو بھول جاؤ (حفیظ جالندھری)

پہلے بتا دیا تھا
سب کچھ جتا دیا تھا
پہچان جاؤ مجھ کو　　ہاں جان جاؤ مجھ کو
مے سے بھرا سبو ہوں
ٹوٹا تو بس گیا میں

دامانِ رنگ و بو میں
چھوٹا تو بس گیا میں
اب یاد کر رہے ہو   فریاد کر رہے ہو
اب تلملا رہے ہو   آنسو بہا رہے ہو
بیتابِ آرزو ہو   سرگرمِ جستجو ہو
یہ زاریاں عبث ہیں   دلداریاں عبث ہیں
ہاتھوں سے مجھ کو کھو کر
اب جاؤ غم نہ کھاؤ
کیوں پھر رہے ہو مضطر
دل کو کہیں لگاؤ
میں وقت تھا گیا بس   مثلِ ہوا گیا بس
اب مجھ کو بھول جاؤ
اب مجھ کو بھول جاؤ

چھایا ترنگ بن کر
اُٹھا اُمنگ بن کر
اُترا تو آبرو ہوں   نکلا تو آرزو ہوں
دیکھا مجھے! تمھاری
تقدیر بن کے بگڑا

سمجھے مجھے! کہ ساری
تدبیر بن کے بگڑا!

اب ہاتھ مل رہے ہو — سو چال چل رہے ہو
کیوں اس سے فائدہ کیا؟ — اب تم کو ہوگیا کیا
یہ مہربانیاں کیوں؟ — شیریں زبانیاں کیوں
غمخوار ہیں کئی اور — مل جائے گا کوئی اور

یہ پُر فریب باتیں
مجھ کو نہ اب سُناؤ
یہ چال اور یہ گھاتیں
اغیار کو سکھاؤ

میں رنگ تھا اڑا بس — آنسو تھا بہ گیا بس
اب مجھ کو بھول جاؤ
اب مجھ کو بھول جاؤ

مجبوریاں لاچاریاں (حفیظ جالندھری)

حُسن نے سیکھیں غریب آزاریاں — عشق کی مجبوریاں لاچاریاں
بہہ گیا دل حسرتوں کے خون میں — لے گئیں بیمار کو بیماریاں
سوچ کر غم دیجئے۔ ایسا نہ ہو — آپ کی کرنی پڑیں غمخواریاں
وار کے قدموں تلک پہنچی نہ عقل — عشق ہی کے سر رہیں سرداریاں

اک طرف جنسِ وفا قیمت طلب | اک طرف میں اور مری ناداریاں
ہوتے ہوتے جان دوبھر ہو گئی | بڑھتے بڑھتے بڑھ گئیں بے زاریاں
تم نے دنیا ہی بدل ڈالی مری | اب تو رہنے دو یہ دنیا داریاں

ضبطِ غم (تاثیر ۱۹۳۴-۱۔۷)

چمبہ کے ایک پہاڑی نالے سے خطاب

اے مقام سرنوحہ زن ہے کیا غمِ ایام میں | درد پیدا کر دیا تو نے سکوتِ شام میں
پتھروں سے سر کو ٹکراتا ہوا آتا ہے تو | مضطرب اتنا کہ بل کھاتا ہوا آتا ہے تو
سینہ کاوی اس قدر کی ہے کہ زہرہ آب ہے | لرزاں لرزاں یوں کہ گویا پانی نہیں سیماب ہے
گریۂ پیہم سے اب شرحِ تمنا ہو گئی | یعنی پتھر کے بھی دل میں راہ پیدا ہو گئی
سامنے وادی کے اس جانب ہے راوی راہ گیر | وہ یہاں سے سو قدم پر ایک پانی کی لکیر
جاودانی وصل کے نغمے سناتی ہے تجھے | شادماں ہو تو کہ خود منزل بلاتی ہے تجھے
ایک میں ہوں دور افتادہ وطن کی راہ سے | عندلیبِ آوارہ واماندہ چمن کی راہ سے
میرا سر برسوں کسی کے آستاں پر خم رہا | میرا وہ محرم رہا اور اُس کا میں محرم رہا
اب مری آنکھوں کے آگے اک مسلسل رات ہے | میں ہی میں ہوں اور کوئی ہے تو خدا کی ذات ہے
کاش ہوتا ہی نہ زخمِ عشق کو مرہم نصیب | رنج تو یہ ہے کہ شاداں تھا کبھی میں غم نصیب
وصل کیسا، آرزوئے وصل تک معدوم ہے | شادمانی کے تصور سے بھی دل محروم ہے
دل تو روتا ہے مرا۔ آنکھیں مگر پُرنم نہیں | اس طرح بیٹھا ہوں جیسے مجھ کو کوئی غم نہیں
تو مگر اس عارضی فرقت پہ ہے محشر بدوش | رسمِ الفت خود فراموشی ہے اور تو خود فروش

جاں تجھ کو کتنی پیاری ہے کہ تو ہے نوحہ زن — یا زِ جاناں یا زِ جاں بایست دل برداشتن
ابتدا سے ڈرنے والے دیکھ تو انجام بھی — ضبطِ غم سے پختہ ہو جاتی ہے طبعِ خام بھی
اس قدر بے چین کیوں ہے کلفتِ ایام سے — کچھ تو شرما - اپنے جی ہی میں سکوتِ شام سے

آندھی (تلوک چند محروم - بی - اے)

توصیف لب پہ لالہ و گل کی سدا رہی — پیشِ نظر خرامشِ بادِ صبا رہی
محروم دل فریب یہ طرزِ ادا رہی — اک ڈھنگ پر مگر تری طبعِ رسا رہی
اب یہ دکھا کہ رنگ بدلتی ہے کس طرح
آندھی کلور کوٹ کی چلتی ہے کس طرح!

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے — بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ وہ باہر مثال سے — آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے
روپوش اس کے سامنے کوہِ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رخِ آسماں ہوا

ہر سمت آ رہی ہے سراسیمگی نظر — بے چارگی کی بن گئے تصویر سب شجر
شاخوں میں چھپتے پھرتے ہیں طائر اِدھر اُدھر — مامن کی راہ دوڑ کے لینے لگے بشر
چوپائے بھانپ کر یہ مصیبت کہاں گئے
ان بے کسوں کے سینگ سمائے جہاں گئے

آتی ہے مثلِ اژدرِ صحرا پھنکارتی — للکارتی فلک کو زمیں کو پکارتی
ذروں کو تا بہ چرخ چہارم ابھارتی — اڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اتارتی

یکساں بلند و پست پہ چھاتی ہوئی چلی
ہل چل زمین زماں میں مچاتی ہوئی چلی

جڑ سے اُکھڑ کے نخلِ تناور کہیں گرا
ٹہنا کسی غریب کے سر پر کہیں گرا
دیوار سے اُکھڑ کے کوئی در کہیں گرا
چھجّا اُڑا کہیں سے تو چھپّر کہیں گرا

جو چیز صحن میں تھی وہ صحرا میں جا پڑی
اہلِ زمیں پہ کیسی یہ اُفتاد آ پڑی

چکّر سے گرد باد کے چکرا گئی زمیں
دیکھا یہ زور شور تو تھرّا گئی زمیں
جھونکوں کے ساتھ اُڑتی ہوئی آ گئی زمیں
بس اب کسی ستارے سے ٹکرا گئی زمیں

آثار ہیں ظہور قیامت کے سر بسر
اجزائے دہر ہوتے ہیں اے وائے منتشر

جب آسماں پہ اس کا علم ہو گیا بلند
کرنے لگے بچاؤ کی تدبیر ہوش مند
تا بامِ چرخ جس کی رسائی ہے بے کمند
کس کی مجال ہے جو کرے اس کی راہ بند

چھپ چھپ کے لاکھ بیٹھیے کب چھوڑتی ہے یہ
دروازے کھٹکھٹاتی نہیں۔ توڑتی ہے یہ

آندھی نہیں نمونۂ قہرِ خدا ہے یہ
شعلوں سے تند خو ہے یہ ظاہر ہوا ہے یہ
بارش ہے جس کی خاک وہ کالی گھٹا ہے یہ
تھمنے پہ اب تو آ گئی۔ شکرِ خدا ہے یہ

نتھنوں میں، منہ میں، آنکھوں میں، کانوں میں گرد ہے
صحرا کی طرح بند مکانوں میں گرد ہے

افسوس! میں ہوں اور یہ صحرائے ہولناک
اُڑتی ہے جس میں شام و سحر آسماں پہ خاک

دل اس الم میں دامنِ گل کی طرح ہے چاک — ہیں جھنڈ جائے سرو، تو گلبن کے بدلے آک
رُک خاک باریوں سے گئی ہے صفائے طبع
اب پھول کیا زمینِ سخن میں کھلائے طبع

بے بسی (گمنام)

باغ میں جو پھول ہے یارب گریباں چاک ہے — یعنی اپنے درد کے اظہار میں بے باک ہے
لالۂ گلشن پہ ہے موجود داغِ دودِ دل — چاند کے سینے میں روشن ہے چراغِ دودِ دل
دستِ قدرت نے کیے اظہارِ غم ہائے نہاں — ابر کو گریہ دیا، بادِ صبا کو سسکیاں
الغرض جو چیز ہے محوِ نمودِ ذات ہے — ہاں مگر انساں سے ناممکن یہ ادنیٰ بات ہے
صانعِ کامل نے بخشی نطق سی بے کار شے — اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کوئی بے کار شے
دل میں پوشیدہ ہے پنہاں ہے جہانِ اضطراب — لب پہ آ سکتا نہیں لیکن بیانِ اضطراب
ہمنشینو حالتِ پنہاں عیاں ہو کس طرح
جو گزرتی ہے غریبوں پر بیاں ہو کس طرح

پریم پیالے (اکبر خانصاحب اصغر کلانوری)

او ہجر میں تڑپانے والے — او من کو ترسانے والے
او دل میں بس جانے والے — او سپنے میں آنے والے
آ پریم پیالے پی پی لیں
او روپ دھنی او من موہن — او منوہر ہرنے والے من

آ تجھ پر واروں تن من دھن — آ ہو جائیں اک جاں دو تن
آ پریم پیالے پی پی لیں

آ دنیا اور بسائیں ہم — دنیا سے الگ ہو جائیں ہم
آ پریم سے نینہ لگائیں ہم — آ پریم کی جوت جگائیں ہم
آ پریم پیالے پی پی لیں

اس منڈل کو تیاگیں یکسر — اور چل کے بسائیں پریم نگر
لے پریم نگر کی دیکھ ڈگر — وہ سامنے ہے من کا مندر
آ پریم پیالے پی پی لیں

العشق کا ہر دم سمرن ہو — بس اس مالا کا جاپن ہو
ہم ہوں اور پریم کا دامن ہو — اور پریم ہی پریم سے کاون ہو
آ پریم پیالے پی پی لیں

اک پریم کی بہتی گنگا ہو — ننھی سی پریم کی کٹیا ہو
کاندھے پر پریم کا دھاگا ہو — ماتھے پر پریم کا ٹیکا ہو
آ پریم پیالے پی پی لیں

آ پریم میں رنگ لیں ہم دامن — اور پریم بھبوت لگائیں تن
ہو پریم کی دھونی پہ آسن — اور پریم کی ہم سلگائیں اگن
آ پریم پیالے پی پی لیں

آ بیتیم من سے من ہر لیں — آ موتیوں سے دامن بھر لیں
آ پریت کی باتیں کر کر لیں — آ پریم کے ساغر بھر بھر لیں

آ پریم پیالے پی پی لیں

آ عشق کے مے خانے میں چلیں   مے عشق کے خُم کے خُم پی لیں
سدھ بدھ نہ رہے یوں مست پھریں   پھر سارے گیان کے بھید کھلیں

آ پریم پیالے پی پی لیں

آ ہجر میں یوں تڑپا نہ کریں   صدمے یہ جدائی کے نہ سہیں
فرقت کی اگنی میں نہ جلیں   نالے نہ کریں آہیں نہ بھریں

آ پریم پیالے پی پی لیں

اک جان اک تن ہو جائیں آ   مل جائیں جیسے دو دریا
مٹ جائے تو میں کا جھگڑا   میں تو ہوں تو میں ہو جا

آ پریم پیالے پی پی لیں

اصغر ہیں اُن کے بھاگ بڑے   وہ پریم پیالا جن سے ملے
جو پریم کی راہ میں خاک ہوئے   وہ جی کے مرے وہ مر کے جئے

آ پریم پیالے پی پی لیں

نیندوں کی بستی (حفیظ جالندھری)

خاموش۔ خاموش! اے دوست خاموش!

اے رونے والے۔ اے فاتحہ خواں!   یہ سرزمیں ہے۔ شہرِ خموشاں!
سوتے پڑے ہیں۔ ہستی کے طوفاں   غم ہائے امروز۔ فردا کے ارماں

ناکامیِ دوش! خاموش۔ خاموش!

خاموش۔ خاموش۔ اے دوست خاموش!

بیٹھے ہیں مِل کر۔ سانجھ اور سویرا دھندلی ضیا ہے۔ ہلکا اندھیرا
اس وقت کوئی۔ تیرا نہ میرا اُترا ہوا ہے۔ روحوں کا ڈیرا
آنکھوں سے روپوش۔ خاموش۔ خاموش
خاموش۔ خاموش!۔ اے دوست خاموش!

اے جنبشِ لب۔ ہاں ہاں خبردار! باطل نہ ہو جائے۔ یہ سحرِ زنہار
ہیں آج یک جا۔ عجز اور پندار پہلو بہ پہلو۔ مجبور و مختار
ہشیار و مدہوش۔ خاموش۔ خاموش!
خاموش خاموش! اے دوست خاموش!

خاموشیوں میں۔ گم ہیں صدائیں بیکار ہیں سب۔ یہ التجائیں
کس کو پکاریں۔ کس کو بلائیں یہ بیوی بچے۔ یہ باپ مائیں
ہیں پنبہ در گوش۔ خاموش۔ خاموش!

انجامِ محبت (تاثیر۔ ایم۔ اے)

کبھی وہ وقت تھا جب دل ہی دل میں میں سمجھتا تھا
اور اس کا ذکر اکثر اپنی نظموں میں بھی کرتا تھا
کہ یہ دن۔ جو سحر سے شام تک یکسر مسرت ہے
کہ یہ شب۔ جو بڑی لمبی ہے لیکن ایک ساعت ہے
یہ سب تیرے کرم سے ہے یہ سب تیری عنایت ہے

(۲)

اور اب یہ وقت بھی ہے، تو مرے پہلو میں سوتا ہے
مرے ہی ساتھ۔ دن اور رات اکثر وقت ہوتا ہے
میں ہنستا ہوں تو ہنستا ہے میں روتا ہوں تو روتا ہے
مرا دل اب سُناتا ہے مجھے کچھ اور ہی باتیں
کہ یہ دن رات۔ یہ خوشیوں کے دن یہ عیش کی راتیں
یہ سب کچھ میرے ہی دم سے ہے۔ میری ہی بدولت ہے

(۳)

مگس دیوار گلشن پھاند کر بے اختیار آیا
تڑپتا۔ لوٹتا۔ دم توڑتا۔ پروانہ وار آیا
سوالی بن کے ہر پتّی کے آگے ہاتھ پھیلایا
ہزاروں منّتیں کیں پاؤں پڑ کر شہد کو چوسا
مُرادیں دِل کی بر آئیں تمنّاؤں کو بھر پایا
پلٹ کر پھر نہ دیکھا بھی یہ انجام محبّت ہے

سکاؤٹ (حفیظ جالندھری)

پہلا نظارہ

جب سورج سر پر چڑھتا ہے۔ جب دھوپ کی شدّت ہوتی ہے
جب پیسے والوں کی دنیا۔ خس خانوں میں جا سوتی ہے

جب لُو کے گرم سمندر میں۔ طوفان بپا ہو جاتا ہے
ایک ایک بگولا اُمنڈ اُٹھ کر۔ گرداب بلا ہو جاتا ہے
جب دریا بھی کھول اُٹھتے ہیں۔ چڑھتا ہے بخار ہواؤں کو
جب گرد بنا کے اُڑتی ہے۔ گرمی گھنگھور گھٹاؤں کو
تانبے کی طرح سے تپتی ہے جس دم چھاتی میدانوں کی
ہوتی ہے گھنے پیڑوں کے تلے آسودہ فوج کسانوں کی
جب چونچیں کھولے شاخوں کے جھرمٹ میں پرندے ہانپتے ہیں
کھیتوں میں چرندے ہانپتے ہیں غاروں میں درندے ہانپتے ہیں
جب محنت سے اُکتا کر مزدور آراموں کی ٹھانتے ہیں
سرمایہ دار اشرفیوں سے سونے کو بہتر جانتے ہیں
جب بوڑھے اور جواں گھروں سے باہر آتے ڈرتے ہیں
جب مائیں اُف اُف کرتی ہیں جب بچے تُم تُم کرتے ہیں
اک بھولا بھالا سا لڑکا اس وقت نکلتا ہے گھر سے
ممتاز دکھائی دیتا ہے انداز اس کا دنیا بھر سے
اس دھوپ میں ڈھونڈھے جاتا ہے امداد کے حاجت مندوں کو
پانی کے گھڑے پہنچاتا ہے اللہ کے پیاسے بندوں کو
گرتے ہیں پسینے کے قطرے۔ موتی بن کر رخساروں پر
یا زلف کی بدلی مینہ برساتی ہے ان لال انگاروں پر
کم عمر سپاہی کیا کہنا اس تیری خاکی وردی کا
تو صورت انسانیت کی۔ تو پتلا ہے ہمدردی کا

ماضی و حال (مجید ملک۔ بی۔ اے)

کبھی وہ دن بھی تھے ہمدم۔ کہ میں بیتاب ہو ہو کر
خدا کی بارگہ میں التجا کرتا تھا رو رو کر
کہ اے عرشِ بریں پر رہنے والے اپنی رحمت سے
مجھے حوروں کی عفت دے ستاروں کی پاکیزگی دے
اگر میں اپنے دل کا حال کہتا تھا دعاؤں میں
تو معصومیتیں پرواز کرتی تھیں فضاؤں میں
ازل کے دن ملی تھی پاکبازی اس قدر مجھ کو

مگر اس وقت میں ہوں اور دنیا کی بری باتیں
تصنع، جھوٹ، چالاکی، لگاوٹ، دور کی گھاتیں
دروغِ مصلحت آمیز، ظاہر کی رواداری
خوشامد بزدلانہ، دور اندیشی، ریاکاری
قدح آشامیاں عفت فروشوں سے ملاقاتیں
غرض حرص و ہوا و آز کے دن عیش کی راتیں
مری قسمت نے رسوا کر دیا ہے کس قدر مجھ کو

غرورِ جوانی (مولانا وحید الدین سلیم)

عجب تھا وہ عہدِ نوجوانی کہ اپنے بل پر تھا ناز مجھ کو
سمجھتا تھا یہ کہ ہے حریفوں پہ زور میں امتیاز مجھ کو
خیالِ ورزش میں محو تھا میں۔ بدن۔ کو سانچے میں ڈھالتا تھا
پچھاڑ کر اپنے دشمنوں کو بخارِ دل کا نکالتا تھا
حریف چلتے تھے سر جھکا کر جو میرے دم خم کو دیکھتے تھے
مجھے وہ کیا دیکھتے تھے گویا زمیں پہ رستم کو دیکھتے تھے

خیال طاقت کے ساتھ تھا یہ کہ اک جوانِ حسین بھی ہوں میں
جہاں میں شیرِ عرین بھی ہوں میں تو آہوئے نازنین بھی ہوں میں
خیال کرتا تھا میں کہ مجھ میں جلال بھی ہے جمال بھی ہے
جفاکشی کا ہنر ہے مجھ میں تو دلکشی کا کمال بھی ہے

یہ حسن وطاقت پہ ناز سرا فریب تھا جلوۂ خودی کا
سمجھتا تھا جس کو آبِ کوثر سراب نکلا وہ زندگی کا
مرض نے گھیرا ایکا ایک اگر تو وہ طرارے رہے نہ باقی
بس ایک تودہ تھا راکھ کا ہیں کہ اب شرارے رہے نہ باقی
ڈھلی وہ سب طاقتِ جوانی غرور میں جس پہ کر رہا تھا
مٹی وہ سب حسن کی لطافت میں آپ دم جس کا بھر رہا تھا
سمجھتا تھا جن کو حسن وطاقت وہ سیمیا کی نمائشیں تھیں
وہ وہم کی دل فریبیاں تھیں وہ عقل کی آزمائشیں تھیں
فریب میں عقل گر نہ آتی تو رات کو دن نہ جانتا میں
نمودِ ظاہر کو میں سمجھتا تو اس کو باطن نہ جانتا میں
قیام جس کو نہ تھا، نہ ہوگا میں اس کو قایم گماں نہ کرتا
دوام جس کا نہیں ہے ممکن، میں اس کا دائم گماں نہ کرتا

بہار کے بعد جب خزاں ہے بہار پر اعتبار کیوں ہو
گلوں کا جب رنگ و بو ہے فانی تو اس پہ گلچیں نثار کیوں ہو

بہادر کی زندگی (لبھو رام جوشؔ ملسیانی)

بہادر خلق میں وجہِ نشاطِ کامرانی ہے ❊ اسی کے پردۂ ہمّت میں پنہاں شادمانی ہے
اسی کی زندگانی حاصلِ دنیائے فانی ہے ❊ اسی کی مرگ کا اک نام عمرِ جاودانی ہے

چراغِ راہِ بے کس جلوۂ تاباں اسی کا ہے
دلِ افگاروں کی جنّت گوشۂ داماں اسی کا ہے

اسی کے نام کا ہوتا ہے چرچا شہسواروں میں ❊ اسی کے کام کا رہتا ہے شہرہ نامداروں میں
اسی کے نعرۂ ہیبت کا غل ہے آبشاروں میں ❊ اسی کا شورِ یارب گونجتا ہے کوہساروں میں

اسی کے ناخنِ تدبیر کو تقدیر کہتے ہیں
وہ ہے گردِ نگہ اس کی جسے اکسیر کہتے ہیں

اِسی کا خون بن کر رنگ چمکا لالہ زاروں میں ❊ اِسی کا حوصلہ پھیلا ہے بُو بن کر بہاروں میں
اِسی کا نام ہے حرفِ تسلّی سوگواروں میں ❊ سکوں ہے بے قراروں میں تو مرہم دل فگاروں میں

اسی کے اشکِ چشمِ تر گہر بن کر برستے ہیں
اسی کی تیغِ خوں آشام سے جوہر برستے ہیں

اِسی کی ہمتوں سے بستیاں آباد رہتی ہیں ❊ اِسی کی برکتوں سے ہستیاں آباد رہتی ہیں
اِسی کا دیکھ کر جلوہ نگاہیں شاد رہتی ہیں ❊ اِسی کی رس بھری باتیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں

جہانِ فتح و نصرت بستۂ فرماں اسی کا ہے
نشانِ امن و راحت بندۂ احساں اسی کا ہے

تنِ دشمن پہ لرزہ اس سے طاری ہو ہی جاتا ہے ❊ بد اندیشِ سُبک سر پہ یہ بھاری ہو ہی جاتا ہے

نگاہِ خشمگیں کا زہر ساری ہو ہی جاتا ہے　ستمگر! منی جوشش میں آ رہی ہو ہی جاتا ہے
بہادر رہی کی ہستی سے فنا کو ہے بقا حاصل
بہادر جو نہیں اے جوش جینا اس کا لاحاصل

فریبِ تمنا (حفیظ جالندھری)

میرے خیال و خواب کی دنیا لئے ہوئے　پھر آگیا کوئی رخِ زیبا لئے ہوئے
یہ کم نگاہیاں ہیں۔ تو پھر کس امید پر　بیٹھا رہوں فریبِ تمنا لئے ہوئے
آنکھوں میں آ بسی ہے کسی انجمن کی یاد　اجڑے ہوئے بہشت کا نقشا لئے ہوئے
حسرت برس رہی ہے رخِ نامراد پر　یہ کون جا رہا ہے تمنا لئے ہوئے
دل گیسوئے بتاں میں الجھ کر نہ گر پڑے　اٹھتا تو ہے خدا کا سہارا لئے ہوئے
آئی ہے بے حیا مرا ایماں خریدنے　دنیا کھڑی ہے دولتِ دنیا لئے ہوئے
اس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھئے　اک حشر اٹھ رہا ہے تماشا لئے ہوئے
گو آج تک کسی سے توقع نہ تھی مگر
پھرتا ہوں اک جہان کا شکوا لئے ہوئے

پختگیِ جنوں (ڈاکٹر سعید بریلوی)

غنیمت تھا لڑکپن ہی تمھارا اس جوانی سے　مبارک تھا تمھارا دورِ اول دورِ ثانی سے
ہزار افسوس یوں ہی چل دیا اچھا زمانہ تھا　بہت کم عمر تھیں تم میں ذرا تم سے سیانا تھا
اکھٹے کھیلتے تھے باغ میں گھر چھوڑ کر پہروں　ہوا کرتی تھیں باتیں لطف سے سر جوڑ کر پہروں

ادھر میں سیدھا سادھا تھا ادھر تم بھولی بھالی تھیں
جھجک تھی کچھ مرے دل میں نہ تم شرمانے والی تھیں

خیالِ عشق سے ناآشنا تھا گو دماغ اپنا
نہ یہ پروانۂ دل تم کو کہتا تھا چراغ اپنا

محبت کی مگر ریشہ دوانی ہوتی رہتی تھی
غمِ الفت کی مجھ پر مہربانی ہوتی رہتی تھی

نہ تھا احساس، لیکن دل نہ خالی تھا محبت سے
سُلگنے کچھ ابھی سے یہ لگا تھا سوزِ الفت سے

بڑا معلوم ہوتا تھا تمہارا کھیل اوروں سے
گزرتا تھا گراں دل پر تمہارا میل اوروں سے

تمہارے روئے زیبا کا تماشا دل کو بھاتا تھا
تمہاری گفتگو سُننے میں دل کو لطف آتا تھا

تمہارے سامنے اکثر میں کچھ کھویا سا رہتا تھا
جُدا ہوتا اگر تم سے تو کچھ سویا سا رہتا تھا

تمہاری یاد تنہائی میں شب بھر پاس رہتی تھی
سحر کو تم سے پھر ملنے کی دل کو آس رہتی تھی

مجھے جب مدرسے میں کچھ تمہارا دھیان آتا تھا
کچھ ایسا محو ہوتا تھا کہ پڑھنا بھول جاتا تھا

دیا کرتے ریاضی کے سوال اُستاد کرنے کو
لکھاتے یا عبارت بر زباں کچھ یاد کرنے کو

بسا اوقات میں پیارا تمہارا نام لکھ جاتا
جب اس پر کچھ سزا ملتی تو دل ہی دل میں جھنجھلاتا

مجھے اسکول میں جب اک ذرا صورت کشی آئی
خوشی کی مسکراہٹ پھرتی تھی ہونٹوں پہ اترائی

بس اک تصویر تم سے ملتی جلتی سی بنا ڈالی
پھر اس ڈر سے کہ کوئی دیکھ لے گا جھٹ مٹا ڈالی

بڑا ہی لطف آیا تھا مجھے اس کے بنانے میں
قلق سا بھی ہوا تھا دل کو پھر اس کے مٹانے میں

یوں ہی الفت تمہاری چپکے چپکے بڑھتی جاتی تھی
محبت کا سبق میری طبیعت پڑھتی جاتی تھی

ہزار افسوس اطوارِ زندگی میں انقلاب آیا
مجھے بھی کچھ سمجھ آئی تمہارا بھی شباب آیا

شباب آتے ہی دل پر کوہِ اندوہ و الم ٹوٹا
جُدائی ہو گئی تم سے غضب آیا ستم ٹوٹا

جھجک آتی ہے اب مجھ کو تمہارے پاس آنے میں
تمہیں بھی شرم سی آنے لگی ہے منہ دکھانے میں

بٹھائے رکھتی ہے گھر میں تمہیں رسموں کی مجبوری
کئے دیتی ہے دیوانہ مجھے یہ جاں گسل دوری

تمھارے اقربا رکھنے لگے تم کو نگاہوں میں — نہ اب آتی ہو کوٹھے پر نہ اب ملتی ہو راہوں میں
کبھی دیوار پر سے اور گاہے چھت کی موری سے — تمھیں گو اب بھی اکثر جھانک ہی لیتا ہوں چوری سے
مگر یوں دیکھنے سے اور بڑھ جاتی ہے بے تابی — مجھے ڈر ہے کہ دیوانہ نہ کر دے مجھ کو بے خوابی
قیامت ہے تمھارا گھر میں یوں محبوس ہو جانا — ضرورت ضبطِ الفت کی مجھے محسوس ہو جانا
نہ رو سکتا ہوں جی بھر کر نہ چپ رہنے کا یارا ہے — نہ دل لگتا ہے کھیلوں میں نہ پڑھنا ہی گوارا ہے
بسا ہے دردِ الفت میرے دل میں نورِ جاں ہو کر — جنوں میں پختگی سی آگئی پیاری جواں ہو کر

جہاں میں اب ہے تمھارے اب بھلوں گا میں نہ بھولوں گا
تمھیں میں زندگی بھر اب نہ بھولوں گا نہ بھولوں گا

اِک ترے آنے کے بعد (حفیظ جالندھری)

(اُستاد کے واپس آجانے پر)

جھٹ مل گئی سب کو خبر — ایسے اشارے ہو گئے
ستاد کا مُنہ دیکھ کر — چپ چاپ سارے ہو گئے
اب اس طرح خاموش ہیں — گویا کبھی بولے نہ تھے ہا
آنکھیں اُٹھائی ہی نہ تھیں — اور لب کبھی کھولے نہ تھے
اب ہیں کتابیں سامنے — باہم نگہ ملتی نہیں
ہیں بھاگنے والے بھی چُپ — اب ان کو رہ ملتی نہیں
اب ڈاڑھ بھی دکھتی نہیں — اب درد سارا تھم گیا
ہاں ہاتھ ہے لیکن وہ ہیں — گویا وہیں پر جم گیا

چہرے کتابوں سے چھپے — ساری زبانیں چُپ ہوئیں
چٹکی وہیں پر رہ گئی — سیٹی کی تانیں چپ ہوئیں
اب کاپیاں گُم ہو گئیں — اب نقل چل سکتی نہیں
اُستاد سے گویا کوئی — اب عقل چل سکتی نہیں
یہ ننھّے مُنّے سے جو ہیں — شوخی میں حضرت ایک ہیں
صورت تو دیکھو آپ کی — گویا بہت ہی نیک ہیں
دل میں شرارت ہے بھری — دم سادھے رکھتے ہیں مگر

دیکھو پھر اِن کی شوخیاں
اُستاد پھر جائے اگر

ہر غم کی دوا (سید علی اختر صاحب حیدرآباد)

تو لذّتِ غم کا خوگر بن! ہر غم کی دوا بھی ہوتی ہے
ہر صبر شکن تاریکی میں اک موجِ صبا بھی ہوتی ہے

مقصود نہیں یہ نالوں کا وہ ترکِ جفا پر مائل ہوں
لیکن یہ انھیں معلوم تو ہو، اک چیز وفا بھی ہوتی ہے

انجام ہر اک آغاز کا ہے لازم، تو غلط ہے سمجھا یعنی
مستورِ ربابِ عشرت میں اک تلخ نوا بھی ہوتی ہے

میں ضبط کا خوگر ہو نہ سکا، اچھّا یہ سہی، لیکن یہ بتا!
اے حُسنِ جفا کب تک! حدِّ تسلیم و رضا بھی ہوتی ہے

سرشارِ جوانی، ہوش میں آ، اک چیز ہے وقتِ پیری بھی
جب عہدِ طرب کی ہر شوخی، مجبورِ حیا بھی ہوتی ہے

گر ترکِ ادب الزام نہ ہو، جی میں ہے یہ زاہد سے پوچھوں
کیا درسِ حقیقت میں لازم، تعلیمِ ریا بھی ہوتی ہے

آزادِ غرورِ چند نفس، معمورِ نشانِ عجز و کرم
ہر سطرِ جبینِ فقر مگر منشائے غنا بھی ہوتی ہے

مستی کی حدوں سے باہر آ، یہ بھید کھلے گا جب تجھ پہ
اجزائے حیاتِ سرمد سے ترکیبِ فنا بھی ہوتی ہے

اس وقت سے موت اچھی اختر جب حوصلۂ عاجز کے سوا
مایوسِ اجابت دل سے نکلنے والی دعا بھی ہوتی ہے

دعا (عبداللطیف تپش)

اللہ ترے صدقے تو نے ہمیں بنایا — بے گنتی نعمتیں دیں سکھ بھوگنا سکھایا
صدقے ترے کرم کے اے واہب العطایا — پتلے تجھے خاک کے ہم انساں ہیں بنایا
ابرِ کرم سے تیرے نکھرا ہے پتّا پتّا — تو نے کلی کلی کا شبنم سے منہ دُھلایا
تاروں کے آسماں پر لاکھوں دیئے جلائے — سورج کی روشنی سے دھرتی کو جگمگایا
دریا کا قطرہ قطرہ ڈھلکا رہا ہے موتی — سبزے کو لہلہا کر صحرا میں گل کھلایا
برکھا کی رُت بنا کر مُردے میں جان ڈالی — جب گھر کے ابر آیا آبِ حیات لایا
اُن داتا کوئی تجھ سے بڑھ کر نہیں جہاں میں — بھوکا نہیں اُٹھایا بھوکا اگر سُلایا
بندوں کا اپنے والی گلشن کا اپنے مالی — سنسار کا تو راجا پرجا ہے تیری مایا
ہر جا تری پرستش ہر جا ترے پجاری — مندر میں تجھ کو دیکھا مسجد میں تجھ کو پایا
اپنے کرم سے یارب کھیڑے بسا ہمارے — تو ہے ہمارا راعی ہم ہیں تری رعایا
تعلیم دے وفا کی احساں کی خو عطا کر — چاہت ہو دل میں سب کی اپنا ہو یا پرایا
نیکی میں عمر گزرے سچائی میں بسر ہو — امدادِ باہمی کی توفیق دے خدایا

کیوں کر نہ پاؤں بیٹے اظہارِ بندگی میں
اونچی ہوئی نہ آنکھیں جب تک نہ سر جھکایا

افسانہ در افسانہ (سید ذوالفقار علی بخاری)

عشق کو فرزانہ کر یا عقل کو دیوانہ کر
ہو توکّل یا تدبّر کچھ بھی ہو مردانہ کر

لطف لے لے کر بیاں ہو قصۂ ہجر و وصال
عشق کا افسانہ ہے افسانہ در افسانہ کر

ہاں خدا سے ڈر بتِ کم سن کسی کا دل نہ توڑ
ظلم ہے یہ ظلم ہے ایسا نہ کر ایسا نہ کر

شمع ڈھلتی جائے گی پروانے جلتے جائیں گے
تیری دل سوزی سے کیا ہوتا ہے تو پروا نہ کر

آرزو؟ کیا ہے جلا دے اس خس و خاشاک کو
سوز رکھتا ہے تو اپنے دل کو آتش خانہ کر

دل کو آنا ہے یہ آئے گا جوانی ہی تو ہے
جو ترے بس کی نہ ہو اس بات کو سوچا نہ کر

عالمِ آوارگی میں جب کوئی رہبر نہ ہو
عقل کو تو خیر لیکن عشق کو روکا نہ کر

درد کے درماں تو مل جائیں گے لیکن ذوالفقار
فکرِ درماں ہے تو دل میں درد ہی پیدا نہ کر

کیا کروں؟ (حفیظ جالندھری)

کل تو وہ آ ہی جائیں گے لیکن آج کیا کروں؟
بڑھ رہا ہے قلب کا اختلاج کیا کروں؟

کیا کروں کوئی نہیں، احتیاج دوست کو
اور مجھ کو دوست کی احتیاج کیا کروں؟

لو میں اب نہیں مریض، کہہ دیا طبیب نے
یہ کوئی مرض نہیں، میں علاج کیا کروں؟

غیرتِ رقیب کا، شکوہ کر رہے ہو تم
اس معاملے میں سخت ہے مزاج کیا کروں؟

احتیاج بھی نہیں، اختیار بھی نہیں
کام کاج کیوں کروں، کام کاج کیا کروں؟

تاج و تخت جاہ و مال، جان کا اک عذاب ہیں
جاہ و مال کیا کروں، تخت و تاج کیا کروں؟

زور اور زر بغیر عشق کیا ہے اے حفیظ
چل پڑا ہے عشق میں یہ رواج کیا کروں

اعزازِ نفس (محشر لکھنوی)

جذبِ کامل اس کو کہتے ہیں یہ ہے اعجازِ نفس
دل سا اک آزاد بندہ ہو گیا دم سازِ نفس

جب ازل کے دن بنائے عالمِ ہستی ہوئی
نفس تھا جاں بازِ دل کا اور دل جاں بازِ نفس

عالمِ اصغر کو دل ہی نے مخاطب کر دیا
مطمئن ہو کر سنی سب نے نوائے سازِ نفس

بند ہوتی ہے زبان و چشم جب بعدِ حیات
منکشف ہو جاتے ہیں اہلِ فنا پر رازِ نفس

فاعلِ مختار انساں روک لے یا بڑھنے دے
در حقیقت عرش تک ہے قوتِ پروازِ نفس

ہے وہی دار العلومِ معرفت کا اوستاد
ہو گیا جس شخص کو اندازۂ اندازِ نفس

جمع ہو کر چند قطرے خون کے دل بن گیا
اور وہی دل رفتہ رفتہ ہو گیا ہمرازِ نفس

بدوِ فطرت اور فنا دونوں سے ثابت ہو گیا
انتہائے نفس کیا ہے اور کیا آغازِ نفس

لطف جب ہے نفس اٹھائے نازِ افعالِ حسن
اس سے کیا حاصل اگر ہم نے اٹھایا نازِ نفس

شادی و غم میں تحمل سا تحمل چاہیئے
کس لئے تغیرِ رنگِ رخ بنی غمازِ نفس

ہر نفس ہو اتنی روحانی ریاضت کامیاب
آخر ارباب نظر ہوں قائلِ اعجازِ نفس

تزکیۂ باطن کا کر دیتی ہے تکمیلِ علوم
ورنہ انساں ہے شکارِ چنگلِ شہبازِ نفس

شاہدِ روحانیت کا جلوہ دیکھے گا وہ کیا
زندگی بھر جو رہا محوِ فریبِ نازِ نفس

راہیں ادراکِ حقیقت کی نظر آئیں گی صاف
عقلِ انساں ہو اگر معنی شناسِ رازِ نفس

زندگی کہتے ہیں کس کو آمد و رفتِ نفس
موت کی کیا اصل ہے غافل سکوتِ سازِ نفس

مشتِ خاکِ انسان آخر عرش پیما بن گیا
اور کس حد تک بڑھے گی قدرتِ اعجازِ نفس

کر دے اپنی زندگانی صرفِ اخلاقِ حسن
ہو جو منظورِ نظر محشر تجھے اعزازِ نفس

خیالِ یار سے خطاب (محمد اسمٰعیل ہاتف)

تجھ سے کچھ تسکینِ دلِ بےتاب کی ہوتی نہیں
میری گھبراہٹ میں، الجھن میں کمی ہوتی نہیں
بلکہ ہو جاتا ہے دونا اضطراب و انتشار

اے نمودِ اضطراب، اے دشمنِ آرامِ دل
تجھ سے مل کر اور ہوتی ہے طبیعت مضمحل
مبتلائے رنج ہو جاتی ہے جانِ بےقرار

آہ! اُن کی طرح تو بھی مجھ کو تنہا چھوڑ دے
توڑ دے یہ رشتۂ مہر و محبت توڑ دے
روح قالب میں ہوئی جاتی ہے میری بےقرار

جا! جہاں جی چاہے جا، للہ اب مجھ تک نہ آ
چکھ چکا میں تیرے الطاف و عنایت کا مزا
کر دیا ہے تو نے مجھ کو مضطر و بیمار و زار

آہ مجھ کو چھوڑ دے، تو میرے حالِ زار پر
رحم کر میری تمنائے دلِ بیمار پر
جو کہ اک مدت سے تنہا زندگی پر ہے نثار

وہ خفا، تو مہرباں، وہ دور تو مجھ سے قریب
میرا شوقِ جستجو ہے آہ! کتنا بدنصیب
دیکھتا ہوں غور سے یہ انقلابِ روزگار

مدعا یہ ہے کہ کوئی بھی نہ ہو اپنے سوا
تم سے کم ایسا تو دنیا میں ملے خلوت کدا
جان دے کر جب ملا تو کیا ملا کنجِ مزار

نغمۂ خوش گوار (نثار احمد خاں کاکوری)

نغمۂ شادی ہے ہر حالت میں سازِ خوش گوار
پُر اثر اصوات سے جوشِ مسرت آشکا

عالمِ خاموش ہو سنسان ہو آباد ہو
ہر جگہ تیری رسیلی تان سے دل شاد ہو

موجزن خوں ہو رگوں میں ولولوں میں ہو وفور
بے خودی ہونے لگے بڑھنے لگے کچھ کچھ سرور

دل میں ہو عشقِ حقیقی اور مجازی کا خیال
جس سے حاصل ہو کوئی لذت ہو فرقت یا وصال

سیرِ دریا گلستان و مرغزار و کوہسار
بزمِ دل کش ابر و باد و عالمِ فصلِ بہار

یہ مناظر ان کے کیا دل چسپ دکھلاتا ہے تو
سب کے پژمردہ دلوں کو جیسے بہلاتا ہے تو

رقص کا بھی ہو سماں اور جام کا دور ہو
تھاپ طنبورہ یہ ہو اور کیفِ مے فی الفور ہو

تیرے سب ارکان ہیں، ٹھمری، غزل، دوہے، بھجن
جشنِ موسیقی کی قبضے میں ہے تیری انجمن

بے زبانی میں ترا طرزِ تکلم اور ہے
زمزمہ کچھ اور ہے سازِ ترنم اور ہے

کھینچ کے جذبات کو لیتا ہے تو آغوش میں
جن کو شیریں لَے میں پہنچاتا ہے سب کے گوش میں

جذب کر لیتی ہے تجھ کو بھی بے حد ذوق سے
پھر سناتی ہے ہر اک کو جو بہت ہی شوق سے

مدتوں گو بجا کیا متھرا و بندرابن میں تو
ہو گیا مشہور دنیا بھر میں اپنے فن میں تو

نعت باری کے بھی گانے پر کہیں سب مرحبا
اور رلاتا ہے تو گا کر اک عروسِ دل ربا

یاد آ جاتے ہیں تجھ کو سن کے ایامِ کہن
نغمۂ شادی سنوں گزرے کوئی دولھا دلھن

صورتِ الحاح ہو زاری دعائے مستمند
مسجد و مندر، کلیسا میں ہوں سُر تیرے بلند

جم گھٹے رندوں کے ہوں اور لطفِ ساقی بے شمار
جب یہ ساماں جمع ہوں کیوں کر ہو دل کو پھر قرار

تجھ پہ شیدا شہر والے اور دیہاتی گنوار
دل ربا ہر ایک موسم میں ہیں ساون اور ملار

کاٹتا ہے اس طرح سے قیمتی لمحوں کو تو
خوب بہلاتا ہے عاقل اور نافہموں کو تو

شامِ تمنّا (شگفتہ زمانہ)

سرِ شام ہے سرنگوں آسماں
ہے جامِ مئے لالہ گوں آسماں

بدلتا ہے رنگِ زمانہ نیا
سُناتا ہے دوراں فسانہ نیا

نظر میں ہے اب تک جو اگلا چلن
ہرے ہو گئے آج زخمِ کہن

جو دیکھا یہ نیلوفری آسماں
تو یاد آیا اِک قصّہ باستاں

شہِ نامور تھا جو فیروز شاہ
رعیّت نواز اور عالم پناہ

بہ صد امن ہر دل خوش و بامُراد
ہر اک سو عمارات بینو سواد

جدھر دیکھیے خرّمی انبساط
کہ تھا گرم بازارِ عیش و نشاط

چہیتی عروس اس کی گلنار تھی
سدا رنج و غم میں گرفتار تھی

کنیزیں کئی ہر گھڑی آس پاس
خوش آئین و خوش منظر و خوش لباس

ہر اک پیشِ خدمت فرشتہ خصال
سلیقہ شعار اور صاحب جمال

کسی سے مزاج اس کا ملتا نہ تھا
کسی دم کنول دل کا کھلتا نہ تھا

زمانے سے اُلٹا تھا گویا چلن
خوش آتی نہ تھی اُس کو سیرِ چمن

ہر اک دم تھی افسردگی بے سبب
گھڑی بھر نہ گھٹتا تھا رنج و تعب

کمر بستہ خدمت پہ تھے جو طبیب
کسی طرح جاگے نہ اُن کے نصیب

طبیعت سنبھالے سنبھلتی نہ تھی
بہر حال دم بھر بہلتی نہ تھی

خدا جانے کس دھن میں کس دھیان میں
خراماں تھی اک دن خیابان میں

چمن میں تھی اس طرح دل گیر سی
ہوا تازہ پہلو میں تھی تیر سی

یکایک ہوئی آ کے پیشِ نظر — لئے آئینہ دخترِ خوب تر
جو خود حُسن میں اس کی تصویر ہے — عیاں خوابِ طفلی کی تعبیر ہے
رہا مدّتوں دل میں درد و گداز — مگر بھا گئی یہ ادا دل نواز
جو دیکھا رُخ آئینے میں بے نقاب — نظر آئے ہالے میں دو ماہتاب
طبیعت ہوئی خوش جو تھی مضمحل — محبّت سے آخر کھلا باغِ دل
نکل آیا پہلو میں جو خار تھا — کہ جی آپ ہی آپ بے زار تھا
لیا بوسہ جو روئے گلفام کا — ملا دل کو اک مرہم آرام کا
دل اُس دم بھلا کون پھر تھامتا — خوشی چھائی ایسی بڑھی مامتا
یہ قصّہ بھی ہے اک خطِ کہکشاں — نمایاں سرِ جدولِ آسماں
ہوئے نامیوں کے نشاں کالعدم — مگر ہیں سر آنکھوں پہ نقشِ قدم

زمانے میں ہیں نیکیاں یادگار
بدلتے رہیں لاکھ لیل و نہار

آفتاب کی پہلی شعاع (علامہ اقبال)

صبح جب میری نگہ سودائیِ نظّارہ تھی — آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی
میں نے پوچھا اُس کرن سے اے سراپا اضطراب — تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب
تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں — کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں
یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے، کیا ہے یہ؟ — رقص ہے، آوارگی ہے، جستجو ہے، کیا ہے یہ؟
خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستیِ خاموش میں — پرورش پائی ہے میں نے صبح کے آغوش میں

مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے — جستجو میں لذتِ تنویر رکھتی ہے مجھے
میں کوئی بجلی نہیں فطرت میں گوناری ہوں میں — مہرِ عالم تاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں
سرمہ بن کر چشمِ انساں میں سما جاؤں گی میں — رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں
کُند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا — جاگ اُٹھ تو بھی کہ دورِ خود فراموشی گیا

میرا مکان رشکِ گلستاں

(پریمانند بالی راولپنڈی)

یہی ہے آشیاں میرا یہی دار الاماں میرا
جہاں میں کیوں نہ ہو پیارا مجھے پھر یہ مکاں میرا
مکاں سے مجھ کو اور مجھ سے مکاں کو ہوتی ہے رونق
میں ہوں روحِ مکاں اور ہے مکاں روحِ رواں میرا
میں بستا ہوں مکاں میں اور بستا ہے مکاں مجھ میں
مکاں کے دل میں ہوں میں اور مرے دل میں مکاں میرا
مرا یہ جسم جب تک مرغِ جاں کا آشیانہ ہے
رہے محفوظ صرصر سے، خدایا آشیاں میرا
مکاں کہنے کو ہے در اصل یہ پھولوں کی بستی ہے
قلم ہوتا ہے خوش ہو کر اسی میں گل فشاں میرا
کہیں ہیں پھول خنداں اور چٹکی ہیں کہیں کلیاں
مکاں ہے غیرتِ بستان و رشکِ گلستاں میرا
جو آتا ہے مکاں میں مثلِ گل خوش ہو کے کہتا ہے

کلی جی کی کھلی جاتی ہے دل ہے شاد ماں میرا
چراغِ گل کہیں روشن کہیں داؤدی کی شمعیں
انھی کے نور سے پُر نور رہتا ہے مکاں میرا
یہ گھر پھولوں سے پُر ہے اور میں اک اس میں بھونرا ہوں
میں ہوں مہماں ہر اک گل کا ہر اک گل میہماں میرا
کہیں کھٹکے نہ چشمِ عالمِ بالا میں خار آسا
گلستانِ جہاں میں ہے مکانِ رشکِ جناں میرا
کسی گلبن پہ شکلِ گل یہیں ہو جاؤں گا ظاہر
چھڑا سکتی نہیں تو اے اجل مجھ سے مکاں میرا
دکھائی دیتے ہیں جو سامنے یہ جال بیلوں کے
رہا کرتا ہے دل اکثر انھیں کے درمیاں میرا
کہاں گملے ہیں آویزاں خوشی کے یہ تو جھولے ہیں
انھیں میں جھولتا رہتا ہے قلبِ نکتہ داں میرا
سرور و عیش کا گھر ہے اگر دنیا میں تو بس ہے
مکاں میرا۔ مکاں میرا۔ مکاں میرا۔ مکاں میرا
گلوں غنچوں سے جب تک گلستاں کو زیب و زینت ہے
رہے بھرپور پھولوں سے مکاں اے لامکاں میرا
یہاں حاصل ہے تسکینِ دل و جمعیتِ خاطر
قرارِ روح و جانِ جاں مکاں ہے بے گماں میرا

گلوں غنچوں میں بادِ جاں فزا منڈلاتی پھرتی ہے
شمیمِ روح پرور کا ٹھکانا ہے مکاں میرا
اسی میں بیٹھے بیٹھے میں جہاں کی سیر کرتا ہوں
مری آرام کرسی ہے سمندِ خوش عناں میرا
پہنچتی ہے نظر میری جہاں کے کونے کونے میں
رواں ہوتا ہے جس دم توسنِ طبع رواں میرا
پھروں گا مر کے بھی جوں نکہتِ گل میں اسی گھر میں
مٹائے گی کہاں تک نقش اے بادِ خزاں میرا
مبارک ہو گلوں کو گلستاں فصلِ بہاری میں
مبارک ہو مجھے بستانِ عالم میں مکاں میرا
مری بزمِ تخیّل میں یہیں پریاں اترتی ہیں
جہاں میں دیکھنے آتے ہیں گھر اہلِ جناں میرا
کبھی ہیں جلوہ گر یاں حضرتِ داغ و جنابِ میر
کبھی اقبال ہے بزمِ سخن میں ہم زباں میرا
نظر آتے ہیں گاہے پھول برساتے ہوئے محرومؔ
چہکتا ہے کبھی اس میں سرورِ خوش بیاں میرا
اسی میں گونجتے ہیں روز مرّہ اوم کے نعرے
خدائے پاک کا گھر ہے یہ چھوٹا سا مکاں میرا
نہ لے جانا یہاں سے دوستو شمشان میں مجھ کو

جلایا آتشِ گل سے نہ جسمِ نازِ جاں میرا
میں خود بھی تھا جہاں میں اک گلِ شاداب اے باقی
نہ کیوں ہوتا گلوں کے درمیاں پھر آشیاں میرا

بے سلطنت قوم یا جسمِ بے روح (علامہ سر محمد اقبال)

ہے قوم جسم سلطنت اس میں ہے مثلِ روح — جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے
سعی شغال و گرگ سے جنبش ہوئی اگر — نا فہم سمجھے قوم میں خود انتعاش ہے
البتہ زندگانیِ شخصی کا ہے وجود — قانون میں ہر اک کے لئے زندہ باش ہے
پیمانہائے ساختۂ شاہِ وقت پر — محدود طالبین کی فکرِ معاش ہے
بے علم مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست — اس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے
کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزوِ غیر — یہ مسئلہ صحیح ہے گو دل خراش ہے

اپنی یہ احتیاط کہ بوسے پر اکتفا
اُس پر بھی یہ عتاب کہ تو بد معاش ہے

گوشۂ تنہائی (تلوک چند محروم)

دنیا میں بہت دوڑے — راحت کے تمنائی
تسکیں کی مگر صورت — تجھ میں ہی نظر آئی
اے گوشۂ تنہائی

بچہ نہیں، دل جس کو — لے جایئے میلوں میں

جُز تیرے کہاں راحت ... دُنیا کے جھمیلوں میں
اے گوشۂ تنہائی

خلوت وہ تری جس میں ... ہنگامۂ جلوت ہے
وحدت کا تری غنچہ ... اک گلشنِ کثرت ہے
اے گوشۂ تنہائی

سب عیب و ہنر اپنے ... اے آئینۂ باطن
تجھ بن نظر آجائیں ... یہ بات ہے ناممکن
اے گوشۂ تنہائی

ساماں ہیں بہم تجھ میں ... سب دل کی حضوری کے
محفل میں کہاں تیری ... صدمے کسی مہجوری کے
اے گوشۂ تنہائی

آزار سے بالا ہے ... گو زیرِ زمیں ہے تو
اربابِ قناعت کو ... فردوسِ بریں ہے تو
اے گوشۂ تنہائی

جنگل میں؟ پہاڑوں میں؟ ... تاریک گپھاؤں میں
مرغوب تریں ہے یا ... اشجار کی چھاؤں میں
اے گوشۂ تنہائی

پاتے ہیں جہاں تجھ کو ... دنیا میں ترے شیدا
فی الفور وہیں اُن کے ... دُکھ درد ہیں ناپیدا

اے گوشۂ تنہائی

شاعر کہ مصور ہے فطرت کے نظاروں کا
ذرّوں میں ترے اس کو جلوا ہے ستاروں کا
اے گوشۂ تنہائی

طالب ہیں ترے اکثر جو علم کے طالب ہیں
ممنونِ کرم تیرے مضمون و مطالب ہیں
اے گوشۂ تنہائی

تو مسکنِ دل کش ہے جویائے حقیقت کا
مرکز ہے حقیقت میں پہنائے حقیقت کا
اے گوشۂ تنہائی

بازارِ دو عالم میں جو جنس نہیں ملتی
حیرت ہے کہ انساں کو آکر ہے یہیں ملتی
اے گوشۂ تنہائی

دنیا میں اگر کوئی منزل گہ عقبیٰ ہے
وہ تیری ہی محفل ہے وہ تیرا ہی ملجا ہے
اے گوشۂ تنہائی

ہر ایک تگ و دو کی ہے آخرِ کار-آخر
گر تجھ سے یہاں بھاگے ہے کنجِ مزار آخر
اے گوشۂ تنہائی

خواہاں ہے دل و جاں سے — محروم حزیں تیرا
کاش اس کو دلِ ناداں — ہونے دیں مکیں تیرا
اے گوشۂ تنہائی

سرزمینِ ہند (کلام جے راجپوری)

بتا اے سرزمینِ گلشنِ ہندوستاں تو بھی — کوئی وہ بھی زمانہ تھا کہ تھی رشکِ جناں تو بھی
کوئی دن وہ بھی تھا جب تھیں نگاہیں تجھ پہ عالم کی — کوئی دن وہ بھی تھا جب تھی بہارستانِ جہاں تو بھی
کبھی تجھ پر بھی تھا رنگِ بہارِ گلشنِ جنت — کبھی تھی جلوہ گاہِ گل رخانِ دلستاں تو بھی
کبھی تھے یاد تجھ کو بھی فسانے عیش و عشرت کے — کبھی تھی زیرِ چرخِ فتنہ پرور کامراں تو بھی
تری اک اک ادا میں تھی غضب کی شانِ رعنائی — دلوں کو چھین لیتی تھی برنگِ دلبراں تو بھی
کہاں ہیں وہ ترے دن کیا ہوئیں اب وہ تری راتیں — غضب ہے ہو گئی اک دم میں پامالِ خزاں تو بھی
سناتی ہے برنگِ شمعِ محفل اہلِ دانش کو — زبانِ حال سے رنج و الم کی داستاں تو بھی

پتہ چلتا ہے تجھ سے آسماں کی فتنہ کاری کا
سبق ملتا ہے باغِ دہر کی ناپائداری کا

تمنّا ہے کہ پھر تیرے گلستاں میں بہار آئے — پئے تسکینِ خاطر رحمتِ پروردگار آئے
شمیمِ گل کی ہو پھر از سرِ نو عنبر افشانی — صبا اٹکھیلیاں کرتی ہوئی مستانہ وار آئے
اسی صورت سے ہو پھر ابرِ نیساں کی گہرباری — اسی صورت سے پھر گلشن میں بادِ مشکبار آئے
وہی انداز ہو پھر طائرِ دل کی خوش بیانی کا — وہی قمری کی کوکو ہو وہی صوتِ ہزار آئے
سماں ہو پھر وہی گل پیکروں کی بادہ خواری کا — اسی ڈھب سے چمن میں پھر شرابِ خوشگوار آئے

وہی پہلا سا عالم ہو فلک کی دُر فشانی کا چمن میں پھر وہی شبنم کے قطروں کی پھوار آئے
غرض حاصل ہو تجھ کو پھر تری اگلی دل آویزی کلامِ خستہ جاں کو جس سے کچھ صبر و قرار آئے

تصدّق ہے فدا ہے جان و دل سے تجھ پہ قرباں ہے
ترے اُجڑے چمن کا وہ بھی اک مرغِ خوش الحاں ہے

حالاتِ شعرائے نظمِ لطیف

نمبر ۱۔ مولوی محمد حسین آزاد دہلوی۔ مولد و مسکن دہلی، والد بزرگوار کا نام **محمد باقر** تھا جو شرفاء دہلی میں سے تھے، آزاد کی تعلیم عربی و فارسی زبانوں میں اعلیٰ مدارج تک ہوئی تھی، سنہ ۱۸۵۶ء میں دہلی سے ایک اخبار نکالا جو اُردو کا سب سے پہلا اخبار خیال کیا جاتا ہے، فنِ شعر میں اُستاد ذوق سے استفادہ فرمایا اور شاعری میں ایک جدید روش پیدا کرنے کا خیال سب سے پہلے آزاد کو ہی ہوا چنانچہ موجودہ نیچرل شاعری کے بانی مبانی حضرتِ آزاد ہی تھے، آپ کی تصانیف میں دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال سخندانِ پارس اور آبِ حیات گراں قدر کتابیں ہیں دربارِ اکبری اپنے رنگ میں نایاب اور آبِ حیات اپنے تحقیقی مضامین کے اعتبار سے پہلی چیز ہے، سنہ ۱۸۹۰ء میں حضرت آزاد کی دماغی حالت خراب ہوئی تھی لیکن اس حالت میں بھی دماغ علم و فن کی اُدھیڑبن میں لگا رہا چنانچہ آپ کی ایک تصنیف "سپاک و نماک"، اسی زمانے کی پیداوار ہے، سنہ ۱۹۱۰ء میں آزاد نے بحالتِ جنوں لاہور میں انتقال فرمایا۔

نمبر ۲۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ مولد و مسکن پانی پت تھا، سنہ ۱۸۳۷ء میں تولد ہوئے، والد بزرگوار کا نام خواجہ **ایزد بخش** تھا، جوانی کے عالم میں جناب حالی دہلی چلے آئے، پہلے شیفتہ سے مشورۂ سخن کیا بعدہٗ حضرت غالب کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا، سر سید کی تحریک میں حالی جی جان سے شریک رہے چنانچہ مد و جزرِ اسلام وغیرہ آپ کی نظمیں اُسی زمانے کی یادگار ہیں، حضرتِ آزاد کے قائم کئے ہوئے طرزِ سخن کے بھی حالی زبردست حامی تھے، آپ کی تصانیف میں حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب خصوصیت کی حامل ہیں، آپ کا مقدمہ شعر و شاعری میں اپنے طرز کی یقیناً پہلی چیز ہے

اس سے پہلے اس قسم کے مقدموں کا رواج نہیں تھا حالی نے پیش قدمی کر کے ایک ایسی روش قائم کی جس پر آج تک صدہا مقدموں کی بنیادیں رکھی جا چکی ہیں، ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۴ء میں فوت ہو گیا۔

نمبر ۳ ـ مولوی الطاف احمد صاحب آزاد انصاری ـ نسلاً شیخ انصاری مولد وطن سہارنپور، والد بزرگوار کا اسم گرامی مولوی محمد حسن صاحب تھا، آزاد صاحب کے والد ناگپور میں بطور اوورسیر متعین تھے وہیں ۱۲۸۸ھ ۱۸۷۱ء میں آزاد پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم عربی و فارسی زبانوں میں حاصل کی، مولوی معین الدین صاحب سے سند طبی حاصل کی سنہ ۱۹۰۰ء میں آپ نے دہرہ دون میں مطب کھولا، وہاں سے کانپور آئے اور کچھ روز یہاں بھی طبابت فرمائی کانپور سے منتقل ہو کر پنجاب گئے، کچھ روز علی گڑھ بھی رہے الغرض جہاں گئے وہاں مخلوق خدا کو فائدہ پہونچایا ـ شاعری کا شوق بچپن میں ہی پیدا ہو گیا تھا مختلف علمی صحبتوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور طبیعت میں سلجھاؤ پیدا ہو گیا، آزاد صاحب اس وقت ہندوستان کے مشہور اور مستند شاعر خیال کئے جاتے ہیں، آپ کی قومی نظمیں بڑی دل سوز ہوتی ہیں، آپ کا ہر طرح کا کلام مختلف رسالوں میں برابر شائع ہوا کرتا ہے ـ آپ کا دیوان بنام "معارفِ جمیل" شائع ہو چکا ہے، حضرت آزاد اس وقت حیدرآباد دکن جیسے مبارک مقام پر قیام فرما ہیں۔

نمبر ۴ ـ آشفتہ ـ عبد اللہ نام ـ آشفتہ تخلص ـ باپ کا نام مولوی عبد الحمید حاجی تھے ـ اور سلہٹ کے رہنے والے ـ مولوی عبد الغفور خاں نساخ مؤلف تذکرۂ سخن شعرا کے معاصرین میں تھے ـ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے ۱۲۸۴ھ میں زندہ تھے ـ غزلوں کے سوا اکثر اخلاقی قطعات کہا کرتے تھے ـ کلام میں دل آویزی اور تاثیر پائی جاتی ہے ـ موجودہ زمانے کی شاعری کے

ڈھنگ ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں اسی سے بطور نمونہ نظم لطیف میں ان کا انتخاب مناسب سمجھا گیا تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ اب ۶۰-۷۰ سال قبل بھی یہ مذاق رواج پذیر ہو چکا تھا۔

نمبر ۵ - احسان ابن دانش - احسان الحق نام - احسان تخلص - باپ کا نام دانش علی - دادا اور باپ تک باغپت ضلع میرٹھ وطن رہا مگر ان کی پیدائش کے وقت باپ دادا - قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں سکونت پذیر ہو چکے تھے - ۳۰-۳۲ برس کے جوان العمر آدمی ہیں - ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی کے پرانے مکتبوں میں پائی - بہت کمسنی کے زمانے ہی سے زمانے کے مصائب و آلام میں گرفتار ہو گئے تنگی و عسرت نے کسی باقاعدہ اور منظم تعلیم کا موقع نہیں ملنے دیا - ان کے ابتدائی واقعات بہت دردناک ہیں - اپنی اور اپنے والدین کی گزر اوقات کے لئے انھوں نے بے تکلف سن شعور کا زمانہ مختلف مزدوریوں میں گزارا - اور اس طرح عامیانہ معاش حاصل کرنے میں کبھی رواجی شرم کی پروا نہیں کی - اکل حلال کے جو اسلامی طریقے مذہب نے بتائے ہیں ہمیشہ ان کو اپنا شعار بنایا اور الکاسب حبیب اللہ کے ماتحت بر سر کار رہے - اسی زمانہ کشمکش میں سن شعور کے پہنچتے پہنچتے شعر و شاعری کا شوق ہوا - اور مطالعہ کتب سے اپنے اس ذوق کو روز افزوں ترقی دیتے رہے چونکہ مصائب عالم اور دنیا کے اتار چڑھاؤ بذات خود بلا واسطہ مطالعہ اور تجربہ کیا تھا اس لئے ان کی شاعری کا بڑا عنصر مایہ مزدور اور سرمایہ دار کی داستانیں ہیں - اس موضوع کو جس تنوع اور رنگا رنگی سے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے اور اس خصلت میں ان کی عام اہل سخن سے حیثیت مخصوص ہوئی ہے - ان کا تخلص بھی اپنی نوعیت میں ایسی نوعیت رکھتا ہے جو کم سے کم اردو شعرا میں انھیں کا حصہ ہے - یعنی اپنے تخلص کے ساتھ اپنے والد یا جد کا

نام بھی اس طرح مدغم کر دیا ہے کہ بغیر احسان دانش کہے ہوئے ان کا تعارف نہیں ہو سکتا ان کی شاعری بہت دل پسند اور ان کے پڑھنے کا طریقہ حد درجہ دل کش ہوتا ہے۔ قدرت نے ان کو نہایت پُر درد اور پُر سوز آواز عطا کی ہے۔ چیچک کی وجہ سے اگرچہ خوب روئی کی دولت کم رہ گئی ہے مگر خوش گلوئی نے بہت فیاضی کے ساتھ انکو مالامال کر رکھا ہے موجودہ زمانے کے بڑے بڑے مشاعروں میں ان کو برغبت و اصرار طلب کیا جاتا ہے اور ان کی سخن سرائی سے عام و خاص سب محظوظ ہوتے ہیں۔ خلقۃً نہایت منکسر المزاج اور فراخ حوصلہ آدمی ہیں۔ باوجود ناداری و عسرت خودداری کی نعمت نے ان کو ایسا مستغنی بنا دیا ہے کہ معمولی ملاقات اور بات چیت میں کسی طرح ان کا بھرم نہیں کھلنے پاتا۔ ان کی افکار سخن کے چند مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور انھیں میں سے نظم لطیف میں موقع موقع سے اکثر نظمیں منتخب کی گئی ہیں۔ مدت سے اپنے وطن کاندھلے کا قیام ترک کر کے لاہور میں قیام پزیر ہیں اور مختلف ادبی رسائل کی خدمات میں مصروف و منہمک رہتے ہیں۔

نمبر ۶۔ احسن مارہروی۔ سید شاہ علی احسن نام۔ احسن تخلص۔ سادات بلگرام کی ایک شاخ عہد اورنگ زیب سے مارہرہ۔ ضلع ایٹہ میں آباد ہے جس کے جد الاجداد حضرت سید شاہ برکت اللہ رح عشقی تھے اسی خاندان کے ایک رکن احسن مارہروی تھے۔ ۱۸۷۶ء (۱۲۹۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ عربی اور فارسی زبانوں میں تعلیم حاصل کی اور قرآن پاک بھی حفظ کیا۔ ۱۸۹۳ء (۱۳۱۱ھ) میں اپنے والدین کے ساتھ جا کر حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں نواب فصیح الملک مرزا داغ سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا۔ پھر ۱۸۹۵ء میں خدمت استاد کے شوق میں حیدر آباد دکن گئے وہاں چند سال شبانہ روز استاد کی خدمت میں رہے۔ حیدر آباد جانے سے پہلے غزلوں کا ایک گلدستہ ریاض سخن اور

ریاض خلیل کے نام سے کئی سال تک نکالتے رہے جس میں حضور نظام دکن آصفجاہ سادس اور نواب ابراہیم علی خاں صاحب والی ٹونک کی تصویریں بھی شائع ہوئیں مرزا داغ کے انتقال کے بعد ۱۹۰۵ء اُن کی یادگار میں فصیح الملک نامی ماہوار رسالہ لاہور جاکر نکالا جس میں فصیح اللغات کے صفحات بطور ضمیمہ شائع ہوتے رہے اور اس کو بہت پسند کیا گیا۔ یہ رسالہ ۱۹۱۰ء تک مارہرے سے نکلتا رہا۔ اس کے بعد بند ہوگیا۔ غرضکہ ابتدائے عمر سے آخر تک ان کا محبوب مشغلہ ادب و شاعری رہا ولی دکن کا مجموعہ سخن مع سوانح تالیف کیا جس کو انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا۔ ۱۹۲۲ء سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ اُردو کے اُستاد رہے اور ۱۹۳۰ء تک خاص نام آوری کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔ اسی زمانہ میں تاریخ نثر اُردو کے نام سے ایک تالیف شائع کی جو بہت پسند کی گئی اور خدمات اُردو کے سلسلہ میں ایک گراں قدر چیز ہے۔ مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد وطن میں قیام رہا اور دن رات مختلف ادبی خدمات میں مصروف رہے، ملک کے مشہور اُدبا و شعرا میں اُن کا شمار رہا اور سیکڑوں شاگرد اُن سے بذریعہ خط و کتابت مستفید ہوتے رہتے تھے۔۔ اپنے اُستاد مرحوم کے سچے عاشق تھے۔ اُن کی زندگی میں اُن کے سوانح "جلوہ داغ" کے نام سے شائع کئے۔ آخری تالیفات میں "منتخب داغ"، "انتشار داغ"، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ منتخب داغ کا ایک حصہ اُن اشعار کا حامل ہے جس میں فارسی عطف و اضافت کا وجود نہیں ان کے علاوہ ایک تالیف نظم لطیف بھی ہے جس میں اُردو شعرا کے مختصر سوانح حیات مع نمونہ کلام درج ہیں مگر اس کو پورا نہ کر سکے اور ۳۰ اگست ۱۹۴۰ء کو انتقال فرمایا۔

نمبر ۷۔ حکیم احمد شجاع۔ لاہور کے قدیم باشندے ہیں۔ ان کا خاندان

فقیروں کا خاندان مشہور ہے۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ان کے اسلاف وزارت کے عہدے تک پہنچے۔ لاہور کا بازار حکیماں انھیں کے بزرگوں کے نام سے موسوم ہے۔ اس وقت پچاس سال کے قریب عمر ہے۔ ڈراما نویس ہیں۔ رسالہ نونہال اور ہزار داستان ان کی اڈیٹری میں نکلتے تھے۔ اب بند ہیں۔ اسسٹنٹ سکریٹری لیجسلیٹو اسمبلی پنجاب کے عہدے پر فائز ہیں۔ نہایت طباع اور ذہین آدمی ہیں۔ ان کا کلام بہت ستھرا اور نفیس ہوتا ہے۔ غزل بالکل نہیں کہتے۔ قومی اور جدید رنگ کی نظمیں کہتے ہیں اور بہت لطیف کہتے ہیں۔ کوئی تخلص ان کے کلام میں نہیں ہوتا۔

نمبر ۸۔ اختر لکھنوی۔ پرانے زمانے کے شاعر ہیں۔ **محمد صادق خاں** نام۔ اختر تخلص۔ ہگلی (بنگال) کے رہنے والے تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں معزز عہدوں پر فائز رہے۔ فارسی کی اچھی قابلیت تھی تذکرہ آفتاب عالم تاب و شاہد حیدری و دیوان فارسی و ریختہ وغیرہ بہت سی تالیفیں ان کی یادگار ہیں۔ فن شعبدہ میں کمال حاصل تھا اور کیمیاگر بھی مشہور تھے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ۱۲۹۱ھ میں تذکرہ سخن شعرا تالیف کیا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ تھوڑا عرصہ ہوا کہ انھوں نے انتقال کیا۔ ان کی شاعری بہت مزے کی ہوتی تھی مگر غزلوں میں وہی پرانا رنگ ہوتا تھا۔

نمبر ۹۔ اختر جوناگڑھی۔ ریاست جوناگڑھ کے شرفا میں خاندان قضات سے ہیں۔ قاضی **احمد میاں** کے نام سے مشہور ہیں۔ تقریباً چالیس بیالیس سال کی عمر ہے۔ علمی اور ادبی مذاق اچھا اور ستھرا رکھتے ہیں۔ زیادہ تر نثر مضامین لکھا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی نظم بھی لکھتے ہیں۔ اور اچھی لکھتے ہیں عصر حاضر کے موقت الشیوع رسالوں میں کہیں کہیں ان کی نظمیں دیکھی جاتی ہیں انھیں سے انتخاب کیا گیا۔

نمبر ۱۰۔ اختر حیدرآبادی۔ سید علی اختر نام۔ سید **کاظم علی**۔

باغ کے بیٹے ہیں۔ بہت طبّاع اور سیر نویس شاعر ہیں۔ کلام میں پختگی پائی جاتی ہے اور حتی الوسع فنی غلطیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ مشہور رسالوں میں اکثر اور بیشتر ان کی نظمیں مختلف موضوعوں پر چھپتی رہتی ہیں۔ ان کے والد ماجد حیدرآباد دکن میں ٹھیکہ داری کا مشغلہ رکھتے ہیں اسی سلسلہ میں اختر بھی وہیں قیام پذیر ہیں۔ اس زمانے کے نوجوان اور ہونہار اور مقبول شاعر ہیں۔ اپنی نظموں میں اپنا کوئی تخلص ظاہر نہیں کرتے۔

نمبر ۱۱۔ ادیب۔ مسٹر **گوبرسن لال**۔ ادیب۔ ایم۔ اے سنہ ۱۹۰۳ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ منشی گوپی ناتھ نائب ایڈیٹر تیج کے چھوٹے بھائی ہیں۔ والد ماجد کا نام **مہادیو پرشاد** ادیب نہایت خوش گو اور سنجیدہ شاعر ہیں۔ ان کا کلام قوم پرستی کے جذبات میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں زندان فرنگ بھی آباد کر چکے ہیں۔ سادگی اور حق پرستی کے اصول پر کاربند ہیں۔ ہندی۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ آجکل کھاتولی ضلع مظفرنگر کے کسی مدرسے میں ہیڈ ماسٹر ہیں اور گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

نمبر ۱۲۔ ادیب۔ عبدالرؤف نام۔ سہارنپور کے رہنے والے ہیں کلام موجودہ زمانے کی روش پر ہے۔ روانی اور سنجیدگی ان کا روزمرہ ہے اور اچھا کہتے ہیں۔

نمبر ۱۳۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی وہ مشہور و معروف ہستی ہے کہ ارباب ادب اور اصحاب علم سے گزر کر اسکول اور مکتبوں کے بچے بچے کی زبان پر اُن کا نام دوران کا کلام موجود ہے۔ اس لئے ان کے تبصرۂ سخن سے زیادہ یہاں ان کے تھوڑے سے حالات قلم بند کئے جاتے ہیں۔ موصوف ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے اُن کا وطن مالوف میرٹھ ہے وہ ابتدائے عمر ہی سے دائرہ تعلم و تعلیم

میں شامل ہو گئے اور اسی کاروبار میں آخر عمر تک مصروف و مشغول رہے۔
اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد جب فارسی و عربی میں متوسط قابلیت پیدا کرلی تو چودہ برس کی عمر میں میرٹھ کے نارمل اسکول سے متعلق ہوے اور اُس وقت کی شرائط ملازمت کے مطابق اسکول ماسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اور تعلیم کے علاوہ طبیعات (فزکس) علم ہیئت (اسٹرانومی) حساب الجبرا۔ وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ۱۶-۱۷ برس کی عمر میں وہ میرٹھ کے انسپکٹر جنرل مدارس کے محکمہ میں بطور کلارک ملازم ہوے اور پھر ترقی کر کے معمولی ماسٹر اور پھر ہیڈ ماسٹر (ہیڈ مولوی) ہو گئے۔
مولوی محمد اسمٰعیل اپنے عہد کے مشاہیر ادباء میں تھے، مولانا آزاد اور حالی کے زمانے ہی سے ان کی شاعری فروغ پذیر ہو چکی تھی۔ اور اس خصوص میں انکی خدمات اس قدر مقبول و معروف ہیں کہ شعبۂ ادب میں عام و خاص ان کے کمالات سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ ابتداءً آپ نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر ابتدائی شوق کے بعد عموماً آپ نیچرل نظمیں کہا کرتے تھے اور اسکولوں کے نصاب میں بکثرت آپ کی منظومات شامل ہیں۔ آپ نے انگریزی نظموں کا بھی ترجمہ اکثر کیا ہے اور دوسرے مفید عنوانوں پر بھی سخن سرائی کی ہے۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی ادبی تالیفات موجود ہیں۔ مثلاً سواد اردو۔ کمک اُردو۔ تزک اردو اور سفینۂ اُردو وغیرہ آپ کی نظموں میں بخصوصیت روانی۔ صفائی۔ پختگی اور فن کی پابندی بحد کمال پائی جاتی ہے پچھتر برس کی عمر پاکر یکم نومبر ۱۹۱۷ء میں بمقام میرٹھ انتقال کیا۔ مجموعۂ کلام شائع ہو گیا ہے۔

نمبر ۱۳۰- اسد ملتانی۔ محمد اسد خاں نام۔ والد کا اسم گرامی خان غلام قادر خاں۔ قوم افغان شیرانی۔ آبا و اجداد مدت دراز سے ملتان میں اقامت پذیر رہے ہیں۔

پیدائش دسمبر ۱۹۰۲ء بمقام کرڑی افغانان۔ ملتان شہر۔
پہلے مشن اسکول ملتان، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ دورانِ تعلیم میں ریاضیات۔ سائنس اور ادبیات سے خاص دلچسپی رہی۔ ۱۹۲۶ء میں امتحان کی مقابلہ میں کامیاب ہوکر گورنمنٹ آف انڈیا سکریٹریٹ میں ملازمت ہوئی۔ اس وقت پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹی کا عہدہ حاصل ہے۔ اسی سلسلے میں دہلی اور شملے میں قیام رہتا ہے۔

شعر و شاعری کا آغاز نو دس برس کی عمر سے ہوا گھر میں جو کہانیاں سنی جاتیں انکو نظم کرنے کی کوشش رہتی۔ وقتاً فوقتاً متفرق اشعار بھی موزوں ہوتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں آب حیات کے مطالعے نے فطری شوق کی آگ کو اور بھڑکایا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں ہر سال منظومات کا انعامی مقابلہ ہوا کرتا تھا علامۂ اقبال نے ہر بار اول انعام کا انھیں کو مستحق قرار دیا۔ ۱۹۲۱ء کی انعامی نظم "شبنم کا قطرہ" پر موصوف نے بہت پسندیدگی کا اظہار کیا اور خلاف اپنے قلم سے اُس میں اصلاح بھی فرمائی۔ اُردو اور فارسی کلام ملک کے اکثر جرائد و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے بعض فارسی نظمیں افغانستان کے جرائد میں بھی شائع ہوئیں۔ زیادہ کلام معارف اعظم گڑھ اور طلوع اسلام میں نکلتا رہتا ہے۔ مجموعۂ کلام ابھی شائع نہیں ہوا۔

شملے میں بزم اُردو قائم کی تھی جس کے اہتمام میں ۱۹۳۴ء سے شاندار مشاعرے ہوتے ہیں۔ اسد صاحب ۳-۴ سال تک اس بزم کے سکریٹری رہے۔ ان کا کلام نہایت دل آویز اور دلکش اور بہت صاف صاف ہوتا ہے۔ آسمان شاعری پر ان کا مستقبل تابندہ نظر آتا ہے۔

نمبر ۵۱ - اصغر گونڈوی۔ اصغر حسین نام۔ ۱۸۸۴ء (۱۳۰۲ھ) میں بمقام گونڈا

پیدا ہوئے، ابتدائی نشو ونما بھی گونڈے میں ہوئی۔ آپ کی شاعری تمام تر ذاتی توجہ اور شوق کا نتیجہ ہے۔ زمانے کے رواج کے مطابق کسی مشہور استاد کی شاگردی سے وابستہ نہیں ہوئے۔

آپ کا ایک مختصر دیوان "نشاطِ روح" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ شروع میں چشمے کی تجارت کرتے تھے۔ کچھ عرصہ انڈین پریس الہ آباد کے شعبہ اُردو سے متعلق رہے۔ ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں لٹریری اسسٹنٹ تھے اور رسالہ ہندوستانی آپ کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اصغر کی شاعری بعض خصوصیات کی بنا پر پسند کی جاتی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا۔

نمبر ۱۶۔ حامد اللہ افسر میرٹھی۔ میرٹھ کے مفتیوں کے خاندان سے آپ کا تعلق ہے، موجودہ دور کے ایک نوجوان اور کامیاب شاعر ہیں، آپ کی تعلیم بی۔ اے تک ہوئی ہے، شروع میں وکالت کے امتحان کی تیاری کی لیکن طبیعت کو اس سے لگاؤ پیدا نہ ہو سکا، اس خیال کو ترک کر کے تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کی اس وقت تک متعدد تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

افسر صاحب کی شاعری زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہے، آپ کے خیالات اور اسلوب بیان سادہ و موثر ہوتے ہیں، افسر کا شمار شعراء کے اس گروہ سے ہے جو قدیم رسمی شاعری خصوصاً تغزل کے خلاف سخت بغاوت پر کمر بستہ ہے، جدید موضوعات کو سادہ و صاف رنگ میں پیش کرنا اُن کا کام ہے، قدماء کے نظامِ عروض کی پابندی میں شاعری متصور نہیں کرتے بلکہ افسر نئے نظام کے حامی ہیں۔ ان کی سادہ نگاری نظموں میں نثر کا انداز پیدا کر دیتی ہے، اُن کی شاعری سے اُردو زبان کی شاعری کے آئندہ رجحانات کا اندازہ ممکن ہے، افسر کی نظمیں وطن پرستی کے جذبات سے مملو

ہوتی ہیں اور یقیناً ملک کی فرقہ دارانہ ذہنیتوں پر مفید اثر ڈال سکتی ہیں۔

جناب افسر لکھنو جوبلی کالج میں اُردو کے اُستاد ہیں، آپ کا دیوان "پیام روح" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

نمبر ۱۷۔ شیخ محمد اقبال ایم۔اے۔ آپ کی ولادت ۱۸۷۶ء میں ہوئی وطن مالوف سیال کوٹ تھا، لاہور کالج میں تعلیم پائی اور ایم۔اے کیا، ابتدائی تعلیم کچھ دنوں کے لئے آپ نے مکتب میں پائی پھر مدرسہ میں داخل ہوئے، ابتداء سے انتہا تک تمام تعلیمی مدارج نمایاں طور سے طے کئے، ایم۔اے کرنے کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ اور سیاست مدن کے مضامین پر لکچر دینے کے لئے مقرر ہوئے اس کے بعد گورنمنٹ کالج میں فلسفہ و انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے، علمی مشاغل آپ کی زندگی کا جزو ضروری تھے، تحقیقات علمی اور شوق فن جب حد سے سوا ہوا تو فلسفہ قانون اور تحقیقاتِ علم کے لئے ولایت کا سفر اختیار کیا اور کامل تین سال وہاں رہ کر کیمبرج یونی ورسٹی سے فلسفہ اخلاق کی ڈگری حاصل فرمائی، جرمنی کی میونک یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری اول درجے میں حاصل کی اسی سلسلے میں آپ نے کتاب "فلسفہ ایران" لکھی تھی۔ جرمنی سے واپس ہوکر لندن میں اسکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخلہ لیا وہاں کے سائنس دانوں، علماء، فضلا اور حکما سے استفادہ حاصل کیا اور امتحان بھی کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ ان تمام اسناد کے حصول کے بعد چھ ماہ تک لندن یونی ورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے آپ عربی کے پروفیسر رہے۔

اقبال کی شخصیت سے بہت سی خصوصیات وابستہ رہی ہیں، صرف ۳۲-۳۳ سال کی عمر میں اتنے علمی اعزاز اسقدر ڈگریاں اور فارسی و عربی۔ سنسکرت کے علاوہ یورپ کی کئی زبانوں میں ماہر ہونا اور مقبولیت خاص و شہرت عام حاصل کر لینا معمولی تربیت و دماغ کا

کام نہیں ہے، اقبال کی صحیح معنوں میں عزت یورپ نے کی، ہندوستان میں اگر وہ شاعر اسلام کہا گیا تو یورپ نے اس کے علمی تبحر و درک کے ماتحت شاعر مشرق کا خطاب دیا۔

اقبال جس زمانہ میں ایف اے کلاس میں تعلیم پاتے تھے، شاعری اسی زمانہ میں شروع ہوئی اور خداداد طبیعت نے بہت تھوڑی مدت میں وہ جلا پیدا کی کہ ذرہ آفتاب بن کر چمکا اور ایسا چمکا کہ ایک عالم کو طرز جدید کی شاعری سے منور کر دیا۔ اقبال نے ابتدا ر شاعری میں جہاں استاد حضرت داغ سے اصلاح لی، طبیعت سلجھی ہوئی اور طبع رواں تھی اس لئے داغ کے بعد تمام عمر کسی سے اصلاح نہیں لی، آپ کے ابتدائی کلام میں زیادہ تر غزلیں ہی ملتی ہیں لیکن بہت جلد اس قید سے آزاد ہو کر آپ نے اپنا ایک مخصوص راستہ بنا لیا جس پر تمام عمر قائم رہے، اقبال کی روش شاعری میں اتنی پختہ ثابت ہوئی کہ آج ہر شاعر اپنی شاعری آپ ہی کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوششوں میں نظر آتا ہے۔

اقبال کی قبولیت عامہ کا یہ عالم ہے کہ اُن کی زندگی ہی میں ان کے سوانح حیات انگریزی و اُردو میں متعدد اشخاص کے ذریعہ منظر عام پر آچکے ہیں۔ بڑے بڑے اہل علم و اہل دماغ اصحاب نے اقبال کے شاعرانہ کمالات پر تبصرے کئے اُن کی شان میں اُن کی زندگی ہی میں ہم عصر شعرا نے قصائد کہے اور واقعات و حقائق کے اظہار میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ بہر حال اقبال ہندوستان کا ایک ایسا شاعر ہے جس پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود ہمیشہ کچھ نہ کچھ اور لکھا جا سکتا ہے۔

اقبال کی تصانیف میں ۸-۹ کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں جن میں علم الاقتصاد "فلسفۂ ایران" کے علاوہ اسرار بے خودی - رموز بے خودی - بانگ درا - پیام مشرق زبور عجم وغیرہ اُن کے فارسی و اُردو کے کلام پر مشتمل ہیں، ملک و قوم کے اس زبردست حکمت شاعر نے ۱۹۳۸ء میں انتقال فرمایا۔

نمبر ۱۸۔ سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی - ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء مطابق شوال المکرم ۱۲۶۱ء میں بہ مقام موضع بارہ تولد ہوئے، بارہ الہ آباد سے ۱۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے ان کے والد کا اسم گرامی سید تفضل حسین عرف چھوٹے میاں تھا جو نائب تحصیلدار تھے، حضرت اکبر کے مورث اعلیٰ طہران سے آئے تھے، اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی عربی و فارسی درسیات کی کتابیں اپنے باپ اور مختلف مولویوں سے پڑھیں۔ ۱۸۵۵ء میں جمنا مشن اسکول میں انگریزی پڑھنے کے لئے داخل ہوئے تین سال تک اسکول میں تعلیم کا سلسلہ رہا۔ انگریزی کی قابلیت آپ نے خود بڑھائی۔

حضرت اکبر غیر معمولی ذہن و دماغ کے انسان تھے، کہا جاتا ہے کہ آپ نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں درسی تعلیم ختم کر لی تھی اور اسی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ قصبہ کڑا ضلع فتح پور میں ایک صاحب مولوی وحیدالدین وحید بڑے فاضل بزرگ گزرے ہیں حضرت اکبر نے پہلے پہل انھیں کے آگے زانوئے تلمذ طے فرمایا، حضرت وحید کی شاگردی پر آپ کو بڑا ناز تھا اور ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت اکبر کے معاشی حالات اور ایک معمولی ملازمت سے ججی تک پہنچنے کے واقعات نہایت حیرت ناک ہیں، جن کی تفصیل مختلف تذکروں میں موجود ہے، یہاں مختصراً اتنا معلوم کر لیجیے کہ حضرت اکبر نے ۲۰ روپیہ کی ایک معمولی ریلوے کی ملازمت سے درجہ بدرجہ محکمہ بہ محکمہ ترقی کر کے صرف اپنی ذاتی قابلیت و محنت اور جودت طبع سے ججی کا عہدہ حاصل فرمایا تھا اور بیس روپیہ کی معمولی تنخواہ سے شروع کر کے ۱۲ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پا کر ریٹائر ہوئے۔

اکبر کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف بہت کچھ ہو چکا ہے، آپ کی شاعری کچھ ایسی خصوصیات کی حامل ہے کہ چھوٹا ہو یا بڑا، ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، معمولی پڑھا لکھا ہو یا عالم و فاضل آپ کے کلام کو دل سے پسند کرتا ہے، اپنے خاص رنگ کے علاوہ عاشقانہ

رنگ کے اشعار میں بھی اکبر کی طبیعت جدت و خوبی پیدا کئے بغیر نہیں رہی، پولیٹکل اور سوشل معاملات پر آپ نے جو خیال آرائیاں کی ہیں نہایت متین اور صائب متصور کی جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اکبر کا کلام پسندیدہ خاص و عام ہے۔ آپ کے مجموعۂ کلام سے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں، مختلف کتب بطور سوانح حیات منظر عام پر آ چکی ہیں، آپ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر سال ملک کے مختلف رسائل و جرائد آپ کے شاعرانہ محاسن پر اظہار خیال اور آپ کے حالات میں ذکر و اذکار کرتے رہتے ہیں۔ آخر عمر میں حضرت اکبر آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے، آپریشن سے کچھ افاقہ ہو گیا تھا لیکن کثرت مطالعہ کی بناء پر آئے دن امراض چشم میں مبتلا رہا کرتے تھے۔

۲ر ستمبر ۱۹۲۱ء میں حضرت اکبر نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

نمبر ۱۹۔ مرزا محمد رفیع سودا ۔ دنیائے شاعری میں حضرت سودا بھی اب کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں، اپنے وقت کے استاد گزرے ہیں۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد شفیع تھا، اصل وطن کابل تھا، ان کے اجداد نے ترک سکونت فرما کر دہلی میں قیام فرمایا اور یہیں حضرت سودا تولد ہوئے۔ ایام شباب میں لکھنؤ تشریف لے جا کر آصف الدولہ کے مقربین میں منسلک ہوئے اور ملک الشعرا کا خطاب پایا، آپ کا تمام کلام زیور اشاعت سے مزین ہو چکا ہے علاوہ اس کے بعض مستقل رسائل بھی آپ سے متعلق ابھی حال میں شائع ہو چکے ہیں، ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں انتقال فرمایا۔

نمبر ۲۰۔ منشی کرامت علی صاحب شہیدی ۔ والد کا نام مولوی عبدالرسول خاں تھا۔ مولوی عبدالغفور صاحب نساخ نے ان کو لکھنؤ کا باشندہ بتایا ہے لیکن شہیدی امروہہ ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ مصحفی اور نصیر دہلوی سے استفادہ سخن فرمایا تھا۔ آپ نے ہمیشہ آزادانہ سیر و سیاحت میں زندگی بسر کی، بیشتر پنجاب، گجرات، رامپور، بریلی، بھوپال اور دہلی رہے، لکھنؤ میں بھی کچھ روز

رہے تھے، ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں سفر حجاز کیا، بعد ادائے فریضۂ حج بیت اللہ روانہ مدینہ منورہ ہوئے، راہ میں بیمار ہوگئے ۲ر صفر ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) کو جب مدینہ منورہ پہنچے روضۂ مبارک کو دیکھ کر جوش اشتیاق میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

نمبر ۲۱- میر تقی میر اکبرآبادی - والد کا نام میر عبداللہ تھا، بارہویں صدی ہجری کے ربیع اول کے بعد آگرے میں تولد ہوئے، عنفوان شباب میں دہلی آگئے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ گئے میر کی اردو شاعری مسلم الثبوت شاعری ہے جس کے لئے متفق اللفظ ساری دنیا ناسخ کی ہم زبان ہے۔ یعنی آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں ہوئے ہیں، آپ کے کلام کا مجموعہ ۶ اردو دیوان ایک فارسی دیوان، متعدد قصاید اور مثنویات پر مشتمل ہے نظم کے علاوہ نثر میں بھی ایک تذکرۃ الشعراء اور ایک تذکرۂ میر وغیرہ بھی ان کی یادگاریں ہیں بمقام لکھنؤ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں وفات پائی۔

نمبر ۲۲- شیخ محمد ابراہیم ذوق - والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) میں بمقام دہلی تولد ہوئے، حافظ غلام رسول صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، حافظ صاحب شاعر بھی تھے، استاد کے مذاق نے ان پر بڑا اثر کیا چنانچہ ذوق کی طبیعت میں شعریت زمانۂ طالب علمی سے ہی پیدا ہو چلی، جو عمر کے ساتھ ساتھ روز افزوں ترقی کرتی رہی۔ ابتداءً شاہ نصیر دہلوی سے استفادۂ سخن فرمایا مگر کچھ دنوں بعد ان سے بگڑ گئی۔ آپ کے کمالات کا جب عام شہرہ ہوا تو بہادر شاہ ظفر بھی آپ کے شاگرد ہوئے، بادشاہ کی شاگردی نے جناب ذوق کو وہ شرف بخشا کہ آج تک یہ دنیائے شاعری میں استاد ذوق کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، ذوق کے شاگردوں میں محمد حسین آزاد کو خاص درجہ حاصل ہے انھوں نے اپنی مشہور کتاب آب حیات میں اپنے استاد کے کمالات کی پوری پوری وضاحت کر کے خاص سعادت حاصل کی ہے، جناب ذوق نے ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں انتقال فرمایا۔

نمبر ۲۳۳- نواب مصطفےٰ خانصاحب شیفتہ- آپ کے والد کا نام سرفراز الملک جناب مرتضیٰ خاں تھا، دہلی کے رہنے والے اور جہاں گیرآباد ضلع بلند شہر کے جاگیردار تھے، حضرت شیفتہ نواب ولی داد خاں بنگش کی اولاد میں سے تھے، ۱۸۰۶ء میں آپ دہلی میں پیدا ہوئے، مشہور معلمین اور کاملین سے فارسی وعربی پڑھی۔ شاعری کا مذاق فطری تھا اور اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے چنانچہ آپ کا دیوان اور واقعات شیفتہ بہ زبان فارسی و اُردو شائع ہو چکا ہے۔ فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔

شاعری میں پہلے حکیم مومن خاں مومن سے مشورہ کیا، اُن کی وفات کے بعد حضرت غالب سے رجوع ہوئے، ۱۸۳۵ء میں آپ نے ایک تذکرہ گلشن بے خار کے نام سے مرتب کیا، جو بڑی حد تک تذکرہ آب حیات کا جواب ہے، آپ شاعری میں شیفتہ اور حسرتی تخلص فرماتے تھے، آخر الذکر تخلص فارسی شاعری کے لئے مخصوص تھا۔ ۱۸۶۹ء ۱۲۸۶ھ میں انتقال فرمایا۔

نمبر ۲۳۴- مولانا علی نقی صفی لکھنوی- آپ سادات زیدیہ میں سے تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید نور الدین شاہ بہ عہد سلطان التمش غزنی سے آکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے، حضرت صفی کے پردادا سید احسان علی صاحب جاٹوں کے مظالم سے تنگ آکر فیض آباد (اودھ) چلے آئے اس کے بعد صفی کے دادا نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے زمانے میں فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار فرمالی۔

مولانا صفی ۲ر جنوری ۱۸۶۲ء مطابق یکم رجب ۱۲۷۸ھ بروز جمعہ بمقام لکھنؤ تولد ہوئے ابتدائی تعلیم عربی وفارسی درسیات کی حاصل کی اُس کے بعد حسب رواج زمانہ انگریزی پڑھی، بعد اختتام تعلیم حضرت صفی نے ملازمت اختیار کی اور محکمہ دیوانی

میں مختلف عہدوں پر فائز رہ کر ۱۹۲۳ء میں پنشن لے لی اور خانہ نشین ہو گئے۔ مولانا صفی کی ذات گرامی اُن لوگوں میں شمار ہے جنھوں نے لکھنؤ کی شاعری کو نیا رنگ دے کر اس کے دامن سے عام شکوک کو دھو دیا اور ایک کارآمد و پاکیزہ جامہ پہنا کر پیش کیا۔ آپ نہ صرف لکھنؤ کے خاص شعراء میں شمار تھے بلکہ ملک کے مقتدر اور واقعت کار شعراء کی صف اول میں آپ کا شمار تھا، پہلے آپ کا رجحان غزل کی طرف رہا لیکن بعد میں جدید رنگ شعر سے بھی متاثر ہوئے اور آخر عمر تک صفی کا رجحان کلی طور سے قومیت و اخلاق کی طرف رہا۔ مولانا صفی لکھنؤ کے شعراء میں امام متصور کیے گئے ہیں، آپ کا بھی حال میں انتقال ہوا ہے۔

نمبر ۲۵۔ عبدالباری آسی۔ ضلع میرٹھ میں ایک قصبہ اُلدن نامی ہے، جناب آسی کا مولد و مسکن یہی شرفا کی بستی ہے، سن ولادت ۱۸۹۳ء ہے، فارسی زبان سبقاً سبقاً حافظ برکت علی مرحوم سے پڑھی۔ سید سراج احمد صاحب سے عربی زبان کی تحصیل فرمائی۔ شعر و شاعری کا ذوق ۱۹۰۶ء سے شروع ہوا، زیادہ تر غزل فرماتے ہیں، کبھی کبھی اخلاقی نظمیں بھی کہتے ہیں آپ بحیثیت شاعر اس دور کے مخصوص شعراء میں سے ہیں۔ اکثر کتب نثر اُردو کی بھی تصنیف فرما کر شائع کی ہیں، عرصہ سے مطبع نول کشور میں ادبی معاون کی حیثیت سے خدمات دے رہے ہیں۔

نمبر ۲۶۔ مرزا اسداللہ خاں غالب۔ دنیائے شاعری میں مرزا غالب وہ پہلے شاعر ہیں جن کے شاعرانہ محاسن و معائب کی ملک و قوم نے پوری پوری وضاحت کی ہے، مرزا کی شہرت و ہر دل عزیزی اُن کی حیات میں جس قدر مایوس کن تھی وہی شہرت و ہر دل عزیزی آج اُن کی وفات کے بعد انتہا کو پہنچ چکی ہے اور ایک تھوڑی مدت میں ان کے متعلق متعدد مستقل کتابیں اور صدہا مختصر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مرزا کے والد کا اسم گرامی عبداللہ بیگ تھا، مرزا کا مولد اکبرآباد اور مسکن دہلی تھا، سنہ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ۷۳ سال زندہ رہکر سنہ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔

نمبر ۲۷۔ مولوی سید علی محمد شاد عظیم آبادی ۔ ۱۹ محرم الحرام سنہ ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء کو عظیم آباد میں پیدا ہوئے، فارسی و عربی میں کامل استعداد تھی پنگل یعنی ہندی عروض سے بھی واقف تھے، آپ نے اپنے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے چند ہزار زیادہ بتائی تھی، تصانیف میں تاریخ صوبہ بہار، مردم دیدہ مشہور ہیں، ایک کتاب موسومہ "فکر بلیغ" بھی ترتیب دی تھی جس میں بعض مشہور مرثیہ گو شعرا کے حالات اور کلام پیش کر کے آپ نے نقد و تبصرہ فرمایا تھا، شاعری میں آپ بذاتِ خود بہت بلند درجہ ہیں، فن تغزل پر پورا پورا عبور تھا اور اس اعتبار سے اپنے دور کے مستند و مکمل شاعر تھے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا۔

نمبر ۲۸۔ مولوی احمد علی شوق قدوائی ۔ ان کے والد کا نام شیخ اسد علی قدوائی تھا، قصبہ جگور ضلع بارہ بنکی میں سنہ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم بدایوں اور رامپور میں ہوئی، فن شاعری میں حضرت امیر کے شاگرد تھے۔ آپ کی شاعری اعلیٰ جذبات سے مملو ہے، سادگی و بے تکلفی آپ کی شاعری کے خاص جوہر ہیں مختلف النوع محاورات کو اپنے اشعار میں کھپانے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے لکھنؤ سے ایک اخبار بنام آزاد بھی جاری فرمایا، پرتاب گڑھ اور بھوپال میں بھی ملازم رہے، آپ کے کلام میں مثنوی ترانۂ شوق اور دیوان غزلیات وغیرہ طبع ہو چکے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۸ء انتقال کیا۔

نمبر ۲۹۔ مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی ۔ لکھنؤ کے رہنے والے اور خاندان سادات سے طباطبائی اولاد میں سے ہیں سنہ ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے

مختلف مشرقی علوم میں مہارت حاصل ہے، فن شعر میں محقق متصور کئے جاتے ہیں سب سے پہلے کلکتے میں واجد علی شاہ کے شہزادوں کو عربی تعلیم دینے کے لئے مقرر ہوئے سنہ ۱۸۸۱ء میں حیدرآباد دکن چلے گئے جہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے، نظام کالج میں عربی کے پروفیسر بھی رہے، غزلیات کے علاوہ نظمیں بھی خوب لکھی ہیں۔

نمبر ۳۰- مولوی سید محمد بے نظیر شاہ وارثی۔ سنہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں تولد ہوئے، عربی و فارسی میں خاص دخل ہے، انگریزی بھی جانتے ہیں، طب میں بھی درخور ہے اور اس سلسلے میں جدید نباتات کی تحقیق کا خاص شوق ہے، اصل وطن کڑا مانک پور ضلع الہ آباد ہے۔ مدت تک حیدرآباد بھی رہے ہیں، غزل میں وحید اللہ الہ آبادی سے اور قصائد و مثنویات میں منشی امیر احمد امیر مینائی سے اصلاح لی۔

نمبر ۳۱- جناب شوکت علی فانی بدایونی۔ سنہ ۱۸۷۹ء میں بمقام بدایوں پیدا ہوئے، بریلی کالج سے بی۔اے اور سنہ ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ سے ایل ایل۔بی کیا۔ کئی سال تک لکھنؤ میں وکالت کی، شاعری کا شغل بھی رہا، اس دور کے اچھے شاعر خیال کئے جاتے ہیں، مختصر سا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے، فانی کی شاعری کا ایک مخصوص رنگ ہے جو خاص و عام میں مقبول و مشہور ہے۔ کچھ عرصے سے حیدرآباد دکن میں قیام ہے۔

نمبر ۳۲- مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ مرزا محمد علی کے صاحبزادہ تھے، ایک مقتدر خاندان سے تعلق تھا، سنہ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں لکھنؤ میں ہی پیدا ہوئے، فارسی و عربی زبانوں میں ذی استعداد تھے اور ہر دو زبان میں فکر سخن فرماتے تھے، آپ کا کلام حقیقی جذبات کا ترجمان ہے، آخری دور کے لکھنوی شعراء میں عزیز کا درجہ سب سے ممتاز ہے، آپ کا دیوان بنام "گلکدہ" شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکا ہے، امین آباد ہائی اسکول میں عرصے تک بطور مدرس فائز رہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا۔

نمبر۳۳۔ چودھری خوشی محمد خاں ناظر۔ والد کا نام چودھری موسیٰ داد خاں تھا۔ ہریا والا ضلع گجرانوالا میں پیدا ہوئے جو آپ کا وطن ہے، سنہ ولادت سنہ ۱۸۷۲ء / ۱۲۹۰ھ ہے، تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی اور سنہ ۱۸۹۳ء میں بی۔اے کیا، زمانۂ طالب علمی سے شعر گوئی کا شوق تھا، خواجہ حالی سے استفادہ سخن فرمایا، غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظموں کا بھی شوق ہے، آپ کی نظمیں بلندی فکر کا نمونہ ہوتی ہیں، ریاست کشمیر میں بطور گورنر فائز ہیں۔

نمبر۳۴۔ مرزا ذاکر حسین ثاقب۔ ۲؍جنوری سنہ ۱۸۶۹ء / ۱۲۸۵ھ کو اکبر آباد میں تولد ہوئے، تعلیم و تربیت لکھنؤ میں پائی، والد کا نام محمد عسکری تھا۔ پرانے شعرا میں آپ کا درجہ استادوں میں ہے، زیادہ تر غزل پر توجہ فرماتے ہیں۔ آپ کا دیوان بڑے اہتمام سے سنہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔

نمبر۳۵۔ خواجہ دل محمد صاحب دل۔ خواجہ نظام الدین کے صاحبزادہ ہیں، مولد و مسکن لاہور ۹؍فروری سنہ ۱۸۸۷ء میں آپ تولد ہوئے سنہ ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کیا، اور اسلامیہ کالج میں بطور پروفیسر ریاضی مقرر ہوئے، غزل کم کہتے ہیں نیچرل مضامین اور قومی نظموں پر خاص توجہ ہے، آپ کا کلام اکثر رسائل میں شائع ہوا کرتا ہے۔

نمبر۳۶۔ شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی۔ سنہ ۱۱۶۲ھ میں بمقام پٹنہ پیدا ہوئے۔ نامور شعرائے سلف میں گزرے ہیں۔ میر تقی میر کے خاص شاگردوں میں سے تھے، سنہ ۱۲۲۲ھ تک مختلف مقامات مثلاً کلکتہ، غازی پور، لکھنؤ اور دہلی کی سیاحت فرمائی، سنہ ۱۲۳۱ھ میں آپ کا دیوان شائع ہوا آپ کی تصانیف میں ۶-۷ مثنویاں بھی یادگار ہیں، آپ کو جملہ اصناف سخن پر دسترس تھی سنہ ۱۲۳۸ھ میں بمقام

عظیم آباد فوت ہو گئے۔

نمبر ۳۳۷۔ منشی عبدالمجید سالک۔ آپ بٹالہ ضلع امرت سر کے رہنے والے ہیں، فن شعر میں حیات بخش رسا مرحوم سے استفادہ فرمایا ہے آپ کے مضامین نظم و نثر اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، اس دور کے ممتاز شعراء میں سے ہیں۔

نمبر ۳۳۸۔ مولوی وحیدالدین سلیم۔ پانی پت کے رہنے والے اور مولانا حالی کے قریبی عزیزوں میں سے تھے، فن شعر انھیں سے استفادہ فرمایا تھا، عرصے تک علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر رہے، اس کے بعد اخبار مسلم گزٹ لکھنؤ کو آپ کی ادارت سے فروغ ہوا، آخر زمانے میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے اور وہیں ۱۹۲۸ء میں انتقال فرمایا۔ حیدرآباد میں آپ جامعہ عثمانیہ میں بطور استاذ السنہ مشرقیہ فائز رہے، بڑے محقق اور زبان داں تھے، اردو زبان کے سلسلے میں کافی خدمات انجام دیں۔

نمبر ۳۳۹۔ علامہ شبلی نعمانی۔ ۱۸۵۶ء میں تولد ہوئے، ہندوستان کے مشہور و معروف افراد میں سے ہیں، آپ کا تبحر علمی ضرب المثل ہے، فن تاریخ اور فلسفہ الٰہیات پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے، انشاء پردازی میں دست گاہ کامل حاصل تھی بہت سی معرکۃ الآرا کتابیں آپ کی شائع ہو کر مقبول اہل علم ہو چکی ہیں جن میں الفاروق، المامون، الغزالی، سیرۃ النبی، شعر العجم اور سیرۃ النعمان خاص اہمیت رکھتی ہیں، مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بطور فارسی پروفیسر بھی فائز رہے اور سر سید مرحوم آپ کے خاص قدردانوں میں سے تھے۔

علامۂ شبلی مرحوم کی ملک و قوم نے پوری پوری قدردانی کی، حضور نظام کے الطاف خسروانہ سے ہمیشہ مالامال رہے ۱۹۱۴ء میں انتقال فرمایا، شاعری میں فارسی اور اردو ہر قسم کا کافی کلام یادگار چھوڑا ہے۔

نمبر ۴۰ - مولوی عاشق حسین صاحب سیماب - آپ شیخ صدیقی حنفی ہیں اور حضرت وارث علی شاہ سے شرف بیعت حاصل ہے، آپ کے مورث اعلیٰ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آئے اور متھرا کے بعد آگرہ میں سکونت اختیار کر لی، آپ کے والد کا اسم گرامی مولوی محمد حسین صاحب تھا۔ حضرت سیماب اکبر آباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر باقاعدہ حاصل کی، شروع میں آپ نے ریلوے میں ملازمت کی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ترک ملازمت کر کے ذاتی کاروبار شروع کیا، ملک کے مشہور اور مستند شاعر ہیں خاص شہرت و عظمت کے مالک ہیں، نظم کے ساتھ ساتھ نثر پر بھی پورا پورا عبور ہے، مختلف اور متعدد کتابیں تصنیف و تالیف فرما چکے ہیں، مثنوی مولانا روم کے ساتوں دفاتر کا آپ نے منظوم ترجمہ کیا ہے جو الہام منظوم کے نام سے شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکا ہے متعدد رسالوں کے مالک اور ایڈیٹر رہ چکے ہیں الغرض حضرت سیماب ملک و قوم میں اپنی شاعرانہ خصوصیات کے تحت کافی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کی عمر اس وقت تقریباً ۶۰ سال ہے۔

نمبر ۴۱ - حکیم ضمیر الحسن صاحب دل شاہجہاں پوری۔ مولد و مسکن شاہجہاں پور، والد کا اسم گرامی احمد احسن خاں صاحب، حضرت امیر مینائی کے شاگرد ہیں، سنہ ۱۸۷۵ء (۱۲۹۲ھ) پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی تکمیل کے بعد علم طب کی تکمیل فرمائی اور آپ بغرض رفاہِ عام طبابت کرتے ہیں۔ شاعری کے اعتبار سے طبقۂ خواص میں ہر دل عزیز ہیں آپ کا دیوان بنام نغمۂ دل شائع ہو چکا ہے۔ دو ایک ناولوں کے بھی مصنف ہیں۔

نمبر ۴۲ - مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی۔ سنہ ۱۸۶۶ء (۱۲۸۳ھ) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی، آپ کے والد کا نام نواب مرزا صاحب تھا، محشر صاحب نے انگریزی تعلیم کے ساتھ ہی فارسی کا کورس بھی خواجہ عزیز الدین

کشمیری سے لیا، آپ بسلسلۂ ملازمت مہاراجہ محمود آباد کے امام باڑے میں داروغہ بھی رہے، آپ کی غزلوں کا ایک مجموعہ بنام خورشید محشر شائع ہو چکا ہے، بزرگانِ دین کی مدح میں بھی قصائد کا ایک دیوان چھپ چکا ہے۔ باعتبار شعر و شاعری لکھنؤی شعراء میں خاص امتیاز آپ کو حاصل ہے۔

نمبر ۴۳۔ مولوی محمد نوح صاحب نوحؔ ناروی۔ ساکن قصبہ نارہ ضلع الہ آباد ۱۸۷۹ء میں بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام نامی مولوی عبد المجید صاحب تھا جو سب جج تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) کی خیر خواہی میں عبد المجید صاحب کو کافی جائداد بطور انعام ملی اس کے بعد آپ نے اس میں اور اضافہ کر لیا، حضرت نوح اس تمام جائداد پر قابض ہیں اور اور اطمینانی زندگی میسر ہے، شعر و سخن کا ذوق میر نجف علی صاحب نیم کی صحبت میں ہوا اور دو تین سال انھیں سے مشورہ کیا بعد ازیں نواب مرزا داغ کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے، اُستاد کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی حاصل کیا، ملک کے مشہور شاعر میں اُستاد کا رنگ آپ کے کلام میں موجود ہے، آپ کے دو دیوان سفینۂ نوح اور طوفانِ نوح شائع ہو چکے ہیں، آپ کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔

نمبر ۴۴۔ سید محمد باسط علی صاحب باسطؔ۔ سادات سے ہیں مولد وطن بسواں ضلع سیتاپور ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام منشی نیاز علی تھا، حضرتِ جگر بسوانی سے فیض تلمذ حاصل ہے، ۱۹۳۳ء میں آپ سیٹھ جی دیال ہائی اسکول بسواں میں ملازم تھے، ۲۲ سال سے مشغلۂ شعر و سخن ہے، اکثر اخبار و رسائل میں آپ کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نمبر ۴۵۔ سید ابو محمد صاحب ثاقبؔ کانپوری۔ آپ کا اصلی وطن کڑا ضلع الہ آباد تھا، ان کے والد نے ترک سکونت کر کے کانپور میں قیام کیا

اورمؤ میں سنہ ۱۹۰۹ء میں جناب ثاقب پیدا ہوئے تعلیم کان پور کے عربی مدرسہ الٰہیات میں ہوئی، مولانا آزاد سبحانی اور جناب احسن سنبھلی آپ کے اساتذہ میں سے تھے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ثاقب صاحب کو شعرا کے ایک انعامی مقابلے میں ۵ کا انعام انجمن ارباب علم پنجاب کی طرف سے ملا، متاعِ درد کے نام سے آپ کے کلام کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

نمبر ۶ ۳- جناب علی سکندر صاحب جگر مرادآبادی۔ والد کا نام مولوی علی نظر صاحب تھا، آپ کا خاندان ابتداً دہلی کا رہنے والا تھا ترک سکونت کر کے مرادآباد میں قیام اختیار کر لیا۔ سنہ ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء میں جگر پیدا ہوئے، عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم مرادآباد کے مکاتب میں ہوئی، ذوق شعری بچپن سے ہے، مختلف استادوں مثلاً حضرت داغ، حیات بخش رسا، امیر اللہ تسلیم وغیرہ سے استفادہ سخن کیا، جگر اپنا استاد معنوی اصغر گونڈوی کو تصور کرتے ہیں جگر ابتدا ہی سے آزاد مزاج واقع ہوئے ہیں، بظاہر چشموں کی تجارت کرتے ہیں لیکن بحیثیت شاعر اس قدر مشہور اور ہر دل عزیز ہیں کہ یہ پیشہ بھی برائے نام ہے اور ملک کے ہر چہار اطراف میں ان کی قدر دانی ہوتی ہے، جگر بہ لحاظ شاعری محتاج بیان نہیں۔

نمبر ۷ ۳- جناب محمد مبین صاحب کیفی چریاکوٹی۔ چریاکوٹ ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، مولانا محمد فاروق کے صاحبزادے اور مولانا عنایت رسول صاحب کے بھتیجے ہیں، سنہ ولادت سنہ ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء مختلف زبانوں سے واقف ہیں، انگریزی میں بھی شاعری کرتے ہیں سنہ ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد میں شعبۂ اردو کے انچارج تھے، آپ کے مضامین نثر و نظم اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

نمبر ۸ ۳- مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی۔ موہان

ضلع اناؤ کے رہنے والے ہندوستان کے مشہور و معروف افراد میں سے ہیں، خاندان سادات کی ایک شاخ نیشاپور سے منتقل ہوکر ہندوستان وارد ہوئی اور ضلع اناؤ کو شرف اقامت بخشا، مولانا انسی خاندان کے متعلق ہیں، آپ کی ابتدائی تعلیم قرآن پاک سے شروع ہوکر عربی تعلیم کی آخری دور تک ہوئی، السنۂ اسلامیہ کے ساتھ ہی انگریزی مدارس میں بھی آپ نے باقاعدہ تعلیم پائی اور ۱۹۰۳ء میں بی اے پاس کیا، تعلیم ختم کرنے کے بعد وطن کی خدمت گزاری کو اپنا نصب العین بنایا، مولانا کی سیاسی زندگی اخلاص و صداقت اور راستی و وطن پرستی کی ایک ایسی جامع تصویر ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے دفتر چاہئے مختصر آیوں سمجھ لیجئے کہ حسرت ہندوستان کا وہ سب سے پہلا مکمل شاعر ہے جس نے شاعری کے فرضی و خیالی میدان کے ساتھ ساتھ میدان سیاست کو بھی پوری پامردی سے طے کیا، اور ملک و قوم کی خاطر ہر قسم کی مالی و جسمانی تکالیف برداشت کیں۔

شاعری میں آپ مومن دہلوی اور تسلیم تلمیذ نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں اور باعتبار شاعری آپ کا پایہ بہت بلند ہے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں، ملک و قوم کی خدمت کے علاوہ آپ نے اردو زبان کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ نے رسالہ اردوئے معلی کا اجرا فرمایا جس میں شعر و ادب کے ساتھ ساتھ رنگ سیاست بھی نمایاں رہتا تھا۔

مولانا حسرت موہانی ہر اعتبار سے ملک میں پوری پوری شہرت رکھتے ہیں۔

نمبر ۹۴ - مولوی سید ریاض احمد صاحب ریاض خیر آبادی۔

ریاض خیر آبادی ہندوستان کا ایک ایسا شاعر ہے جو خواص و عوام دونوں میں برابر مشہور و ہر دل عزیز ہے، ریاض مرحوم سید طفیل احمد صاحب کے صاحبزادہ تھے، ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے، مولد خیر آباد اور مسکن لکھنؤ تھا، خیر آباد کے مدرسہ عربیہ میں

تعلیم پائی شاعری کا شوق عنفوان شباب کے ساتھ پیدا ہوا، امیر مرحوم کے شاگرد ہوئے اور شروع میں ایک رسالہ گل کدۂ ریاض کے نام سے نکالا جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۲۹۲ھ میں آپ نے "ریاض الاخبار" نکالا جو عرصہ تک جاری رہا، اسی دوران میں حضرت ریاض کو سرکاری ملازمت مل گئی اور آپ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پیشکار ہو گئے اس کے بعد نواب کلب علی خاں فرماں روائے رامپور کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور انھوں نے رامپور طلب فرما کر خلعت اور زر نقد سے سرفراز کیا۔

حضرت ریاض نے اپنی ذاتی قابلیت، اور کوشش سے وہ صورتیں پیدا کیں کہ جوہر شناسوں کی قدردانی سے عمر کا زیادہ حصہ نہایت خوشحالی و فارغ البالی سے گزارا، ریاض کی شاعری میں شوخی کے علاوہ شوکت الفاظ بلند خیالی اور نازک خیالی بدرجۂ اتم ہے، آپ کا کلام عموماً شاعری کے سقم سے پاک ہے، آپ کا دیوان بنام "ریاض رضواں" شائع ہو چکا ہے بہ عمر ۸۰ سال ۱۹۳۴ء میں انتقال فرمایا۔

نمبر ۵۰۔ جناب رضا علی صاحب وحشت۔ ۱۸۸۱ء میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کی ۱۸۹۵ء میں مولوی ابوالقاسم شمس سے شرف تلمذ حاصل فرمایا۔ فارسی شاعری سے جناب وحشت کو خاص لگاؤ ہے آپ کا ایک دیوان ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۶ء سے آپ اسلامیہ کالج کلکتہ میں پروفیسر ہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے چند مایۂ ناز شعراء میں ہے۔

نمبر ۵۱۔ قاضی عبدالخالق صاحب نہال سیوہاری۔ آپ سیوہار ضلع بجنور کے معزز خاندان قاضیان سے ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے مراد آباد میں ابتدائی تعلیم پائی، ذوق شعری بچپن سے ہے آپ کی سب سے پہلی نظم "اشک یتیم" زمانہ طالبعلمی کی ہے سید احمد حسین صاحب بے باک اور نواب سراج الدین احمد خاں سائل سے آپ کو فخر تلمذ حاصل ہے ۱۹۳۳ء میں آپ کا دہلی میں قیام تھا اور ریلوے محکمہ میں ملازم تھے۔

نمبر ۵۲۔ سید احمد حسین صاحب امجد۔ حیدرآباد دکن کے رہنے والے اور مشہور و معروف شاعر ہیں، ۱۳۰۳ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے والد کا نام صوفی رحیم علی صاحب تھا، آپ کی تعلیم مدرسہ نظامیہ، مدرسہ العلوم میں ہوئی، پنجاب یونیورسٹی سے امتحان منشی فاضل بھی پاس کیا ہے، طغیانی رودِ موسیٰ (۱۳۲۶ھ) جو حیدرآباد کا مشہور سانحہ ہے حضرتِ امجد کی خانہ بربادی کا باعث ہوا، آپ کا پورا کنبہ جو والدہ، بی بی اور دختر پر مشتمل تھا دریا برد ہو گیا، صرف آپ کی ذات محفوظ رہی، شروع میں مدرسہ العلوم میں آپ نے بطور مدرس خدمات انجام دیں اس کے بعد دفتر صدر محاسبی میں ملازم ہو گئے اور غالباً اس وقت تک اسی محکمے میں ملازم ہیں، شعر و شاعری میں حبیب صاحب کنتوری سے مشورہ کیا، اب تک متعدد نظم و نثر کی کتابیں آپ شائع کر چکے ہیں، آپ کی نظمیں ملک کے مستند رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں آپ کی رباعیوں کا ایک مجموعہ بنام رباعیاتِ امجد بھی شائع ہو چکا ہے۔

نمبر ۵۳۔ سید کاظم علی صاحب شوکت بلگرامی۔ سادات بلگرام سے تھے، والد بزرگوار کا نام نامی منشی سید علی حسن صاحب تھا۔ ۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ میں بمقام حیدرآباد پیدا ہوئے، خاندان بلگرام کے بعض افراد حیدرآباد دکن جا رہے تھے جناب شوکت اسی خاندان کے فرد تھے، شوکت بلگرامی کو دنیائے شاعری میں اگرچہ خاص شہرت نہیں ہوئی لیکن حسرت موہانی کے مشہور رسالہ اُردوئے معلیٰ اور وحشی چاہت جھنجھانوی مرحوم کے رسالۂ اصلاحِ سخن کے پرانے پرچے جن کی نگاہوں سے گزر چکے ہیں انھیں معلوم ہے کہ شوکت بلگرامی کا بحیثیت شاعر کیا درجہ تھا، وہ جب تک زندہ رہے اُردو کی خدمت کی لیکن خاندان بلگرام کے قدیم دستور کے مطابق میدانِ صحافت میں آکر شہرت کے کبھی خواہاں نہ ہوئے۔ شوکت بلگرامی نے ۱۹۲۴ء میں یکایک کلکتے میں انتقال فرمایا۔ آپ کی تصانیف سے ایک گلدستہ بعض مراثی اور

نوحوں کا مجموعہ جو امام حسینؑ کی یاد میں آپ نے وقتاً فوقتاً کہے شائع ہو چکا ہے، عمر خیام کی رباعیوں کا بھی آپ نے اُردو میں ترجمہ فرمایا تھا، وہ بھی شائع ہوا ہے جو اگرچہ نامکمل ہے تاہم موجودہ اُردو ترجموں میں ممتاز ہے۔

نمبر ۵۴۔ منشی مہاراج بہادر برق۔ نسلاً کائستھ سکسینہ، وطن قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ، مولد و مسکن دہلی، آپ کے والد منشی ہر نرائن داس نے ترک وطن کر کے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، برق یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی، سنہ ولادت ۱۸۸۴ء ہے، پنجاب یونی ورسٹی سے بی۔اے اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے تھے، جدید رنگ شاعری کے حامی تھے اور زیادہ تر نیچرل نظمیں کہتے تھے، نظموں کا مجموعہ بنام "مطلع انوار" شائع ہو چکا ہے ۱۹۳۶ء میں فوت ہوئے۔ اس دور کے بہترین شاعر تھے، تمام عمر اُردو کی خدمت اور محبت میں گزاری۔

نمبر ۵۵۔ منشی برج موہن چکبست۔ نسلاً کشمیری برہمن، وطن فیض آباد، مولد و مسکن لکھنؤ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام پنڈت اودت نرائن تھا، تعلیمی اعتبار سے بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی تھے، لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے، چکبست ہندو شعراء میں خاص مرتبے کے مالک ہیں، اُن کا کلام زیادہ تر قومی اور اخلاقی نظموں پر مشتمل ہے۔ وہ بڑے احساس اور نبض شناس شاعر گزرے ہیں، ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو یکایک فالج کے شکار ہوئے اور چند گھنٹوں میں فوت ہو گئے۔ چکبست ایک بے بدل اور بے لوث شاعر تھے۔ اُردو زبان سے خاص ہمدردی تھی۔

نمبر ۵۶۔ منشی جگت موہن لال رواں۔ نسلاً کائستھ، وطن قصبہ موروال ضلع اُناؤ، مولد و مسکن اُناؤ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام منشی

گنگا پرشاد تھا، تعلیم ایم۔ اے تک حاصل کی، وکالت کا امتحان پاس کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا، رواں اپنے دور کے ممتاز شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں، آپکی قومی و اصلاحی نظمیں خاص وقعت رکھتی ہیں، آپ کا ایک دیوان بنام "روحِ رواں" اور ایک مجموعہ رباعیات شائع ہو چکا ہے، اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء میں انتقال کیا، رواں نے باعتبار شعر و شاعری بہت تھوڑی مہلت پائی لیکن اس کے باوجود انھوں نے ملک میں خاص وقعت حاصل کی اور ان کا شمار بہترین شعرا میں ہوتا ہے۔

نمبر ۵۷۔ منشی درگا سہائے سرور۔ نسلاً کائستھ، سنہ ۱۸۷۳ء میں جہاں آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم پیارے لال تھا، تمام عمر اردو کی خدمت میں گزاری اپنے زمانے کے بلند پایہ شاعر خیال کئے جاتے تھے، نیچرل شاعری کے حامی اور ایک خاص رنگِ سخن کے موجد تھے، آپ کا کلام زیادہ تر رسائل میں شائع ہوا، حاجی محمد غوث حیدر آبادی نے ایک مجموعۂ کلام بنام "خمکدۂ سرور" شائع کیا ہے۔ سرور نے ۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔ رسالہ ادیب الہ آباد و زمانہ کانپور کے تعلق سے آپ نے اردو کی زبردست خدمات انجام دیں۔

نمبر ۵۸۔ منشی سورج نرائن مہر۔ نسلاً کشمیری برہمن، مولد و مسکن دہلی سنہ ولادت معلوم نہیں، باپ کا نام بھی معلوم نہیں مہر کی عمر کا زیادہ حصہ محکمۂ تعلیم میں گزرا، آپ نے اردو شاعری کی تمام اصناف پر فکر فرمائی لیکن زیادہ تر انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا ہے، مجموعۂ کلام "کلامِ مہر" کے نام سے شائع بھی ہو چکا، اردو لٹریچر میں اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے خاص چیز ہے۔

نمبر ۵۹۔ منشی برج موہن لال کیفی۔ قوم کے کشمیری برہمن مولد و مسکن دہلی، والد کا نام پنڈت کنھیا لال تھا۔ ۱۳ دسمبر سنہ ۱۸۹۶ء میں

پیدا ہوئے کیفی کے اجداد و اسلاف شاہانِ اسلام کے الطاف و اکرام سے مالامال رہے
ہیں، کیفی اس دور کے ایک مشہور شاعر ہیں، فارسی، اُردو اور انگریزی زبانوں سے
واقف ہیں، شاعری میں رنگِ جدید کے حامی ہیں اور ایجاد و اختراع کا خاص مادہ
رکھتے ہیں، اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۷۰ سال ہے، اُردو کی خدمت میں اس وقت
بھی مصروف ہیں آپ کے مضامین نظم و نثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی
مادری زبان سے خاص اُنس ہے۔

نمبر ۶۰۔ **منشی تلوک چند محروم**۔ عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کے رہنے
والے ہیں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے، والد کا نام **بھگت رام دیال** ہے آبائی پیشہ
کاشت کاری و زمینداری ہے، اسی مناسبت سے جناب محروم منظر نگاری کا خوب
ملکہ رکھتے ہیں، اس زمانے کے پنجابی شعراء میں محروم کا خاص درجہ ہے۔ آپ کا
منظوم کلام ملک کے اکثر مستند رسائل میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کرتا رہا ہے

نمبر ۶۱۔ **منشی میلا رام وفا**۔ قوم کے برہمن، مولد و مسکن لاہور، سنہ
ولادت معلوم نہیں والد کا نام بھی معلوم نہیں اس دور کے شاعر ہیں، آپ کا کلام ہندوستان کے
اکثر رسائل میں شائع ہوتا ہے۔

نمبر ۶۲۔ **منشی شیام موہن لال جگر**۔ نسلاً کایستھ سکسینہ، وطن و
مولد بریلی، والد کا نام **رائے کنھیا لال دل**، منشی گنگا پرشاد اوج۔
آپ کے نانا تھے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے، سنہ ۱۹۱۲ء میں بریلی کالج سے فارسی
انگریزی اور فلسفہ میں بی۔ اے کیا، سنہ ۱۹۱۸ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے،
اس دور کے مشہور معروف شعراء میں ہیں، ذوقِ شعر آپ کو وراثتاً ملا ہے، ہر رنگ
سخن میں اظہارِ خیال فرماتے ہیں، ہندوستان کے موقر و مستند رسائل میں آپ کا
کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

نمبر ۶۳۔ بابو پیارے لال شاکر۔ شاکر صاحب اس دور کے لائق شاعر و ادیب ہیں، موصوف کے نام سے اکثر لوگوں کو آپ کے ہندو ہونے کا دھوکا ہوا ہے حضرت شاکر قومیت کے اعتبار سے عیسائی ہیں، سنہ ۱۹۱۲ء میں رسالہ ادیب آپ کی ادارت میں نکلتا تھا، سنہ ۱۹۱۳ء میں آپ نے رسالہ العصر کی عنانِ ادارت ہاتھ میں لی، جناب شاکر بحیثیت اڈیٹر بہت کامیاب رہ چکے ہیں اور اس سلسلے میں خاص تجربہ رکھتے ہیں، ان کے مضامین نظم و نثر اکثر رسالوں میں چھپتے ہیں اور بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

نمبر ۶۴۔ مولانا ظفر علی خاں۔ آپ کا وطن کرم آباد تحصیل وزیر آباد پنجاب ہے سنہ ۱۲۹۰ھ میں مقام کوٹ میر تولد ہوئے، سن پیدائش آپ کے نام نامی نکلتا ہے، آپ ایک زمیندار خاندان سے متوسل ہیں، خود آپ کے والد زمیندار تھے لیکن سیاسی سرگرمیوں نے آپ کی جائداد کا زیادہ حصہ تلف کر دیا، ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور پٹیالہ میں حاصل کی پھر علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کیا، شاعری کا شوق ابتدا سے تھا، حیدر آباد جا کر جہاں استاد مرزا داغ مرحوم سے فیضِ تلمذ حاصل فرمایا والد کے انتقال کے بعد آپ نے لاہور سے ایک اخبار "زمیندار" کے نام سے نکالا۔ اور آخر کار اپنے سیاسی اشغال کے ساتھ ساتھ اخبار نویسی ہی ذریعہ معاش قرار دیا۔ اخبار نے اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اتنا فروغ پایا کہ آج بھی ان کا اخبار خاص حلقوں میں خاص وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

ظفر علی خاں جہاں ایک کامیاب ادیب ہیں وہاں مشاق شاعر بھی ہیں آپ کی نظموں میں مذہبی و سیاسی رنگ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے، بعض ہنگامی نظمیں لاجواب ہیں، اردو زبان کے لئے آپ کے ادیبانہ کمالات باعث صد افتخار ہیں۔ مولانا کی تمام عمر سیاسی مشاغل میں گزری ہے اور ملک کے ممتاز افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کے

قلمی کارناموں میں سب سے زیادہ یادگار چیز آپ کا اخبار زمیندار ہے، کتاب معرکۂ مذہب و سائنس جو انگریزی کی مشہور تصنیف کا ترجمہ ہے آپ کا بے نظیر کارنامہ ہے آپ کے مجموعۂ کلام میں "بہارستان" کے نام سے بھی ایک ضخیم دیوان شائع ہو چکا ہے، مولانا کو خدا نے جہاں قلم پر زبردست قدرت عطا فرمائی ہے وہیں آپ ملک کے بہترین خادم بھی مانے گئے ہیں۔

نمبر ۶۵- سید سجاد حیدر یلدرم - شرفائے ہنٹور ضلع بجنور کی ایک قابل قدر ہستی ہیں ۱۸۸۰ء میں تولد ہوئے۔ علوم مشرقی یعنی فارسی و عربی کی تعلیم کے بعد آپ نے محمڈن کالج علی گڑھ میں تعلیم شروع کی، ۱۹۰۱ء میں بی۔اے پاس کیا، آپ علی گڑھ یونی ورسٹی کے قابل فخر طلباء میں سے تھے جن پر نہ صرف کالج کو فخر رہا بلکہ قوم و ملک کو بھی ناز ہے۔ بعد اختتام تعلیم آپ ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں بیٹھے اور کامیاب ہو کر ڈپٹی کلکٹری کی کرسی کو زینت بخشی۔ مسلم یونی ورسٹی جب بعض مشکلات میں گرفتار ہوئی تو آپ نے رخصت حاصل کر کے مسلم یونی ورسٹی کی خدمت انجام دیں، اور ۱۹۲۹ء تک بطور رجسٹرار نہایت نیک نامی کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے، آپ کی علمی خدمات اور دماغی کارگزاریاں آپ کو اردو ادب کا ایک بے لوث و بے لاگ سرپرست ثابت کرتی ہیں۔ فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبانوں میں آپ کو خاص درک حاصل ہے آپ کے ادبی کارنامے زیادہ تر نثر میں موجود ہیں لیکن شعر گوئی کا بھی شوق ہے اور چند متفرق نظمیں آپ کی پختگی مذاق اور رنگینی طبع کا ثبوت ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یلدرم کی ذات ارباب علم و ادب کے لئے سرمایۂ افتخار ہے آپ آجکل سابقہ خدمات بطور ڈپٹی کلکٹر انجام دے رہے ہیں۔

بیان یزدانی سید مرتضیٰ نام تھا، بیان تخلص اردو میں اور یزدانی فارسی

میں فرماتے تھے، سید احمد حسن کے شاگرد تھے مولد و مسکن میرٹھ تھا، ۱۸۷۰ء میں تولد ہوئے، فن سخن میں کامل مہارت تھی، اخبار "طوطی ہند" کے عرصے تک اڈیٹر رہے، جلوۂ طور وغیرہ میں بھی آپ کے مضامین نظم و نثر برابر شائع ہوئے، فن سخن میں کامل مہارت حاصل تھی، مسدس حالی کے جواب میں بھی آپ نے ایک مسدس لکھا تھا جو چھپ چکا ہے، ۱۹۰۹ء میں بمقام میرٹھ انتقال فرمایا۔

نمبر ۶۷۔ غلام مصطفےٰ ذہین۔ آپ حیدر آبادی شاعر تھے، مخزن اور ادیب وغیرہ رسائل میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوا کرتا تھا، ۱۳۴۹ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا، آپ کا کلام عشق دعاشقی اور گل و بلبل کے افسانوں سے پاک ہے عموماً اخلاقی مضامین نظم فرمایا کرتے تھے، آپ کی نظموں میں الفاظ صاف و شستہ اور تراکیب دل نشین ہوا کرتی ہیں معرفت و اخلاق میں آپ کا کلام بے نظیر ہے، تصوف، فرائض انسانی، طرز معاشرت اور تمدن وغیرہ جیسے مسائل پر آپ کا بکثرت کلام رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔

نمبر ۶۸۔ شاہ تراب علی تراب۔ آپ کے والد کا اسم گرامی شاہ کاظم صاحب تھا، قصبہ کاکوری کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے، بڑے خدا پرست اور درویش عفت بزرگ ہوئے ہیں، شاہ صاحب کا دیوان شائع ہو چکا ہے، ایک مثنوی مسمیٰ عاشق و صنم بھی اُن کی یادگار ہے، تراب مرحوم کا کلام معرفت سے پُر اور بصد درجہ درد انگیز ہے، آپ ایک کہنہ مشق شاعر تھے، موسیقی سے بھی اچھی واقفیت تھی چنانچہ آپ کی اکثر ٹھمریاں بہت مقبول ہیں، کلام میں متانت و سنجیدگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اکثر اخلاقی مضامین بڑی نفاست سے باندھے ہیں، ۱۲۷۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

نمبر ۶۹۔ فرخ بنارسی۔ آپ کا پورا نام سید واجد علی صاحب ہے،

بنارس کے رہنے والے ہیں اور محکمۂ پولس میں ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز ہیں، اس دور کے ممتاز اور اچھے شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے، زیادہ تر غزل فرماتے ہیں، کبھی کبھی نظم بھی کہہ لیا کرتے ہیں۔ آپ کے مجموعہ کلام میں تجلیات فرخ کے نام سے ایک مختصر اور چھوٹا سا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے، اس میں ایک جگہ اپنی شاعری کے متعلق ارشاد کرتے ہیں کہ میں اپنے مذاق کے مخالف و غیر شاعرانہ ماحول میں زندگی بسر کرتا ہوں، چونکہ دل و دماغ پر خوشی و غم بغیر اثر کئے نہیں رہتے لہذا وقتاً فوقتاً اپنے جذبات و کیفیات کی شیرازہ بندی کرتا رہا ہوں۔

فرخ کی شاعری محاسن شاعرانہ سے پوری طرح مملو ہیں، آپ کا کلام ملک کے اکثر رسائل میں عزت اور وقعت کے ساتھ شائع ہوا کرتا ہے۔

نمبر ۷۔ تسکین قریشی:۔ آپ کا اسم گرامی جناب محمد یسٰین صاحب ہے، تسکین تخلص فرماتے ہیں، مولد و مسکن قصبہ سوروں ضلع ایٹہ ہے، آپ ایک بہت پرانے اور معزز خاندان کے فرد ہیں جو عہد شاہان تغلق بہ مقام سہسوان ضلع بدایوں آباد ہوا اور شاہان اسلام کی لشکروں میں آپ کے اجداد ہمیشہ معزز و موقر رہ کر صلہ و جاگیر و خطابات سے فیض پاتے رہے۔

آپ آخر سنہ ۱۸۹۵ء میں تولد ہوئے، فارسی درسیات مولوی غلام علی صاحب سے پڑھے سنہ ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول آگرہ سے اسکول لیونگ کا امتحان پاس کیا ابتدا ہی سے طبیعت کو شاعری سے لگاؤ ہے سنہ ۱۹۱۴ء میں پہلی غزل اور سنہ ۱۹۱۶ء میں پہلی نظم کہی، فن شعر میں آپ نے مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی سے مشورہ فرمایا۔ آپ کی غزلیات سادہ اور رواں ہوتی ہیں، فلسفیانہ نکات اور دقیق مسائل کو آپ مسلسل نظموں میں واضح فرماتے ہیں۔ الغرض یہ کہ جناب تسکین دور حاضر کے اُن کامیاب شعراء میں سے ہیں جنھوں نے مغربی تمدن و ادبیات سے متاثر ہو کر اردو شاعری کو نئے راستے پر

لگانا چاہا ہے۔

نمبر ۱۔ پنڈت لبھو رام جوش۔ آپ ملیسان قصبہ کے رہنے والے ہیں جو ضلع جالندھر میں واقع ہے۔ سن ولادت ۱۸۸۳ء ہے نکودر کے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول میں آپ فارسی کے مدرس اول ہیں۔ رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور کے حصۂ نظم و نثر و شعبۂ ادبیات کے مدیر ہیں، ۱۹۰۳ء میں حضرت داغ سے تلمذ حاصل کیا۔ ملک کے اچھے شعراء میں آپ کا شمار ہے، آپ اکثر بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں اور آپ کا کلام عزت کے ساتھ سنا جاتا ہے۔

نمبر ۲۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ حضرت حفیظ ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں تولد ہوئے، آپ کے اجداد پہلے ایک چوہان سورج بنسی راجپوت خاندان سے متوسل تھے جو آج سے تقریباً دو سو سال پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے، ابتدائی تعلیم باقاعدہ جالندھر ہی میں ہوئی، اردو زبان سے خاص تعلق رہا شروع میں تغزل سے تعلق رہا اور مولانا غلام قادر گرامی جیسے مسلم الثبوت شاعر سے مشورہ سخن فرمایا۔ ۱۹۲۵ء میں والی خیرپور نے حفیظ کو تین سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر رکھنا چاہا لیکن حفیظ نے بوجوہ اس کو پسند نہ کیا، حفیظ اس دور کے مقبول شعراء میں سے ہیں، شروع میں ہر صنف شعر توجہ کا مرکز تھی لیکن مشق سخن کے ساتھ ساتھ اپنا ایک مختص رنگ آپ نے متعین کر لیا، "شاہنامہ اسلام" آپ کی ایک ایسی تصنیف ہے جس نے آپ کی مقبولیت و شہرت کو بہت ترقی دیدی ہے، اسی سلسلے میں گورنمنٹ نے آپ کو "خان صاحب" کا خطاب بھی عطا کیا ہے۔ آپ نے شاہنامۂ اسلام کے لئے مواد حاصل کرنے کے لئے یورپ کا بھی سفر کیا آپ کی تصانیف نظم و نثر میں متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جن میں شاہنامہ اسلام کی دو جلدیں، نغمۂ زار، سوز و ساز تو صنف نظم سے متعلق ہیں اور ہفت پیکر اور معیاری افسانے آپ کی نثر کے بہترین نمونے ہیں

نمبر ۱۳۷ - حضرت جوش ملیح آبادی - شبیر حسین صاحب، نام جوش تخلص سنہ ۱۸۹۶ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے، آپ کے جد امجد کا اسم گرامی نواب حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خاں صاحب گویا تھا، جو اسائذۂ وقت میں شمار ہوتے تھے اور حضرت ناسخ کے شاگرد رشید تھے، آپ کے دادا نواب محمد احمد خاں صاحب احمد اور آپ کے والد نواب بشیر الدین خاں صاحب بشیر بھی صاحب دیوان تھے، گھر میں جب شعر و شاعری کی یہ چہل پہل ہو تو ظاہر ہے کہ بچوں پر کیا کچھ نہ اثر پڑے گا چنانچہ حضرت جوش بھی نو دس برس کی عمر میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔

شروع میں بارہ تیرہ برس کی عمر تک عزیز لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے اس کے بعد آپ نے ذوق سلیم اور وجدان صحیح کو اپنا استاد بنایا اور آج تک اسی اصول پر قائم ہیں جس طرح خود کسی کی شاگردی کو پسند نہیں فرمایا بالکل اسی طرح کسی کو اپنا شاگرد بھی بنانا گوارا نہیں ہے۔ ایک عرصہ تک حضرت جوش دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ میں ادبی نقاد کی خدمت انجام دیتے رہے، حضرت جوش نے لکھنؤ کی فضا میں تعلیم و تربیت پائی تھی لیکن اُن کی شاعری لکھنوی رنگ سے پاک ہے، نظم کی طرف آپ کا رجحان خاص ہے، یہ میدان چونکہ بے حد وسیع ہے اس لئے آپ نے ایک مخصوص رنگ دے کر نظم کے میدان کو ایک حیاتِ مستقل دیدی ہے۔

حیدرآباد کی ملازمت سے دست کش ہونے کے بعد آپ نے دہلی سے ایک ادبی رسالہ "کلیم" کے نام سے جاری کیا جو اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے بے نظیر تھا افسوس وہ کچھ سال شائع ہو کر بند ہو گیا اور اب لکھنؤ کے ایک رسالے کے ساتھ شامل ہو کر "نیا ادب اور کلیم" کے نام سے نکل رہا ہے، حضرت جوش کا کلام "نقش و نگار"، "شعلہ و شبنم"، "فکر و نشاط"، "جنون و حکمت"، "پیغمبر اسلام" اور "شاعر کی راتوں" کے ناموں سے مختلف صورتوں میں شائع ہو چکا ہے۔